اقبال و جناح
کے
پاکستان
کا استحکام و بقا
فکرِ اقبال کی روشنی میں
چند
عملی اقدامات

نومبر
2020ء

حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝

ماہنامہ
حکمت بالغہ
جھنگ

خصوصی اشاعت

جدید تعلیم یافتہ حضرات میں علوم قرآنی کے فروغ کا نقیب

Must read
حصّہ سوم
صفحات 333 تا 384

قرآن اکیڈمی جھنگ

جلد : 14 | وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ (القران) | ربیع الاوّل : 1442ھ

شمارہ : 11 | اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کیلئے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے کہ سوچے، سمجھے (پ سورۃ القمر) | نومبر : 2020ء

ISSN : 2305-6231

ماھنامہ

حِکمتِ بالغہ

جھنگ

مدیر مسئول : انجینئر مختار فاروقی

مشاورت
- ڈاکٹر طالب حسین سیال
- پروفیسر خلیل الرحمٰن
- انجینئر عبداللہ اسماعیل
- محمد فیاض عادل فاروقی

مدیر معاون و نگران طباعت: مفتی عطاء الرحمٰن

انتظامی امور: ملک نذر حسین

قانونی مشاورت
- محمد سلیم بٹ ایڈووکیٹ
- چودھری خالد اشیر ایڈووکیٹ

اہل ثروت حضرات سے تاحیات زرِ تعاون بیس ہزار روپے یکمشت	سالانہ زرِ تعاون بشمول خصوصی اشاعت اندورنِ ملک 800 روپے	معمول کا شمارہ 50 روپے

اس شمارے کی قیمت 550 روپے

ترسیل زر بنام : انجمن خدام القرآن رجسٹرڈ جھنگ

قرآن اکیڈمی جھنگ

لالہ زار کالونی نمبر 2، ٹوبہ روڈ جھنگ صدر

پاکستان پوسٹ کوڈ 35200

047-7630861-0336-6775861

Web site:
www.hikmatbaalgha.com
www.hamditabligh.net

Email: hikmatbaalgha@yahoo.com

پبلشر: انجینئر مختار فاروقی

طابع: محمد فیاض، مطبع: سلطان باہو پریس فوارہ چوک جھنگ صدر

اَلۡكَلِمَةُ الۡحِكۡمَةُ ضَالَّةُ الۡمُؤۡمِنِ فَحَيۡثُ وَجَدَ هَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا(ترمذی)

حکمت کی بات بندۂ مومن کی گم شدہ میراث ہوتی ہے جہاں کہیں بھی وہ اس کو پائے وہی اس کا حقدار ہے

مشمولات

قرآن مجید کے ساتھ چند لمحات 3

بارگاہِ نبوی ﷺ میں چند لمحات 6

حرفِ آرزو — انجینئر مختار فاروقی 9

حصہ اوّل

پہلا باب: .... تمہید طولانی — 17

دوسرا باب: ایک صدی کی مسلم بیداری کے بعد 69

حصہ دوم

تیسرا باب: معاصر دانشور حضرات کے......مضامین 105

چوتھا باب: ......اسلامی فکر کا عرفان و آگہی لازمی ہے 271

پانچواں باب: ....اجتماعی اُمنگ ناگزیر ہے 301

چھٹا باب: ....اجتہاد کی ضرورت ہے 309

ساتواں باب: علامہ اقبال اور ہم عصر عالمی تحریکیں 321

آٹھواں باب: جنوبی ایشیا کے مسلمان اور علامہ اقبال 335

حصہ سوم

نواں باب: تمنا مختصر سی ہے مگر 363

دسواں باب: عالمی حالات......مسلکی قیادتوں کا امتحان 375

ضمیمہ جات 385

(ادارہ) یہ رسالہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو حوالہ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ نہ ملنے کی صورت میں 10 تاریخ تک دفتر رابطہ فرمائیں 10 تاریخ کے بعد رسالہ ارسال نہیں کیا جائے گا

قرآن مجید
کے ساتھ
چند لمحات

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ
بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

1

سورۃ البقرۃ 182:02

فَمَنۡ خَافَ مِنۡ مُّوۡصٍ جَنَفًا اَوۡ اِثۡمًا

اگر کسی کو وصیت کرنے والے کی طرف سے

(کسی کی) طرفداری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو

فَاَصۡلَحَ بَیۡنَہُمۡ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ

تو اگر وہ (وصیت کو بدل کر) ان میں اصلاح کردے تو اس پر کچھ گناہ نہیں

اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۸۲﴾

بے شک اللہ بخشنے والا (اور) رحم کرنے والا ہے

2

سورۃ الحج 78:22

وَجَاہِدُوۡا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِہَادِہٖ

اور اللہ کے لیے جہاد کرو جیسا جہاد کرنے کا حق ہے

ہُوَ اجۡتَبٰىکُمۡ وَمَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ

اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی

3

سورۃ القصص 28:4-6

اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِی الۡاَرۡضِ

بے شک فرعون نے ملک میں (حد سے زیادہ) سر اٹھا رکھا تھا

وَجَعَلَ اَهۡلَهَا شِيَعًا يَّسۡتَضۡعِفُ طَآئِفَةً مِّنۡهُمۡ

اور وہاں کے باشندوں کو گروہ گروہ بنا رکھا تھا ان میں سے ایک گروہ کو (یہاں تک) کمزور کر دیا تھا

يُذَبِّحُ اَبۡنَآءَهُمۡ وَيَسۡتَحۡىٖ نِسَآءَهُمۡ ؕ

کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتا،

اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ۝۴

بے شک وہ فسادیوں میں سے تھا۔

وَنُرِيۡدُ اَنۡ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا فِى الۡاَرۡضِ

اور ہم چاہتے تھے کہ جو لوگ ملک میں کمزور کر دیے گئے ہیں اُن پر احسان کریں

وَنَجۡعَلَهُمۡ اَئِمَّةً وَّنَجۡعَلَهُمُ الۡوٰرِثِيۡنَ ۝۵ وَنُمَكِّنَ لَهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ

اور ان کو سربراہ بنائیں اور انہیں (ملک کا) وارث کریں اور ملک میں ان کو (باعزت) اقتدار دیں

وَنُرِىَ فِرۡعَوۡنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوۡدَهُمَا مِنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَحۡذَرُوۡنَ ۝۶

اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر کو وہ کچھ دکھا دیں جس سے وہ ڈرتے تھے

4

سورۃ العنکبوت 29:69

وَالَّذِيۡنَ جَاهَدُوۡا فِيۡنَا لَنَهۡدِيَنَّهُمۡ سُبُلَنَا

اور جن لوگوں نے ہمارے لیے کوشش کی ہم ان کو ضرور اپنے رستے دکھا دیں گے

وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝۶۹

اور اللہ تعالیٰ تو احسان کی روش اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہے

5

سورۃ الحجرات 49:01

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَيۡنَ يَدَىِ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ

اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو آگے مت بڑھاؤ اللہ اور اس کے رسول سے

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ①

اور ڈرتے رہو اللہ سے۔ بے شک اللہ (سب کچھ) سننے والا (اور سب کچھ) جاننے والا ہے

6

سورۃ الحشر 59:19-21

وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ نَسُوا اللّٰهَ

اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جنہوں نے (اپنے خالق) اللہ کو بھلا دیا

فَاَنۡسٰهُمۡ اَنۡفُسَهُمۡ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ⑲

تو اللہ نے انہیں اپنے آپ (روح، خودی، ضمیر، دلِ زندہ، CONSCIENCE،

INNER VOICE) سے غافل کر دیا۔ یہی بدکردار لوگ ہیں

لَا يَسۡتَوِىۡۤ اَصۡحٰبُ النَّارِ وَاَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ

(یہ دوزخ میں جائیں گے یہ) اہل دوزخ اور اہل بہشت

(جو باضمیر، زندہ روح وزندہ دل والے ہیں) برابر نہیں

اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ هُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ ⑳

اہل بہشت (باضمیر لوگ ہی) تو کامیابی حاصل کرنے والے ہیں

لَوۡ اَنۡزَلۡنَا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ

(قرآن مجید خوفِ خدا رکھنے والے باضمیر لوگ ہی پڑھتے سمجھتے اور قبول کرتے ہیں)

(بے ضمیر لوگ اس کے قریب نہیں آتے)

اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے

لَّرَاَيۡتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ

تو تم اس کو دیکھتے کہ دبا اور پھٹا جاتا ہے اللہ کے خوف سے

وَتِلۡكَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ ㉑

اور یہ باتیں ہم لوگوں (کے فائدے) کے لیے بیان کرتے ہیں

تاکہ وہ غور (کریں اور توبہ) کریں

صَدَقَ اللّٰهُ الۡعَظِيۡمُ

قَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم

بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں چند لمحات

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم

لَمَّا بَعَثَهٗ اِلَی الْیَمَنِ قَالَ:

کَیْفَ تَقْضِی اِذَا عَرَضَ لَكَ قَضَاءٌ؟

قَالَ: أَقْضِی بِکِتَابِ اللّٰهِ،

قَالَ: فَاِنْ لَمْ تَجِدْ فِی کِتَابِ اللّٰهِ؟

قَالَ: فَبِسُنَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم،

قَالَ: فَاِنْ لَمْ تَجِدْ فِی سُنَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ؟

قَالَ: أَجْتَهِدُ رَأْیِی وَلَا آلُو،

قَالَ: فَضَرَبَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم عَلٰی صَدْرِهٖ، وَقَالَ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَفَّقَ رَسُولَ رَسُولِ اللّٰهِ لِمَا یَرْضٰی بِهٖ رَسُولُ اللّٰهِ،

(مشکاۃ المصابیح)

فرمایا
رسول اللہ ﷺ
نے

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے اُن کو یمن کی طرف (گورنر مقرر کر کے) بھیجا تو فرمایا:

جب تمہارے سامنے کوئی مسئلہ پیش ہوگا تو تم کیسے فیصلہ گے؟

انھوں نے عرض کیا: میں کتابُ اللہ (قرآن مجید) کے ساتھ فیصلہ کروں گا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: اگر (اس مسئلہ کا حکم) تم کو کتاب اللہ میں نہ ملے تو؟

عرض کیا: پھر میں اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کے ساتھ فیصلہ کروں گا۔

آپ نے فرمایا: اگر (اس مسئلہ کا حکم) رسول اللہ کی سنت میں بھی تم کو نہ ملے تو؟

عرض: کیا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔

حضرت معاذ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اُن کے سینے پر ضرب لگائی اور فرمایا: تمام شکر ہے اُس اللہ کا جس نے اللہ کے رسول کے رسول کو اُس بات کی توفیق دی جو اللہ کے رسول ﷺ کو پسند ہے۔

فرمودۂ اقبال

صبح

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

مہمان عزیز

پُر ہے افکار سے ان مدرسے والوں کا ضمیر
خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز!
چاہیے خانۂ دل کی کوئی منزل خالی
شاید آجائے کہیں سے کوئی مہمانِ عزیز

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل اُو در آرزو پوشیدہ است
علامہ اقبال

حرفِ آرزُو

انجینئر مختار فاروقی

1

گزشتہ پندرہ صدیوں کی عالمی تاریخ کو اگر مختصر نام دیا جائے تو یہ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کی باہمی چپقلش و آویزش کی داستان ہے کبھی یہ جنگ مخفی اور پس پردہ ہے اور کبھی یہ جنگ اسلحہ اور فوج کے ساتھ ہے، کبھی یہ قلمی جنگ ہے کبھی عوامی ہے۔ آج کی اصطلاح میں کبھی یہ جنگ 'سرد جنگ' ہے اور کبھی گرم جنگ۔ کبھی COLD WAR اور کبھی HOT WAR مگر یہ جنگ ایک مسلسل اور جاری جنگ ہے دن کے چوبیس گھنٹے اور ہفتے کے سات دن (7/24)۔

مسلمانوں کا عروج دورِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے شروع ہوا۔ خلافت راشدہ کا زمانہ اس کے نظریاتی عروج کا دور ہے۔ دورِ بنواُمیہ (92 سال) اور دورِ بنوعباس (132ھ سے 656ھ، پانچ صدیاں) مسلمانوں کے عروج کا دور ہے۔ اسلامی تہذیب وتمدن کا عالمی سطح پر کوئی مقابلہ نہیں تھا۔

مسلمانوں کے زوال __ 1258ء بغداد، 1492ء اندلُس (یا ہسپانیہ یا سپین)، مغل بادشاہ اکبر کا ارتداد (1000ھ/1594ء) اور مغلوں کی حکومت کا خاتمہ (جنگ آزادی میں ناکامی 1857ء) __ کے ساتھ صہیونی استعمار کا عروج کی طرف سفر ہے۔ یوں تو صہیونیت کی تاریخ

بنی اسرائیل کے فرعون کی غلامی کے دور اور اہرامِ مصر کی تعمیرات کے دور سے 'فری میسن' کی تاریخ سے جڑی ہوئی ہے مگر اس میں ضد، ہٹ دھرمی، خدا بیزاری اور وحی دشمنی کا عنصر اُن کے قتلِ انبیاء کے مسلسل جرم (600 ق م سے 600ء تک) کی وجہ سے آیا پھر دورِ نبوت سے آج تک جھوٹی نبوتوں کے اجراء اور ان کی سرپرستی کے ساتھ نظریاتی، علمی، فلسفیانہ میدانوں میں آج تک جاری ہے اور مسیح الدجال کے آنے تک جاری رہے گا۔ حرفِ آرزو اور...... تمہید طولانی کے نام سے آئندہ باب کے صفحات اسی داستان پر ایک طائرانہ نظر ہے۔

حکمت بالغہ کی یہ خصوصی اشاعت عالمی حالات کے تناظر میں ایک نازک موڑ پر سامنے آرہی ہے۔ یہ بات ناگزیر ہے کہ اس اشاعت کی غرض و غایت کو سمجھنے کے لیے چند بنیادی تصورات اور اصطلاحات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تا کہ 'مقصود' کے حصول میں کامیابی ہو سکے۔ یہی تمہید طولانی کا پس منظر ہے۔

2 علامہ اقبال کی عمومی پذیرائی کی وجہ

علامہ اقبال کے فکر اور VISION کی آفاقیت، اسلام کے مستقبل اور احادیث نبویہ ﷺ کی پیش گوئیوں پر محیط تھی لہٰذا اس فکر میں فطری طور پر اپنے آپ کو منوا لینے کی طاقت پوشیدہ تھی اور مستقبل میں اسلام کے عالمی غلبے کا ہیولیٰ اور جھلک موجود تھی اس لیے اس تجویز کے بارے میں ''قبولیت از درِ حق بہر استقبال می آید'' کی سرمدی شان پیدا ہوگئی۔

◐ یہ سوال اہل علم اور اہل نظر علماء کے دل میں تو جگہ نہیں پا سکتا کہ ان کے علم میں کتب احادیث کے باب الفتن کی احادیث مستحضر ہوتی ہیں۔ جیسے حضرت نعمان بن بشیر، حضرت مقداد اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہم کی روایات کہ قربِ قیامت میں اسلام دوبارہ عروج حاصل کرے گا۔ اور عام علماء کے برعکس علامہ اقبال یہ بات 1913ء سے برملا کہہ رہے ہیں۔ اور انھوں نے اس عالمی غلبے کو قیامِ پاکستان سے جوڑ دیا اور بات مدلل ہوگئی۔ علامہ اقبال کی قیامِ پاکستان کے سلسلے میں اتنی پذیرائی اور اہمیت کی وجہ یہی ہے مگر صف دوم اور صف سوم کے علماء

علماءِ حق اور عوام کے ذہن میں خیال آ سکتا ہے اور سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایک شاعر اور مغربی تعلیم یافتہ شخص کو اتنا مقام کیوں دیا جانا چاہیے؟ علماء کے ہاں اس سوال کی اس لیے اہمیت نہیں ہے کہ سیرتِ نبوی میں کئی مواقع ہیں کہ عشرہ مبشرہ اور دیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں کسی عام صحابی کو کوئی اعزاز دے دیا گیا۔ یہ ساری مثالیں اہلِ علم و اہلِ نظر کی نگاہ میں ہیں۔ ذیل میں چند مثالیں بطورِ اشارہ پیش خدمت ہیں:

1۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا واقعہ

قَالَ النَّبِيُّ ﷺ يَوْمَ قُرَيْظَةَ لِحَسَّانَ بْنِ ثَابِتٍ: اُهْجُ الْمُشْرِكِينَ، فَإِنَّ جِبْرِيلَ مَعَكَ وَكَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ لِحَسَّانَ: أَجِبْ عَنِّي، اَللّٰهُمَّ أَيِّدْهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ (متفق علیه، عن البراء)

''نبی اکرم ﷺ نے بنو قریظہ کے واقعہ کے دن حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تو مشرکین کی ہجو بیان کر، بے شک جبرائیل تیرے ساتھ ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ، حضرت حسان سے فرما رہے تھے: تو ان کو میری طرف سے جواب دے۔ اے اللہ! اس کو روح القدس کے ذریعے تقویت دے''۔

اس موقع پر تمام اَجل صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا بطور خاص انتخاب ــــــ موقع کی مناسبت سے باصلاحیت شخص کا انتخاب آپ ﷺ کی مردم شناسی کی روشن دلیل ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس طرح حضرت حسان بن ثابت کے سامنے آنے اور مخالفین کے اعتراضات اور سوالات کا جواب دینے سے کیا عشرہ مبشرہ اور دیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان کم ہوگئی یا انہوں نے اس کو کسرِ شان سمجھا۔ نہیں ہرگز نہیں۔

2۔ اسی طرح حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے

عَنْ أَنَسٍ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ أَخَذَ سَيْفًا يَوْمَ أُحُدٍ فَقَالَ: مَنْ يَأْخُذُ مِنِّي هٰذَا؟ فَبَسَطُوا أَيْدِيَهُمْ، كُلُّ إِنْسَانٍ مِنْهُمْ يَقُولُ: أَنَا، أَنَا، قَالَ: فَمَنْ يَأْخُذُهُ بِحَقِّهِ؟ قَالَ فَأَحْجَمَ الْقَوْمُ۔ فَقَالَ سِمَاكُ بْنُ خَرَشَةَ أَبُودُجَانَةَ: أَنَا آخُذُهُ بِحَقِّهِ۔ قَالَ: فَأَخَذَهُ فَفَلَقَ بِهِ هَامَ الْمُشْرِكِينَ

اُحد کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تلوار ہاتھ میں لی اور فرمایا: کون مجھ سے یہ لے گا؟ ہر ایک نے اپنا ہاتھ بڑھایا کہ میں لوں گا، میں لوں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کون اس کو اس کے حق کے ساتھ لے گا؟ لوگ پیچھے ہو گئے۔ پھر سماک بن خرشہ ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اس کو اس کے حق کے ساتھ لوں گا۔ پھر انھوں نے یہ تلوار لی اور اس کے ذریعے مشرکین کی کھوپڑیاں پھاڑ دیں۔ (مسلم)

3۔ اسی طرح لشکر اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روانگی کا واقعہ ہے

أَنَّ رَسُولَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم بَعَثَ بَعْثًا وَ أَمَّرَ عَلَيْهِمْ أُسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ، فَطَعَنَ النَّاسُ فِی اِمَارَتِهٖ، فَقَامَ رَسُولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ: اِنْ تَطْعَنُوا فِی اِمَارَتِهٖ فَقَدْ كُنْتُمْ تَطْعَنُونَ فِی اِمَارَةِ أَبِيهِ مِنْ قَبْلُ، وَ ايْمُ اللّٰهِ اِنْ كَانَ لَخَلِيقًا لِلْاِمَارَةِ وَاِنْ كَانَ لَمِنْ أَحَبِّ النَّاسِ اِلَیَّ، وَاِنَّ هٰذَا لَمِنْ أَحَبِّ النَّاسِ اِلَیَّ بَعْدَهُ (بخاری، عن ابن عمرؓ)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر روانہ (کرنے کا فیصلہ) فرمایا جس پر حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کیا۔ کچھ لوگوں نے ان کی امارت پر اعتراض کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج تم اسامہ کی امارت پر اعتراض کر رہے ہو اس سے پہلے تم نے اس کے والد (زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ) کی امارت پر بھی اعتراض کیا تھا۔ اللہ کی قسم! وہ امارت کے قابل تھا، اور وہ مجھے تمام لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب تھا، اور یہ (اُسامہ) اس کے بعد مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے''۔

کتب احادیث میں ایسی مثالیں ہیں اور علماء ربانیین جانتے ہیں کہ اس طرح کا انتخاب وقتی طور پر صاحب امر کرتے چلے آئے ہیں۔ لہٰذا بیسویں صدی میں علامہ اقبال سامنے آئے اور اپنا فرض ادا کرنے کے معاملے میں بھی کسی عالم دین کی کوئی 'ہتک عزت' یا 'توہین' کا معاملہ نہیں ہے بلکہ صلاحیتوں، جذبوں، اُمنگوں اور دلیرانہ فیصلوں کے لیے صحیح آدمی کا سامنے لانا ہے۔ قرآن مجید میں اس کی مثال موجود ہے سورۃ بقرہ کے رکوع 33 میں ہے کہ ایک قوم نے وقت کے پیغمبر سے مطالبہ کیا کہ جہاد کے لیے کسی مناسب آدمی کے تقرر کیا جائے۔ اللہ نے اپنے پیغمبر

(سیموئیل علیہ السلام) کے ذریعے 'طالوت' کا تقرر کردیا۔قوم کے باحیثیت لیڈر شپ کے متوقع امیدواروں نے اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کردی کہ اس شخص کو قیادت و نمائندگی کا حق کیسے ہوسکتا ہے اس کے پاس مال و دولت نہیں ہے۔پیغمبر وقت نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس کو جنگی تکنیکی علم اور جسمانی قوت دی ہے جو جنگ کے لیے زیادہ کام دیتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس سپہ سالار کی کامیابی کی نشانیاں بتائیں جو یکے بعد دیگرے سب کی سب پوری ہوگئیں۔

- کسی موقع پر کسی غیر متوقع آدمی کے سامنے آنے اور ان کی کامیابی پر فطری طبعی ردِّعمل آئے بھی تو اب پون صدی بعد تو اس شدت میں کمی آنی چاہیے اور اہل نظر علمائے کرام، صوفیائے عظام اور باعمل مسلمانوں کو مل کر علامہ اقبال کے وژن اور طریقے کے مطابق کام کو آگے بڑھانے کا عزم کرنا چاہیے۔ان کا فرمایا ہوا حرف ـــــ حرفِ آخر نہیں، نیک نیتی سے عمل کریں، تجربات سے فائدہ اٹھائیں کہیں بہت بڑا خلا یا گھپلا یا دین کے مجموعی مزاج کے خلاف بات نظر آئے تو مشورے سے اس خلا کو پر کریں۔ملک پاکستان میں اسلام کے عملی نفاذ کی کامیابی یقینی ہے راستہ صرف فکرِ اقبال اور حکمت اقبال ہے۔آزمائش شرط ہے۔علماء کو اس ضمن میں اپنے اختلافات بھلا کر اس کام کا 'بیڑا' اُٹھانا چاہے اور مسلمانانِ جنوبی ایشیا کے نقیب 'مسلمانانِ پاکستان' کے دکھوں کا مداوا کرنے کے لیے عصر حاضر میں پاکستان کو ایک اسلامی عوامی جمہوری فلاحی ریاست بنانے کا کام کرنا چاہیے۔یہ انہی کو زیب دیتا ہے اور انہیں کی ذمہ داری ہے عوام و خواص انہی کی طرف نظریں اُٹھائے دیکھ رہے ہیں اور انہیں سے کسی فوری اقدام کے منتظر ہیں۔ یا وہ علامہ اقبال جیسا آدمی عصر حاضر میں ڈھونڈھ کر دکھائیں خود بھی اس کے تحت کام کریں اور دوسرے معتقدین کو بھی اسی کی تلقین کریں۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِ
النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَآلِہٖ وَسَلِّمْ

عصر حاضر

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام!
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام!
مردہ لا دینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام!

اجتہاد

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذت کردار، نہ افکار عمیق
حلقہ شوق میں وہ جرات اندیشہ کہاں
آہ محکومی و تقلید و زوال تحقیق!
خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق!
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق!

حصّہ اوّل

پہلا باب ......تمہید طولانی ـــــــ 17

دوسرا باب ایک صدی کی مسلم بیداری کے بعد 69

پہلا باب

____ تمہید طولانی ....

عالمی صہیونی استعمار اور مسلمان 20

✿ مذہب کیا ہے؟ ✿ دین کیا ہے؟ ✿ اسلام ہی روئے ارضی پر واحد دین ہے۔ ✿ اسلام ایک حتمی، کامل جامع و مانع اور آخری مرقع ہدایت ہے۔ ✿ جنوبی ایشیا میں برطانوی استعمار کی آمد اور مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ___ دورِ غلامی۔ ✿ سرزمین فلسطین (بیت المقدس کی تولیت) اور بنی اسرائیل (یہود)۔ ✿ بنی اسرائیل قوم یہود ____ تعارف اور مستقبل۔ ✿ مغرب کا سب سے بڑا اقدام ___ نظامِ تعلیم کی تباہی۔ ✿ 1947ء میں پاکستان کا قیام ،مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن ___ علامہ اقبال۔ ✿ قیامِ پاکستان اور ہماری ذمہ داریاں ___ کرنے کا کام

عالمی صہیونی استعمار اور مسلمان

1 مذہب کیا ہے؟
WHAT IS RELIGION?

● یوں تو مذہب کی تعریف (DEFINITION) کئی انداز میں مختلف اسالیب سے کی جاسکتی ہے مگر آسان اور عام فہم تعریف کچھ اس طرح ہے:

انسان اس روئے زمین پر جب آنکھ کھولتا ہے تو ایک وسیع و عریض کائنات، آسمان و زمین اس کے سامنے ہوتی ہے یعنی رات، دن، موسم، میدان، پہاڑ، ندی نالے، چشمے، پھل، اناج، مختلف پیشے وغیرہ وغیرہ۔ انسان اس کُل نظام کے بارے میں اپنے ہم وطنوں اور ہم عصروں کی دیکھا دیکھی میں جو رائے بنالے (چاہے اس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل ہو یا نہ ہو) وہ عقیدہ کہلاتا ہے۔ انگریزی زبان میں اسے DOGMA کہتے ہیں۔ اس رائے یا نقطۂ نظر کے تحت ان تین سوالوں کے جوابات انسان حاصل کرتا ہے اور مطمئن ہو کر اپنے کام دھندے میں لگ جاتا ہے:

1۔ یہ کائنات کسی نے بنائی ہے یا خود بخود بن گئی ہے؟

2۔ یہ کائنات اور نظامِ حیات کیوں بنا ہے؟

3۔ موت واقع ہونے پر انسان کہاں چلا جاتا ہے؟ اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ اور اس کا نتیجہ کیا ہے؟

اس سوچ کا حاصل ہی انسان کا مذہب ہے۔

- یہ سچ ہے کہ آج کی دنیا میں مذہب بالعموم انسان کی نجی زندگی سے متعلق سمجھا جاتا ہے اور جدید ذہن اور مغربی علوم از الف تا یاء سب اسی کے قائل ہیں۔ یعنی اجتماعی زندگی اور اس کے قواعد وضوابط اور متعلقات کو مذہب کی حدود (JURISDICTION) سے ماوراء اور علیحدہ چیز سمجھا جاتا ہے۔

- مذہب کی اس تعریف اور اس پیمانے (YARDSTICK) کو لے کر دنیا بھر کے مذاہب کو پرکھ (CHECK) لیں۔ ہندوازم، سکھ ازم، عیسائیت، یہودیت، بدھ مت، جین مت وغیرہ سب اسی کے ذیل میں آتے ہیں۔ یہ بات یاد رہے کہ اسلام ایک مذہب نہیں، 'دین' ہے۔ قرآن وحدیث میں لفظ مذہب اس معنی میں کہیں استعمال نہیں ہوا۔ قرآن مجید میں تو مذہب کا لفظ آیا ہی نہیں جبکہ حدیث کے ذخیرہ میں بھی آج کے متداول معنوں میں لفظ مذہب استعمال نہیں ہوا، بلکہ صرف 'راستے' کے معنی میں آیا ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے زمانے میں گھروں میں باتھ روم کی سہولتیں نہیں ہوتی تھیں لہٰذا خواتین وحضرات حوائج انسانی کے لیے کھیتوں اور آبادیوں سے دور جاتے تھے جیسے آج بھی کئی دیہاتی آبادیوں میں یہی رواج ہے۔ آپ ﷺ کے بارے میں ایک روایت میں ہے: كَانَ اِذَا ذَهَبَ الْمَذْهَبَ أَبْعَدَ ۔ (سنن اربعہ، عن مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ) ''آپ ﷺ جب قضائے حاجت کے لیے جاتے تو دُور جاتے''۔

- دنیا کے تمام مذاہب تو مذاہب (RELIGIONS) ہی ہیں، اسلام کے لیے یہ لفظ ہم آج استعمال کرتے ہیں اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو دینی تعلیمات سے لاعلمی اور عدمِ واقفیت ہے۔ بینک اکاؤنٹ کھولنے کا فارم ہو یا ملازمت کا، ڈومیسائل کا ہو یا شناختی کارڈ کا، وہاں ایک کالم ہوتا ہے مذہب۔ وہاں دیگر مذاہب کے لوگ ہندو، سکھ، پارسی، عیسائی وغیرہ لکھ دیتے ہیں جبکہ مسلمان اس خانے میں 'اسلام' کا لفظ لکھ دیتے ہیں۔ جس سے عام تصور بن گیا ہے کہ اسلام ایک مذہب ہے حالانکہ حقیقت اس سطحی تصور سے قطعاً مختلف ہے۔

- مذہب کی دنیا میں زندگی کے انفرادی سطح (PRIVATE LIFE) پر تین گوشے متصور ہوتے ہیں:

(i) انسان کے کائنات کے بارے میں تصورات ____ عقائد

(ii) اپنے تصورِحیات کو مضبوط رکھنے اور متحضر رکھنے کے لیے

ISOLATION اور CONCENTRATION کے طریقے یعنی ____ عبادات

(iii) زندگی کے بعض ناگزیر مواقع خوشی، غمی، موت، شادی، بچوں کی پیدائش، کامیابیاں وغیرہ کے موقع کی تقریبات ____ رسومات

ان عقائد (DOGMAS)، عبادات (MODES OF WORSHIP) اور رسومات (RITUALS) کے مجموعے کو مذہب شمار کیا جاتا ہے اور مغرب تمام مذاہب کو اسی سطح پر تصور کرتا ہے۔

- انسانی زندگی کا ایک گوشہ ان مذاہب کی دنیا سے ماوراء ہے اور ان کی پہنچ سے دور ہے یعنی اجتماعی گوشہ یا COLLECTIVE LEVEL جسے دوسرے الفاظ میں حکومت، ریاست، بادشاہت یا STATE کہا جاتا ہے۔

- مغرب کی حالیہ ترقی گزشتہ چھ سات صدیوں کی محنت سے اپنے نقطۂ نظر کو POLISH کرتے کرتے نکھار کر آج جس لیول تک پہنچا دیا ہے اُسے مغرب خود آج SECULARISM اور LIBERALISM کہتا ہے۔ جس کا عام فہم مطلب ہے کہ مذہب الگ شے ہے اور STATE الگ شئے۔ STATE اور STATE CRAFT کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور چونکہ اکثر مذاہب (اسلام کے سوا) کے پاس اجتماعی سطح یا ملکی اور ریاستی سطح کے کسی قانونی ڈھانچے یا SYSTEM کا کوئی تصور ہی نہیں، لہٰذا مغربی دانشوروں نے اپنی سائنسی ترقی اور حیران کن حد تک کائنات کی FORCES کی تسخیر کا بہانہ بنا کر تمام مذاہب عالم کو یہ باور کرا دیا ہے (اور سب مذاہب اس حقیقت پر ایمان لا چکے ہیں) کہ ہمارے مذہب کا سیاست، ریاست اور ریاستی قانون سازی سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ مغرب کے اس فلسفیانہ نکتے کی وجہ سے ہر ملک کی اشرافیہ پر کسی اخلاقی، مذہبی اور اُخروی ACCOUNTABILITY کا خوف ختم ہو چکا ہے لہٰذا ریاستی سطح پر اخلاق، شرافت، شرم، حیا، دیانت داری، امانت (TRUST) اور اخلاقی تعلیمات (MORAL VALUES) کا کوئی تصور ہے نہ بیان۔ اسی لیے دنیا کے ہر ملک میں اشرافیہ اب کسی مذہبی، سماجی، اخلاقی اور ضمیر کے کاٹنے کے احساس سے ماوراء کرپشن میں آزاد ہے۔

2 دین کیا ہے؟

- یہ حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کے کچھ اجتماعی گوشے بھی ہیں اور فی الواقع اجتماعی اصلاح کے یہی میدان ہیں۔ انسانی زندگی میں اجتماعی سطح پر تین گوشے ہیں:

(i) سماجی سطح (SOCIAL LEVEL)

(ii) معاشی سطح (ECONOMIC LEVEL)

(iii) سیاسی سطح (POLITICAL LEVEL)

اسی لیے آج کی جدید اصطلاح میں کسی ملک کے اجتماعی نظام کو -POLITICO SOCIO- ECONOMIC SYSTEM کہا جاتا ہے۔ اگرچہ چند دہائیاں پہلے تک بعض ملکوں کے ماضی میں موجود روایات، مذہب اور علاقائی رسوم کا ملکی سطح کے نظام میں جھلک نظر آجاتی تھی مگر اب تمام ملکوں کے اجتماعی نظام نے مغربی علوم کی بھرمار اور بالادستی کے تحت یک رنگی اختیار کر لی ہے اور ان کی عظیم اکثریت یقینی طور پر (FOR ALL PRACTICAL PURPOSES) سیکولر اور لبرل مزاج کی حامل بن چکی ہے۔

- لفظ سیکولر کے معنی ڈکشنری میں ایسا اجتماعی طرز حکومت اور نظام جس میں مذہب کا کوئی ریفرنس نہ ہو اور نہ اس سے بحث ہو۔ اسی طرح لفظ لبرل کا مطلب ہر سماجی، اخلاقی، انسانی ہمدردی کے بندھن سے آزاد اجتماعی نظام۔

- کہنے کی حد تک سیکولرازم اور لبرل ازم تمام مذاہب کو برداشت کرتا ہے اور اپنے ملک کے تمام شہریوں کو اپنے گھر میں اپنے اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دیتا ہے۔ مگر عملی طور پر ملکی قانون، نظامِ تعلیم، CO-EDUCATION، بے پردگی، بے حیائی، فلمیں، ڈرامے تمام اخلاق سوز لٹریچر (فلمیں، گانے، ویڈیو کلپس) کی فراوانی کے ماحول میں نوجوان اور نئی نسل والدین کی گرفت سے نکل کر آزادی کی طرف پھسل رہے ہیں اور پچھلی دو نسلوں میں مذہب اور مذہبی اقدار و اخلاق کی خطرناک حد تک کمی کا مشاہدہ آنکھوں سے کیا جاسکتا ہے۔ مغربی ماہرین تعلیم اور مفکرین برملا کہتے ہیں کہ ہم نے 1960ء کی دہائی کے بعد تین نسلیں ایسی جوان کر دی ہیں جو MORAL LESS اور VALUE LESS ذہن رکھتی ہیں وہ صرف ڈارون اور فرائڈ کے انسان

ہیں یا مارکس کے فلسفے کے مطابق پیٹ کی پوجا کرتے ہیں شکل انسانوں سے ملتی ہے مگر ہیں حیوانِ محض (BEASTS)۔

- دین ایک قرآنی اصطلاح ہے جو انسانی اجتماعی زندگی کے نظام کو ظاہر کرتا ہے۔ دین کے لفظ میں ایک قانون کا تصور ہے۔ ظاہر ہے قانون ہے تو کوئی قانون بنانے والا ہے یا قانون دینے والا ہے۔ پھر یہ بات بھی بادنیٰ تامّل سمجھ میں آتی ہے تو قانون کی خلاف ورزی پر سزا اور قانون کے مطابق چلنے پر اچھا بدلہ اور AWARD کا تصور آتا ہے۔

قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے میں 'دِیْنِ الْمَلِكِ' (بادشاہ کا دین) کے الفاظ ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی کو 'بادشاہ کے قانون' کے مطابق روک نہیں سکتے تھے۔ قرآن مجید میں فرعون کا بھی ذکر ہے وہ بہت بڑا مطلق العنان اور منہ زور بادشاہ اور خدائی کا دعویدار تھا اس کا بھی ایک نظام تھا قانون تھا تہذیب تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اُس سیکولر اور لبرل بادشاہ نے یہ کہا کہ یہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) تمہارے دین اور شاندار تہذیب (جیسے آج کل ہالی وڈ، بالی وڈ کلچر، فلمی ستارے اور کرکٹ سٹار ہیں جو مغربی سیکولر اور لبرل دین پر ایمان لا کر اس کی تبلیغ میں مصروف ہیں، سینما گھر ان کی کارنر میٹنگ کی جگہ ہیں، فلمی بورڈ ان کے نعرے اور سلوگن ہیں۔ ان فلمی ستاروں کا طرز زندگی ان کا آئیڈیل ہے اور سیکولر و لبرل طرز زندگی ان کا دین ہے یہی کچھ آج جدید تہذیب اور جدید طرز تعلیم سکھا رہے ہیں اور اس کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ہر ہاتھ میں ZIKR-COUNTER اور تسبیح کی بجائے اب موبائل ANDROID فون ہیں ان کی فضائل کی کتابیں FACE BOOK، TWITTER اور INSTAGRAM ہیں اور اس پر ہماری نوجوان نسلیں ہر وقت مصروفِ عمل ہیں) سے تمہیں بیگانہ کر دے گا۔ پھر قرآن مجید میں "فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ" کے الفاظ ہیں۔ ظاہر ہے دین فرعون اور دین ملک کی طرح 'دین اللہ' کے معنی بھی سوچ لیے جائیں جو دین فرعون، دین ملک اور دین جمہور سے یکسر مختلف ہوگا۔ اسلام کو 'دین' اسی معنی میں کہا گیا ہے۔

- مختصراً ــــ سیکولر ازم اور لبرل ازم میں حاکمیّت عوام کی ہے اور عوامی حکومت میں عوامی نمائندے قانون سازی کرتے ہیں اور ان کی رہنمائی عوامی رجحانات اور نظامِ تعلیم یا فلمی دنیا کے

’دماغ‘ یا فیشن ڈیزائنر کرتے ہیں۔ وہی مختلف قوانین بناتے ہیں مگر ان کے کسی قانون کو بنانے اور ختم کر دینے میں کسی مذہب، مذہبی حکم یا مذہبی کتاب یا مذہبی سوچ کا ریفرنس نہیں ہوتا۔

- جبکہ اللہ کے دین ___ اسلام میں حاکمیّت اللہ کی ہے وہ حقیقی قانون دینے والا ہے اس نظام کا نام اللہ کی نمائندگی یا VICEGENCY یا نظامِ خلافت ہے۔ اس کی بھی کوئی عوامی شوریٰ، اسمبلی، مجلس قانون ساز ہوگی صدارتی یا پارلیمانی نظام ہوگا مگر قانون کاؤنٹی (کونسل) کے لیول سے لے کر وفاقی سطح تک صرف اللہ کا دیا ہوا ہوگا اس کے قانون کے خلاف اور اس کے رسول (MESSENGER) کی تعلیمات اور عمل کے خلاف کسی سطح پر کوئی قانون نہیں بن سکے گا۔

- سیکولر نظام اور لبرل نظام میں سارا قانونی اور ریاستی ڈھانچہ خود انسان کا سوچا ہوا ہے اور تجربے سے بنا ہے یعنی MAN-MADE ہے جبکہ اسلام میں قرآن وحدیث قانون کے مآخذ ہیں اور یہ خدا کا عطیہ ہے اور اللہ کا دیا ہوا ہے جو سب سے انصاف کرتا ہے۔ جبکہ انسان کا بنایا ہوا قانون مقتدر طبقات (اشرافیہ) کو تحفظ دیتا ہے۔ اسی کی چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ ___ مغرب میں آج کل بغیر نکاح کے اولاد کا تصور عام ہے اور شاید بغیر نکاح کے اولاد کا تناسب 60% سے بڑھ چکا ہے۔ یہ اولاد (SINGLE PARENT CHILD) اب جائز ہے اور صرف ماں کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ حالانکہ چند عشرے پہلے یہ اولاد ILLEGAL کہلاتی تھی اور ایسے بچوں کے لیے انگریزی میں BASTARD کا لفظ موجود ہے جسے اُردو میں حرام زادہ کہتے ہیں۔ اور یہ لفظ مغرب میں بھی ایک گالی تھا۔ MAN-MADE LAW کا مطلب یہ ہے کہ پارلیمنٹ یا سینٹ اب اختیارِ مطلق کی مالک ہے وہ جو چاہے قانون بنائے۔ اب کچھ عرصے بعد یہ قانون بن سکتا ہے کہ ملکی کانگریس اور سینٹ کے تمام ممبران بشمول صدر، وزراء اور اعلیٰ حکومتی عہدیدار سب SINGLE PARENT CHILD ہی بن سکیں گے اور تمام عدلیہ اور سرکاری ملازمتیں صرف دینِ مغرب کے ماننے والے S.P.C بچوں کو ہی ملیں گی اور اب فوج میں صرف ایسے بچے ہی بھرتی ہوسکیں گے تو دنیا کا کوئی قانون اور عدالت ان کو روک نہیں سکتی۔ جس کسی شخص کے یہ دل کو بھائے وہ مشرق میں رہتے ہوئے بھی مغربی ذہن کا مالک ہے اور مغرب میں رہتے ہوئے جس کو اللہ کا دیا ہوا قانون (قرآن وحدیث) پسند ہو وہ مسلمان ہے اور اسلام کا ماننے والا ہے۔

3 اسلام ہی روئے ارضی پر واحد دین ہے

دین اسلام، اللہ کا دین ہے۔ اُس ہستی کا دین ہے جس نے اس کائنات کو پیدا فرمایا۔ پہلے غیر مادی دنیا ہے پھر لطیف مخلوقات سے کثیف مخلوقات کی طرف رُخ رہا۔ پہلے عالم امر ہے جہاں فرشتے ہیں، جنت، دوزخ اور ان کی تفصیلات ہیں۔ پھر عالم خلق ہے۔ عالم خلق میں مادّی اشیاء ہیں۔ آسمان، زمین، فضائی کرے، چاند، سورج، زمینی اشیاء پھر 'جن' اور آخر میں 'انسان' کی تخلیق ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کو خالق کائنات نے اشرف المخلوقات بنایا ہے اور واقعتہً انسان ہے ہی ایسی شے، ایسی باصلاحیت مخلوق کہ برائی کی طرف مائل ہو جائے تو ابلیس کے بھی کان کترتا نظر آتا ہے۔ بقولِ اقبال

اے خدا وند صواب و نا صواب   من شدم از صحبت آدم خراب

ترجمہ: اے ارض وسما کے مالک خدا! تو تمام درست اور غیر درست (اعمال) کا مالک ہے۔ میں اس جہان میں آدم (انسان) کی صحبت اور 'INTERACTION' سے بگڑتا جا رہا ہوں) (نالہ ابلیس)

اور نیکی کی راہ پکڑ لے تو اعلیٰ ذوق، اعلیٰ کردار اور ملکوتی سیرت کے نقشے سامنے آتے ہیں۔ چاہے انفرادی زندگی ہو چاہے اجتماعی زندگی۔ یہ بھی اقبال ہی نے فرمایا کہ ''حضرت محمد ﷺ کے ادنیٰ غلام بھی مادی دنیا میں کن اعلیٰ مقامات تک رسائی رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ کی مدحت کے اشعار عظمت انسانی کا نشانِ اعتراف ہیں۔

؎ شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمال بے نقاب

_____ اور حضرت محمد ﷺ اور آپ کے اوّلین تربیت یافتہ افراد (TEAM) میں کردار کی یہ دو انتہائیں (EXTREMES) بیک وقت موجود تھیں۔ (القرآن 29:48)

اس حقیقت کا ادراک بھی اقبال کا حصہ ہے

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم   رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

● اس خالق کائنات نے اس انسان کے دنیا میں بھیجے جانے کے ایک طویل عرصے میں درجہ بدرجہ اجتماعیات (SOCIAL SCIENCES) کے ارتقاء کے نقطۂ کمال پر حضرت محمد ﷺ کو

مبعوث فرمایا اور قرآن کریم جیسی کتاب نازل فرما کر انسان کے حوالے کر دی۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ 'ختم نبوت' کا تاج حضرت محمد ﷺ کے سر پر سجایا گیا۔ ختم نبوت کا حکم خداوندی دوسرے الفاظ میں ایک صحیح الفطرت، باضمیر اور GENUINE دل کے مالک انسان کی سوچ، خیالات، منطق (DERIVATIVE ہو یا INDUCTIVE) اُمنگوں، آرزوؤں اور حُبّ ادرش کے سچے جذبوں پر پیشگی مہر تصدیق ثبت کرنا ہے کہ قرآن و حدیث سے مسلمان (اجتماعی سطح پر) جو اَخذ (DERIVE) کرے گا وہ عین قرآن ہوگا۔

- اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کی کتب و تعلیمات تاریخ انسانی میں 'آدم' کی تربیت کے "O" لیول، "A" لیول اور پوسٹ 'A' لیول کے درجات تھے جبکہ حضرت محمد ﷺ کو قرآن دے کر نوعِ انسانی میں ودیعت شدہ امکانی ذہنی و فکری ارتقاء اور عملی نمونہ کی ضرورتوں اور مشکلات کا مثبت جواب دے کر قرآن کی شکل میں فکری و نظری روشنی (نور) اور حضرت محمد ﷺ کی شکل میں عملی رہنمائی دے کر انسانی تخلیق کا مدعا مکمل کر دیا۔ سادہ الفاظ میں روئے ارضی پر انسانی انفرادی و اجتماعی ضرورتوں کی تشفی بخش و تسلی بخش صورت صرف اسلام ہے۔
- عصر حاضر میں صہیونیت کے اٹھائے گئے FAKE سوالات میں سے ایک سوال کا جواب بھی یہی ہے کہ اسلام کے علاوہ اکیسویں صدی کے عروجِ آدم خاکی کے دور میں بھی کسی آسمانی ہدایت یا کسی فلسفہ میں انسانی اجتماعی زندگی کے مسائل کا حل موجود نہیں ہے۔

ریاست و مذہب یا دین و دنیا کی جدائی انسانوں کے لیے سم قاتل ہے۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ، ہوس کی وزیری!

گویا مثبت طور پر بھی اور منطقی اسلوب سے بھی اور ایجابی و سلبی دونوں پہلوؤں سے روئے ارضی پر آج کے انسان کے اجتماعی و انفرادی زندگی کے گمبھیر مسائل کا حل موجود ہے تو صرف قرآن کے پاس ہے اور کسی دوسرے مذہب، فلسفے اور انسانی فکر میں ممکن ہی نہیں ہے۔

4 اسلام ایک حتمی، کامل، جامع و مانع اور آخری مرقع ہدایت ہے

- اسلام کو (چودہ صدیاں قبل سے آج تک) اسی حتمی حیثیت سے مان لینے کا نام صرف 'ایمان' ہی نہیں بلکہ یہ 'ایمان' اس انسان کی سلامتی طبع، زندہ و بیدار دل، زندہ خودی، باضمیر، سچا اور کھرا انسان ہونے کی دلیل ہے۔
- علامہ اقبال اسی خیال کے حامی تھے۔ 1934ء میں ہندو لیڈر پنڈت نہرو کے خط کے جواب میں انہوں نے اسلام کے ختم نبوت کے عقیدہ اور بالواسطہ پھر قادیانیت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ آج کے پورے مغرب، مغربی سوچ، پھر اپنے استدلال پر مصر ہونے کے ابطال کے لیے کافی ہے۔

علامہ اقبال کے ایک معتبر شارح ڈاکٹر محمد رفیع الدین بھی اسی خیال کے حامی ہیں اور ان کے نزدیک بھی علامہ اقبال کا سارا فکر اسی محور کے گرد گھومتا ہے۔ اور لفظ 'ختم نبوت' ہی کا تقاضا ہے کہ اسلام قربِ قیامت میں صرف قرآن وحدیث کے اصولوں کے مطابق سچے اور کھرے مسلمانوں کے بے لوث استنباط (INDUCTION) اور استخراج (DERIVATION) پر مبنی تشریحات پاکستان میں غالب ہونے کے بعد عالمی سطح پر پھیلے گا اور پورے کرۂ ارضی پر انسانی فطرت کے مطابق اسلامی تعلیمات کا دور دورہ ہوگا اور غلبہ ہوگا جیسے آج تہذیب مغرب کا غلبہ ہے بلکہ اس سے بھی گہرا کہ انسانیت قانونی سطح پر بھی اور بدل و جان بھی اس کو قبول کر رہی ہوگی اور اس پر خوش ہوگی۔

- ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کی شاہکار کتاب IDEOLOGY OF THE FUTURE کا سارا تھیم (THEME) یہی ہے کہ فلسفیانہ سطح پر مستقبل کا نظریہ صرف اور صرف اسلام ہے۔
- علامہ اقبال بھی اسی بات کے قائل نظر آتے ہیں۔ طلوعِ اسلام (1923ء) نامی نظم میں وہ اسلام کے عالمی غلبے کی نوید سنا رہے ہیں تا کہ قوم جاگے اور آزادی حاصل کرے۔

مندرجہ ذیل فارسی اشعار اسی تصور کی عکاسی کرتے ہیں:

ے

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
زاں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ ﷺ او را بہا است
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ﷺ است

5 جنوبی ایشیا میں برطانوی استعمار کی آمد اور مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ــــ دورِ غلامی

- برطانوی استعمار دراصل عالمی صہیونی استعمار کا ایک حصہ تھا اور بڑی منصوبہ بندی سے جنوبی ایشیا میں داخل ہوا اور اس نے مختلف سازشوں اور بعض بے عمل مسلمانوں کو بھاری رقوم کے عوض خرید کر مغلوں کے خلاف صف آرا کر دیا۔ برطانوی استعمار کے ہاتھوں بکنے والوں میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو، سکھ، پارسی، اسماعیلی اور دیگر مذاہب واقوام کے لوگ بھی پیش پیش تھے۔ 1498ء میں واسکوڈی گاما نے جنوبی افریقہ سے ہو کر ہند میں کلکتہ تک راستہ دریافت کیا تو مختصر وقفے بعد مختلف جاسوس، سیاح اور تاجر آنا شروع ہوئے۔
- یورپ میں سپین (ہسپانیہ اور اندلس) میں مسلم اقتدار آٹھ صدیاں گزار کر بالآخر ختم ہوگیا۔ یہود کی تاریخ میں (دورِ انتشار 70ء تا 1917ء) میں جتنا بہترین وقت بنی اسرائیل نے مسلمانوں کے عہد میں اندلس میں گزارا اور عزت ملی، اتنی شاید ہی انہیں کہیں عزت ملی ہے۔ مگر عربی محاورہ میں "سَمِّنْ كَلْبَكَ يَأْكُلكَ" (اپنے کتے کو پال کر موٹا تازہ کرو، وہ تمھیں ہی ایک دن کاٹ لے گا) بنی اسرائیل نے اندلس میں رہتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف سازشیں ہی کیں۔ اندلس میں بیٹھ کر پورے یورپ میں تجارتی اسفار کرتے رہے اور مختلف ممالک کے خلاف سازشیں اور یورپی اقوام کو مسلمانوں ہی کے خلاف ابھارتے رہے۔ شاید بنی اسرائیل کے ہاں ڈکشنری میں کسی کے حسن سلوک اور احسان کا بدلہ دینے کا طریقہ یہی درج ہوگا۔
- اندلس کے عہد میں مسلم اقتدار آدھے یورپ پر محیط ہوگیا تھا اور فرانس کے دارالحکومت تک مسلم افواج پہنچ چکی تھیں۔ بنی اسرائیل (یہود) اندلس میں رہ کر ہی مسلمانوں کے خلاف جس

کام میں مشغول رہے اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

- 93ھ میں جرنیل طارق بن زیاد شمالی افریقہ سے جبل الطارق اترا اور اندلس (سپین) فتح کر کے مسلم اقتدار کو مضبوط کیا یہ بنوامیہ کی شاخ یہاں 1492ء تک اقتدار میں رہی۔

93ھ ہی میں دوسرے جرنیل محمد بن قاسم نے سندھ پر راجہ داہر کی باز پرس کے لیے اور مسلم تاجروں کے ساحلی سفر کو محفوظ بنانے کے لیے حملہ کیا۔ سندھ فتح کیا، منصورہ کے مقام پر دارالحکومت قائم کیا۔ پھر پنجاب کا علاقہ فتح کیا اور ملتان دارالحکومت بنایا۔ موجودہ پاکستان تقریباً پورا مسلم افواج نے پہلی صدی ہجری میں ہی فتح کر لیا تھا۔

- مشرق وسطیٰ و عرب میں 132ھ (750ء) میں بنوامیہ کا اقتدار ختم ہو گیا اور بنوعباس کا دورِ حکومت آ گیا۔ یہود نے اندلس میں بیٹھ کر مسلمانوں کے مرکز اور بنوعباس کی حکومت کے خلاف سازشیں کیں، پہلے مرکز گریز حکومتیں قائم کرائی گئیں۔ مصر میں فاطمیہ کی حکومت، جنوبی عرب (یمن وغیرہ) میں خوارج کی حکومت بنی جو ایک وقت میں بیت اللہ شریف سے ایک مختصر جنگ کے بعد حجرِ اسود اکھاڑ کر لے گئے اور کئی سال بعد واپس کیا۔

- بنوعباس نے 750ء سے 1258ء تک (132ھ تا 656ھ) پانچ صدیاں حکومت کی مگر پہلے تین سو سالوں میں ان کا رعب و داب قائم رہا اور حکومت مستحکم رہی مگر آخری دو صدیوں میں 'شمشیر و سنان اوّل، طاؤس و رُباب آخر' کا اصول سامنے آ گیا، اور بنوعباس کا اقتدار ہچکولے کھا کر 1258ء میں بغداد میں لپیٹ دیا گیا۔

- بنی اسرائیل کا بگڑا ہوا طبقہ مسلمانوں کے اقتدار کے خلاف دن رات مصروف رہا۔ پورے یورپ کے عیسائیوں کو بھڑکایا اور 16ھ میں بیت المقدس کے مسلمانوں کے پاس چلے جانے کا طعنہ دیتے اور مذہبی جنگ (صلیبی جنگ) کے لیے اُبھارتے رہے چنانچہ پورے یورپ نے متحد ہو کر بیت المقدس پر حملے شروع کر دیے۔ کئی شکستوں کے بعد بالآخر 1089ء میں بیت المقدس پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے یہ علاقہ نکل گیا۔ مسلمانوں کی اجتماعی کمزوریوں کے باعث بنی اسرائیل نے مسیحی یورپ کو ابھارا اور بنوعباس کی حکومت کے حصے بخرے کرنے اور تقسیم کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔

- بنوعباس کے خلاف مسیحی یورپ بحیرۂ روم کے راستے سمندری حملے کرتے اور مسلمانوں کونقصان پہنچاتے رہے اور مسلمانوں میں جذبہ جہاد اور دینی غیرت کمزور پڑ چکی تھی۔ لہٰذا بنوعباس کے پاس جرأت اور حوصلے کا فقدان تھا کہ وہ صلیبیوں سے بیت المقدس واپس لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے خصوصی مدد فرمائی اور ملک شام کے علاقے میں ایک مقامی چھوٹا حکمران نورالدین زنگی سامنے آیا (جس نے بغداد کی حکومتِ بنوعباس کے زیر سایہ اپنی حکومت قائم کرلی تھی) اس نے صلیبیوں کا سیلاب روکنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر کامیابی نہ ملی۔ اللہ نے اس کو صلاح الدین ایوبی جیسا جانشین عطا فرمایا، جس نے جان پر کھیل کر ایک صدی بعد بیت المقدس کو صلیبیوں کے ہاتھ سے واپس لے کر بنوعباس (مسلمانوں) کی حکومت میں شامل کر دیا۔ یہ اس وقت بہت بڑی کامیابی تھی اور رچرڈ جو صلیبی قوت کا سپہ سالار تھا اس کا بھی حوصلہ ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد صلیبیوں نے کبھی بیت المقدس کا رخ نہیں کیا۔ یہ واقعہ 1190ء کا ہے۔
- چنانچہ صلیبی جنگوں کے ماسٹر مائنڈ (MASTER MIND) بنی اسرائیل نے 1200ء کے بعد مسلمانوں کو زیر کرنے کے لیے اپنی پالیسی بدلنے کا فیصلہ کیا ہے اور جنگوں اور حملوں پر خرچ کرنے کو نقصان کی انویسمنٹ (سرمایہ کاری) سمجھ لیا۔ چنانچہ ___ ہم دیکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے آئندہ مسلمانوں کی حکومت کو گرانے، نقصان پہنچانے اور نیست و نابود کرنے کے لیے اپنے بین الاقوامی تعلقات کی پناہ لی ہے اور ان کو آزمانے کا فیصلہ کیا ہے۔
- بنی اسرائیل کوئی 1800 ق م سے ہی بین الاقوامی تجارت میں شامل ہوئے اور جلد ہی اس میں نمایاں مقام بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام (960 ق م) کا دور آنے تک وہ پوری دنیا کے تجارتی مراکز میں نہ صرف آتے جاتے تھے اور موجود تھے بلکہ ان کی رہائشی کالونیاں علاقہ جات بھی تھے۔ چین سے ان کے تجارتی تعلقات ہی تھے اور چین میں اس وقت ایک مستحکم حکومت قائم تھی۔ انھوں نے نامعلوم کیا فرضی حالات بتائے کہ چنگیز خان اور ہلاکو خان کو بغداد پر حملہ کرنے پر آمادہ کرلیا۔ چنانچہ 1200ء کے بعد تیسری دہائی میں چنگیز خان نے بغداد پر حملہ کر دیا اور حکومتی ایوانوں اور حکومتی ساکھ کو شدید نقصان پہنچایا لیکن یہ حکومت اتنی بڑی تھی کہ ختم نہ ہوئی۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ بنی اسرائیل نے چین سے دوبارہ درخواست کر کے اور اپنے اوپر

مسلمانوں کے مظالم کا رونا رو کر حملہ کر کے ان کو آزاد کرانے کی درخواست کی۔ اب ہلاکو خان کے نام سے جرنیل فوج لے کر آیا، بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور بنوعباس کے اقتدار کو ختم کر دیا اور پانچ صدیوں پر محیط عربوں کی یہ خلافت دنیا سے ختم ہوگئی۔ اس عہد کے ختم ہونے سے پہلے گویا اُمت مسلمہ کا مرکز 'عرب' تھا اور آپ ﷺ کے بعد انہی کے ہاتھوں میں اسلامی خلافت کا پرچم تھمایا گیا تھا۔ پہلا دور خلافت راشدہ (11ھ تا 40ھ)، دوسرا دور خلافت بنواُمیہ (41ھ تا 132ھ) اور تیسرا دور خلافت بنوعباس (132ھ تا 656ھ)۔ دورِ بنواُمیہ اور دورِ بنوعباس اگرچہ نام کی خلافت تھی دراصل ملوکیت تھی اور ان میں اکثر حدیث کے الفاظ کے مطابق 'مُلْکًا عَاضًّا' کی تعریف میں آتے تھے۔ 1258ء میں ہلاکو خان کے ہاتھوں، عرب اقتدار ختم ہوا اور اس کے بعد غیر عربوں میں مسلم اقتدار منتقل ہوگیا۔ گزشتہ 8 صدیوں میں عربوں کا عالم اسلام پر غلبہ نہ ہوسکا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ سلطنت کو ختم کرنے میں بنی اسرائیل یعنی صہیونیت کا پورا عمل دخل تھا اور ان کے مفاد وابستہ تھے۔

- تیرھویں صدی عیسوی کے شروع ہونے پر صلیبی جنگوں کی ناکامی کے بعد بنی اسرائیل نے مسیحی دنیا میں رہنے کے لیے آئینی اور حکومتی سطح پر اپنی حیثیت منوانے کا طریقہ اختیار کیا ہے۔

1215ء میں انگلستان کے بادشاہ سے انسانی حقوق کا چارٹر منظور کرایا کہ انسانی کی بحیثیت انسان عزت ہونی چاہیے گویا مجرموں اور ملک و قوم کے دشمنوں اور غداروں کو بھی انسان سمجھنا چاہیے۔ بظاہر یہ اصول بہت اچھا لگتا ہے مگر بنی اسرائیل جس ملک میں گئے وہاں سازشوں کے ذریعے اقتدار حاصل کرنا یا حکومت کو گرا دینا یہ ان کا مشغلہ تھا اور اس میں وہ اپنے مفاد دیکھتے تھے۔

1225ء میں انگلستان میں ہی بادشاہ سے انسانی حقوق سے آگے بعض خصوصی مراعات اپنے لیے حاصل کرلیں۔ یہ انسانی حقوق کا MAGNA CARTA کہلاتا ہے مگر اس منشور کا بھی اصل اور حقیقی فائدہ صرف یہود (بنی اسرائیل) کو ہوا۔

- یورپ میں مسلمانوں میں تعلیم اور علم عام تھا اور اَندلس کی یونیورسٹیوں میں یورپ سے مسیحی نوجوان ایسے تعلیم حاصل کرنے آتے تھے جیسے آج کل یورپ اور امریکہ وغیرہ جاتے ہیں۔

اندلس میں مسلم اقتدار کے خاتمے کے بعد یورپ میں علمی بیداری ہوئی۔ اندلس سے علم یورپ منتقل ہوا۔ جسے آج کا مغرب DARK-AGES (دورِ جہالت) کہتا ہے وہ یورپی مسیحی اقوام کی DARK-AGES اور علم و آگہی سے تہی دستی کا دور تھا ورنہ مسلم یورپ میں اُس وقت بھی علم کا سورج نصف النہار پر تھا، تعلیم تھی، صنعت و حرفت تھی، ایجادات تھیں، سائنسی ترقی تھی، مگر افسوس کہ یورپ اس مسلم ترقی کا نام لینا گوارہ نہیں کرتا۔ مسلمان سائنس دانوں کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھتے ہیں مگر مسلمان نام نہیں لیتے۔ کسی مسلمان کا نام لیتے بھی تو ایسا بگاڑ کر کہ ہم سمجھ ہی نہیں سکتے کہ یہ شخص مسلمان ہے۔ الجبرا ___ مسلمانوں کی ایجاد ہے، علم کیمیا مسلمانوں سے یورپ میں گیا۔ جابر بن حیان کا نام عام نہیں۔ البیرونی ابن سینا وغیرہ کے نام بگاڑ کر لیے جاتے ہیں۔ ابن سینا کو AVICINIA لکھ دیتے ہیں۔ حالانکہ مسلمانوں نے یونانیوں سے علم طب سیکھا تو آج بھی حکیموں کی دکانوں پر یونانی دواخانہ کے بورڈ آویزاں نظر آتے ہیں۔ علم کی یہ قدردانی افسوس یورپی کارپردازوں کے حصے میں نہ آسکی کہ وہ مسلمانوں کے نام واضح لیتے تاکہ ہم مسلمان بچوں کو فخر سے بتاسکیں مگر یہ صہیونی بالادست قوت کے ایمان وعقائد اور EVIL GOAL کے خلاف ہے، لہٰذا ممکن نہیں۔ صرف مسلمان ہی نہیں، برطانوی مصنف برٹرینڈ رسل (1872ء-1970ء) بھی لکھتا ہے کہ جس تاریخی دور کو ہم DARK-AGES لکھتے ہیں وہ علم دشمنی کا دور صرف مسیحی یورپ کے لیے تھا ورنہ اندلس جو مسلم یورپ تھا، وہاں بارھویں صدی میں بھی پانی کا نظام، پانی کی نکاسی کا نظام، پختہ سڑکیں اور سڑکوں پر رات کو روشنی کا انتظام ہوتا تھا۔ افسوس کہ یہ بات کسی وجہ سے آج جدید مغربی نصابِ تعلیم میں کسی سکول میں پڑھائی نہیں جاتی۔

- یورپ میں مسلمانوں کے علوم عام ہوئے تو بنی اسرائیل نے جدید علوم اور مسیحی عقائد اور مسیحی علوم میں جنگ کروادی۔ حالانکہ وہ مسیحی عقائد (DAGMAS) بنی اسرائیل ہی کے ذہن کا شاخسانہ (BRAIN CHILD) تھا۔ معاذ اللہ حضرت عیسیٰ خدا ہیں، حضرت مریم خدا ہیں، جبریل خدا ہیں یہ تثلیث ہے اور آج کے عیسائیوں کی عظیم اکثریت 250 کروڑ انسان اس کے قائل ہیں۔ انگریزی میں اسے TRINITY کہتے ہیں۔ ایک میں تین اور تین میں ایک کا عقیدہ۔ پھر حضرت مسیح نے سولی چڑھ کر تمام آنے والے (قیامت تک) مسیحیوں کے گناہوں کا کفارہ ادا

کر دیا ہے۔اس لیے اب عیسائیت میں کوئی مذہبی LAW نہیں ہے نہ انفرادی سطح پر نہ اجتماعی سطح پر۔عیسائی بن جاؤ اب مذہبی آزادی ہے جو چاہو کرو۔

آج کے یورپ کی مسیحی برادری کو یہ دو اصول کس نے سکھائے ہیں کہ حضرت مریم سلام علیہا کے ہاں بغیر نکاح کے معجزانہ طور پر حضرت مسیح پیدا ہوئے، وہ پیغمبر اور رسول تھے۔آج کے مسیحی مذہب کا نام لیوا عورتیں حضرت مریم کی طرح بغیر نکاح کے اولاد کا تصور لیے پھرتی ہیں اور یورپ امریکہ اور دیگر عیسائی مغربی دنیا میں بغیر نکاح اولاد ہوتی ہے اور SINGLE PARENT فیملی کا تصور عام ہے اور ان کے عقیدے اور سوچ کے مطابق (معاذ اللہ) یہ حضرت مریم کا 'اُسوہ' ہے اور حضرت مسیح نے شادی نہیں کی بغیر نکاح کے زندگی گزاری ہے لہٰذا مسیحی دنیا کے مرد آج اسی پر عمل پیرا ہیں اور نکاح کا تصور نہیں۔اولاً تو ABORTION جائز ہو گئی ہے، فیملی پلاننگ کے طریقے عام ہیں پھر بھی بچہ ہو جائے اور ABORTION نہ کرائی جائے تو بچہ جائز ہے۔حکومتی قانون اس کو تسلیم کرتا ہے۔لہٰذا کوئی ضمیر کی خلش ہو بھی تو قانون ان کو مطمئن کر دیتا ہے۔یہ ابلیسی تعلیمات مذہب کے نام پر پورے یورپ میں کس نے عام کی ہیں؟ یہ بنی اسرائیل اور صیہونیت (ZIONISM) کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

- یورپ میں بنی اسرائیل نے اپنے لیے سود حلال کرنے کے لیے عیسائیت میں ایک PROTESTANT فرقہ کھڑا کر دیا جو نام کا عیسائی ہے باقی وہ کسی مسیحی تعلیمات کو نہیں مانتا۔سود کو بھی حلال سمجھتا ہے (حالانکہ سود یہودیت، عیسائیت اور اسلام سب میں ناجائز اور حرام ہے)۔ چنانچہ سترھویں صدی کے آغاز میں 1602ء میں بینک آف انگلینڈ قائم ہو گیا اور سودی کاروبار کا لین دین کا عالمی سطح پر رواج پڑ گیا اور یہ بینک بنی اسرائیل کے کنٹرول میں تھا۔
- اس دور میں برطانوی / یورپی تاجر زمینی سفر کر کے جنوبی ایشیا نہیں آ سکتے تھے کہ عالم اسلام ہے، فوج نہیں آ سکتی تھی، سلطنت عثمانیہ میں سترھویں صدی کے آخر میں پورا افریقہ، آدھا مشرق یورپ بشمول روسی ریاستیں، مشرقِ وسطیٰ، عرب اور ہند شامل تھا۔

اقوامِ یورپ نے جنوبی ایشیا کے وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے تاجروں کا روپ دھارا اور اس مقصد کے لیے EAST INDIA COMPANY بنائی گئی۔ چنانچہ یہ لوگ تاجروں کے

نام سے تجارت کے لیے جہانگیر کے دربار میں پیش ہوئے اور اپنے آپ کو غریب مسافر اور وطن سے دور مسکین ظاہر کر کے حکومتی امپورٹ ٹیکس اور ایکسائز ڈیوٹی معاف کرالی۔ پھر بد دیانتی کر کے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے تجارتی مال میں اسلحہ لائے اور گودام بنا کر اسلحہ جمع کر لیا۔ پھر لالچ دے کر مقامی لوگوں کو ساتھ ملایا اور مسلمانوں کی حکومت کو گرانے کا آغاز کر دیا۔ EIC تجارت کرنے آئی تھی لہٰذا ہندو اور دیگر غیر مسلم اقوام نے ان کا ساتھ دیا اور مغربی مال ملک بھر میں تقسیم کنندگان بن گئے۔ جبکہ مسلمان انگریز کے عزائم کے پیش نظر اس سے کوئی تعاون نہیں کرتے تھے۔

- اورنگ زیب کے بعد مغلیہ سلطنت کے حالات خراب ہوئے تو پہلے اسی عالمی مافیا نے ایران سے ایک بادشاہ کو دہلی پر حملے کا مشورہ دیا اور ہلاکو خان کی طرح LOGISTIC SUPPORT کا وعدہ کیا وہ بے شمار خزانہ لوٹ کر لے گیا، جس میں یقیناً EIC کو بھی ایک بڑا حصہ ملا ہوگا۔

- اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ 1757ء میں بنگال کے مغل حکمران کے مقامی حاکم سراج الدولہ کے خلاف غدار میر جعفر کو کھڑا کر دیا اس کی رقم اور اسلحہ سے مدد کی اور جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کو اسلحہ کی جدیدیت کی بنا پر شکست دے کر میر جعفر کو حکمران بنا دیا۔ دراصل انگریز اور برطانوی استعمار کے پردے میں یہ بنی اسرائیل ہی کا قبضہ تھا۔ اس کے بعد انگریز میں مسلمانوں کے دور میں خاموش ہندو اکثریت کو اُبھارا، انھیں لالچ دی، کاروباری شراکت داری کی آفر کی اور دہلی پر قبضہ کرنے کا مشورہ دیا اور انھیں انگریزوں کے منصوبوں میں مسلمانوں کے خلاف حمایت کے بدلے سہانے مستقبل اور ترقی کے باغ دکھائے۔

- جنوبی ہند سے مرہٹہ قوت منظّم ہو کر دہلی پر قبضہ کا خواب سچا کرنے روانہ ہوئے راستے میں کئی جگہ مزاحمت ہوئی مگر اٹھارھویں صدی میں مغل حکومت کمزور پڑ گئی تھی حکمران نااہل تھے اور انتظامی صلاحیتوں سے بھی عاری تھے۔ لہٰذا خطرہ پیدا ہوا کہ اگر ہندو دہلی پہنچ گیا تو اس کا مقابلہ کرنے کی قوت مغلوں میں نہیں ہے۔ انگریز کی مدد اور تائید ہندو کو حاصل ہوگی۔ اس وقت دہلی میں ایک مرد درویش اور بوریا نشین عالم نے افغانستان (قندھار) کے حاکم کو خط لکھا کہ ہند

میں مسلم اقتدار خطرے میں ہے اُمت مسلمہ پر بڑا کڑا وقت ہے آپ فوج کے ساتھ آ کر دین مصطفویﷺ کی حفاظت کرو اور اُمت مسلمہ کی مدد کرو۔ لاہور ملتان تک افغانستان کے حکمرانوں کا جزوی راج تھا۔ احمد شاہ ابدالی ایک لشکر کے ساتھ درّہٗ خیبر کے راستے آیا اور اپنے ساتھ جرمن ساخت کی توپیں لایا۔ دریائے سندھ (اٹک کے مقام پر) پار کیا اور دہلی کے شمال میں پانی پت کے میدان میں ہندو مرہٹہ قوت سے مقابلہ ہوا۔ اس وقت احمد شاہ ابدالی کے پاس ایک لاکھ فوج تھی، مرہٹہ قوت تین لاکھ تھے مگر اللہ تعالیٰ کی نصرت سے احمد شاہ ابدالی فتح یاب ہوا اُمت مسلمہ پر بُرا وقت اور تباہی وقتی طور پر ٹل گئی۔ ایک لاکھ مرہٹہ فوجی مارے گئے اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ احمد شاہ ابدالی کے اپنے ملک قندھار میں کسی نادیدہ قوت نے بغاوت کرادی اور یوں احمد شاہ ابدالی کو جلدی ملک واپس لوٹنا پڑا ورنہ مرہٹہ قوت کو شکست فاش کے بعد MOPPING UP OFERATION کر کے صفایا کیا جاتا تو دشمن کی کمر ٹوٹ جاتی۔

- افغانستان سے یوں ایک حکمران کے دہلی پر حملہ کرنے کے عمل سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اعلیٰ دماغوں کے لیے خطرہ کی گھنٹی بج گئی۔ لہٰذا انگریز اور ہندو نے مل کر پنجاب گجرات کی ایک فیملی کے فرد سردار رنجیت سنگھ کی پیٹھ پر تھپکی دی اور پنجاب، کشمیر، پشاور اور کابل تک اقتدار اسے دلوادیا۔ افغان مسلمانوں کے خلاف مسلمانوں جیسی شکل و شباہت والے سکھ مذہب کے لوگوں کو انگریزی چال نے صف آرا کردیا۔
- ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجروں اور اعلیٰ دماغوں نے سونے کی چڑیا مسلم انڈیا پر قبضہ کرنے کے خواب میں حقیقت کا رنگ دینے اور اپنے توسیع پسندانہ عزائم اور صہیونی مقصد کے تحت بنگال کے قریبی ریاست میسور پر حملہ کردیا جہاں پہلے سلطان حیدر علی حکمران تھا اس نے انگریز اور انگریزوں کی چالوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر مقامی ہندو آبادی اور بعض مقامی مسلمان رہنماؤں نے در پردہ انگریز سے تعلقات پیدا کر لیے اور غداری کا دم بھرلیا۔ حیدر علی کے بعد اس کا بیٹا سلطان فتح علی ٹیپو حکمران بنا اس نے انگریزوں کو پے بہ پے شکستوں سے دوچار کیا مگر بعض مسلمان اور ہندو اہل کاروں کی غداری کے باعث 31 مئی 1799ء سلطان ٹیپو شہید ہوگئے اور ریاست میسور پر بھی انگریز کا قبضہ ہوگیا۔

مسلمانوں کی تاریخ میں ٹیپو سلطان کو آخری چٹان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہل کاروں کو دہلی تک پہنچنے کے لیے راستے میں کوئی قابل ذکر مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، سب نے انگریزی اقتدار سے مفاہمت کر لی۔ 1803ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج دہلی پہنچ گئی۔ اس نے مغل حکمران کو ہٹا کر خود اقتدار پر قبضہ نہیں کیا بلکہ بظاہر مغلیہ خاندان کی حکومت کو برقرار رکھا اور یہ طے پایا کہ مغل حکمران کے ساتھ ایک برطانوی اہلکار ایسٹ انڈیا کمپنی کا فوجی نمائندہ بیٹھے گا اور بادشاہ سلامت اس کے مشورے سے حکومتی فیصلے کریں گے۔ یوں عوامی سطح پر مغل حکومت کی برطرفی کی صورت میں جو ردِّعمل مسلمانوں کا ہونا تھا وہ نہیں ہوا بلکہ اس تبدیلی کے اثرات عوامی سطح پر پہنچنے میں کئی سال لگ گئے۔

- اس دوران ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہل کاروں (جو سارے ملک میں گھومتے اور دندناتے تھے اور ہندو اور دیگر غیر مسلم اقوام ان کے مقامی معاون تھے) نے مختلف علاقوں میں مقامی لوگوں اور راجوں مہاراجوں کو مغلیہ سلطنت کے خلاف بغاوت پر اُبھارا اور نیم خود مختار حکومتوں کے قیام کی راہ ہموار ہو گئی۔ سندھ میں تالپور خاندان، بہاولپور ریاست میں عباسی خاندان اور اسی طرح کی کوئی 625 ریاستیں تھیں جو 1947ء میں آزاد ہوئی تھیں۔

ان مقامی ریاستوں کے وسائل کم تھے لہٰذا انگریز کو ان سے لڑنے اور شکست دینے میں کوئی زیادہ تردّد نہیں کرنا پڑا، دوسری طرف مغل حکومت بھی ان کی مدد نہیں کرتی تھی۔

- 1803ء کی حکومتی سطح پر اقتدار کی تبدیلی پر ہندو قوم کا کوئی ردِّعمل نہیں تھا کہ وہ پہلے مسلمانوں کے ماتحت تھے اب انگریز کے ماتحت ہو گئے، ان کے لیے معاملہ صرف حکمرانوں کی تبدیلی کا تھا۔ ہندو اور دیگر غیر مسلم اقوام نے جلد ہی مغلیہ حکمرانوں سے آنکھیں پھیر لیں۔ مزید برآں انگریز نے غیر مسلم اقوام کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت میں ملک گیر سطح پر پھیلاؤ کے لیے استعمال کیا اور ان کے ساتھ شراکت داری کر لی۔

1803ء کے واقعہ کے بعد پہلا ردِّعمل دہلی میں آبادشاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کی طرف سے آیا کہ چونکہ اب مسلم حکومت نہیں رہی اور غیر مسلم حکمران بن گئے ہیں لہٰذا اسلامی ریاست کو RESTORE کرنا دینی فریضہ ہے جس کے لیے جہاد کی ضرورت ہے۔ چونکہ کافروں

کی حکومت میں جمعہ بھی فرض نہیں ہوتا لہٰذا وقتی طور پر جمعہ بھی موقوف ہوا جس سے عوامی سطح پر ہیجان برپا ہوا مگر مسلمان منظّم نہیں تھے لہٰذا کوئی بڑا مزاحمتی رویہ سامنے نہیں آیا۔ انگریز نے مذہبی معاملات میں سیکولر پالیسی اپنائی اور نماز، جماعت، جمعہ کی ادائیگی میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی۔ لہٰذا جو ردّعمل ہوا وہ بھی عوامی سطح پر جلد ٹھنڈا پڑ گیا۔ مگر مرکزی سطح پر شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے ہی ایک جہادی قوت اُٹھی اور اگلے 30 سال اس نے جنوبی ایشیا میں ہیجان انگیز کردار ادا کیا۔ ہماری مراد تحریک شہیدین سے ہے جس کے مخلص رہنما آزادی کے جذبے سے سرشار تھے یعنی سیّد احمد بریلوی شہید رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ جو 1831ء میں بالاکوٹ کے مقام پر جہاد کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرما گئے۔ ؏ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اس تحریک کے اثرات آج بھی کشمیر، شمالی پنجاب، (موجودہ) صوبہ کے پی کے اور افغانستان میں آنکھوں سے دیکھے جاسکتے ہیں۔

- تحریک شہیدین کے زعماء کی شہادت کے بعد مسلمانوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی نے منحوس صہیونی اقتدار سے جان چھڑانے کے لیے 1857ء میں کوشش کی جسے مسلمان جنگ آزادی کہتے ہیں اور انگریز اور اس کے چہیتے 'بغاوت' کا نام دیتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ جنوبی ایشیا میں آباد دیگر مذاہب کے لوگوں میں انگریز کے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا بلکہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عالمی تجارت میں FIT ہو گئے تھے اور خوشحال ہو گئے تھے جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہل کاروں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی لہٰذا ایک طرف مسلمان شکست خوردہ تھے دوسری طرف انگریز بہادر نے 1803ء کے بعد جنوبی ایشیا میں دہلی سے کنٹرول ہونے والے علاقوں میں ایک تو انگریزی کو سرکاری زبان قرار دے دیا (جبکہ پہلے فارسی زبان سرکاری زبان تھی) مسلمان انگریز سے نفرت کرتے تھے لہٰذا انگریزی زبان سیکھنا ان کو گوارا نہ تھا اور انگریزی علوم سیکھنا بھی ان کے نزدیک دینی اسلامی علوم کی معدومیّت اور گمنامی کا باعث بنیں گے لہٰذا مسلمان انگریزی علوم سے بھی دور رہنے کو ترجیح دے رہے تھے۔ اس لیے کہ اس وقت تک مسلمان عوام کی باگ ڈور علماء کے پاس تھی۔

بنگال پر قبضے کے بعد انگریز نے مقامی کپڑے کی صنعت جو مسلمانوں کے پاس تھی اس

کو تباہ کر دیا تاکہ مسلمان معاشی طور پر بے حال ہو جائیں اور ثانیاً برطانوی کارخانوں میں بنا ہوا کپڑا عوام میں پذیرائی حاصل کرے، اس کی کھپت بڑھے اور برطانیہ کے کارخانے چلتے رہیں۔ مسلمان انگریزی زبان نہیں سیکھ رہے تھے لہٰذا مسلمانوں پر سرکاری ملازمت کے دروازے بھی بند ہو گئے۔ مسلمان قرآن کے خلاف فیصلے کو کفر سمجھتے ہیں لہٰذا انگریزی زبان اور انگریزی قانون سے لاتعلقی کے باعث راسخ العقیدہ مسلمانوں پر عدلیہ کے دروازے بھی بند ہو گئے۔ انگریز کے نزدیک مسلمان شکست خوردہ تھے ان سے حکومت چھینی گئی تھی لہٰذا انگریز مسلمانوں پر اعتماد نہیں کرتے تھے کہ کہیں بغاوت نہ کر دیں لہٰذا مسلمان عوام پر انگریزی فوج میں ملازمت کے دروازے بھی بند ہو گئے۔ جبکہ انگریز خود بھی مسلمانوں کے علاوہ دیگر اقوام کو اپنے ساتھ ملا رہا تھا کہ اس کا اقتدار مستحکم رہے اور دوسری اقوام انگریز کا ساتھ دے کر سرکاری دربار تک رسائی حاصل کر کے خوشحال ہو رہے تھے۔

- انگریز نے اپنا نظامِ تعلیم (سکول، کالج، یونیورسٹی وغیرہ) 1935ء میں فورٹ سندین کالج کے آغاز (1819ء) کے بعد جاری کیا اور سکول کالج کھولے گئے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے لوگ انگلستان جانے لگے۔ مزید براں انگریز نے سرکاری دفتروں میں عیسائیت کی برملا اور علی الاعلان تبلیغ و اشاعت شروع کر دی جس سے مسلمانوں میں بہت ہیجان پیدا ہو گیا اور مسلمانوں میں بے چینی بڑھنے لگی۔ ان حالات کی بنا پر 1857ء میں مسلمانوں میں سینہ بہ سینہ انگریز سے گلوخلاصی کے لیے ایک کوشش کرنے کا جذبہ بیدار ہوا جس نے جنگ آزادی کی شکل اختیار کر لی۔ یہ جنگ دہلی دارالحکومت اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں لڑی گئی۔ اس میں ہندو اور دیگر اقوام برائے نام تھیں بلکہ یہ اقوام مسلمانوں کو انگریز کے خلاف اُبھارنے میں پیش پیش تھے کہ انگریز اور مسلمان آپس میں ٹکرا جائیں اور انگریز ردِّ عمل میں مسلمانوں کا قتل عام کر دے تاکہ مسلمانوں کی رہی سہی قوت بھی ختم ہو جائے اور جس طرح اندلس میں مسلم اقتدار کے خاتمے کے بعد مسلمان ختم ہو گئے تھے برطانوی ہند میں بھی وہ تاریخ دہرائی جائے۔

- یہ جنگ آزادی مسلمانوں نے جان پر کھیل کر لڑی اور مغل حکمران بھی اس جنگ میں مسلمان عوام کے ساتھ تھے۔ اس جنگ میں شدت دیکھ کر انگریز کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں اس کا

اقتدار ختم نہ ہو جائے گا لہٰذا اس نے یونانی اور رومن ظلم کے نمونے گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ سجا دیے اور دہشت بٹھا دی۔ ہزارہا مسلمانوں کو سولی یا تختہ دار پر لٹکا دیا گیا، حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ تمام بالغ (18 سال سے اوپر عمر کے لوگ جو بھی قابل جہادِ آزادی تھے) سب پھانسی چڑھا دیے گئے تا کہ یہ مستقل خطرہ ختم ہو جائے۔ اسی لیے مسلمانوں میں 1860ء کے بعد 1900ء تک کوئی قابل ذکر قیادت ہی نہیں۔

- اس دوران تحریک شہیدین اور دیگر سرگرم باقیاتِ جہادِ آزادی نے دوبارہ اکٹھے ہو کر کام کرنا شروع کیا مگر اب میدان زیادہ تر علمی، تعلیمی، تدریسی اور مناظرانہ تھا۔ 1860ء سے ہی پورا جنوبی ایشیا ایسٹ انڈیا کمپنی سے تاجِ برطانیہ کو تحفتاً مل گیا اور ملکہ برطانیہ نے یہاں قانون کی حکمرانی کا آغاز کر دیا۔ گویا جب خود رومن ٹارچر کے نمونے دکھا کر اور بے رحمانہ رویہ اختیار کر کے مسلمانوں کو خاموش کر دیا تو اب امن اور قانون کی حکمرانی یاد آئی کہ ردّعمل میں کوئی ہمارے خلاف جہادی سرگرمی نہ پنپ سکے۔

مسلمانوں نے تعلیمی میدان کو خالی نہ چھوڑا۔ ایک طرف سرسیّد احمد خان تھے جو مسلمانوں کو جدید مغربی علوم سیکھنے پر آمادہ کرتے تھے اور انگریزی حکومت سے تعاون پر آمادہ کرتے تھے۔ انھوں نے جدید تعلیم کے مسلم ادارے بنائے کہ مسلمان انگریزوں کے بنائے ہوئے اداروں میں نہیں پڑھتے تو مسلمانوں کے اپنے بنائے ہوئے اداروں میں تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ انھوں نے 1867ء میں علی گڑھ میں پہلے پرائمری سکول بنایا جو ہائی سکول اور کالج سے اُبھر کر 1920ء میں یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر گیا۔ اس کے برعکس علی گڑھ سے 60 کلو میٹر دور دیوبند کی بستی میں علماء نے دینی مدرسہ قائم کیا جو ایک استاد اور ایک شاگرد سے شروع ہوا اور ترقی کر کے اگلے 40 سالوں میں جامعہ الازہر (مصر) کے پائے کا عالمی سطح کا مدرسہ دارالعلوم بن گیا مگر دونوں کی سوچ میں مشرق و مغرب کا فرق تھا۔

دیوبند کے علاوہ اسلامی علوم کے دیگر مراکز بریلی، فرنگی محل، لکھنؤ، اجمیر شریف، بدایوں وغیرہ میں دینی مدارس کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ مدرسہ دیوبند کے پہلا شاگرد محمود حسن تھے جو بعد میں وہیں استاذ مقرر ہوئے پھر شیخ الحدیث بنے اور پھر دیوبند مدرسہ کے سربراہ بنے۔ ان کے

شاگردوں کی فہرست دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُن سے بڑا آدمی دیوبند نے پیدا نہیں کیا۔

سیّد احمد بریلوی شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ''تحریک مجاہدین'' کے جو وارث تھے وہ انگریزی حکومت سے کوئی تعلق قائم کرنا نہیں چاہتے تھے اور مغربی تہذیب وافکار سے مفاہمت کے خلاف تھے۔ ان کے نزدیک مغربی تہذیب وافکار سے مفاہمت کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم اپنے عقائد، افکار، نظریات وتمدن، علوم وفنون سے بیگانہ ہوجائیں گے۔ اگرچہ علماء میں جدید ریاست کو چلانے کی صلاحیت نہیں تھی اور وہ دورِ جدید کے تقاضوں سے بھی ایک حد تک بے خبر تھے لیکن ان میں اپنی اسلامی حیثیت پر فخر کا احساس پایا جاتا تھا۔ لہٰذا انھوں نے اپنے مذہبی سرمائے کو محفوظ کرنے کے لیے 1867ء میں دارالعلوم 'دیوبند' قائم کیا۔ جہاں علی گڑھ یونیورسٹی برطانوی ہند کی حکومت سے مالی امداد حاصل کرتی تھی، دارالعلوم دیوبند نے حکومت سے کسی قسم کی امداد لینے سے انکار کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی توانائیاں منتشر ہوگئیں اور مجموعی طور پر ہندوستان کی مسلمان قوم کی قوت وطاقت کو ضعف پہنچا اور دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مذہبی طبقے اور قومی قیادت میں بُعد پیدا ہوگیا جو بعد میں مسلسل بڑھتا گیا۔

- 1900ء کے بعد مسلم قیادت سامنے آئی اور جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں میں مخلص اور دیندار لوگوں کی ایک بڑی تعداد جو آزادی کی تڑپ رکھتی تھی سامنے آ گئی۔ 1914ء میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی اور سیاسی سرگرمیوں میں ٹھہراؤ آ گیا۔ برطانوی استعمار کے پیچھے جو صہیونی ذہن کام کر رہا تھا وہ ابلیسی ذہن تھا اور صرف جنوبی ایشیا میں نہیں بلکہ عالمی سطح پر سرگرم تھا۔ عالمی سرگرمیوں سے آگاہی کے لیے اگرچہ ریڈیو، اخبارات، جرائد اور کتابیں موجود تھیں مگر اس سے استفادے کی صورتیں محدود تھیں۔ ثانیاً برطانوی ہند میں مغربی نظامِ تعلیم کی بدولت انگریزی اہلِ علم کی زبان تھی، اہم معلومات انگریزی میں آتی تھیں، اُردو اور دیگر مقامی زبانوں میں یہ معلومات مہینوں اور سالوں پر سامنے آتی تھیں۔ اس میں یہ رُخ بھی تھا کہ مغربی میڈیا صہیونی اجارہ داروں کی مرضی سے ہی خبریں اور اخباری مواد جاری کرتا تھا تاکہ اہم معلومات عوام تک نہ پہنچیں اور کسی عوامی ردِّعمل کا کھٹکا نہ رہے۔

- انیسویں صدی آنے تک عالمی صہیونی استعمار کا مسلمانوں کے چند علاقوں اور

سلطنت عثمانیہ کے ایشیائی حصہ کے علاوہ تمام روئے ارضی پر قبضہ مستحکم ہو چکا تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ (ترکی) نے جرمنوں کا ساتھ دیا، جب جرمنوں کو شکست ہوئی تو ترکی بھی زیرِعتاب آ گیا۔ 1918ء کے بعد عالمی نقشہ سامنے آیا تو مسلم آبادی کا کوئی ملک روئے ارضی پر آزاد نہ تھا بلکہ عالمی صہیونی استعمار کا غاصبانہ اور اسلام دشمن قبضہ تھا۔ ترکی کی چھوٹی سی سلطنت اتاترک کی غداری کے باعث آزاد رہ گئی۔ مشرق وسطیٰ، عرب، شمالی افریقہ وغیرہ کے سارے مقبوضات یورپی اقوام نے آپس میں بندر بانٹ کر لی اور اپنی مرضی کے زرخرید غلام ابن غلام حکمران سامنے لے آئے۔ عراق، اُردن، عرب، مصر، لیبیا، مراکش، الجزائر، شام، لبنان، فلسطین سمیت سب ملک انگریز کے احسان مند تھے اور اسی کے غلام۔ بظاہر آزاد تھے یہ ممالک انگریزوں کے جاسوسی نظام کے ذریعے لسانی بنیادوں پر ترکوں اور عربوں کے درمیان زبان، نسل اور وسائل کی بنیاد پر بنائے گئے تھے۔ چنانچہ المملکۃ الجمہوریہ المصریہ، المملکۃ السعودیہ العربیہ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ اُردن، شام، لبنان ایران وغیرہ میں برطانوی استعمار اور اس کے نمائندوں کا قبضہ ہوگیا۔ حتیٰ کہ 1924ء میں ترکی میں مسلمانوں کا اجتماعی نظام حکومت نظامِ خلافت کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔ رومن لا اور جمہوری نظام نافذ کر دی گیا۔ مسجد بند، نماز واذان پر پابندی لگادی گئی وغیرہ وغیرہ۔

- پہلی جنگ عظیم کا 'ڈرامہ' رچایا اس لیے گیا تھا کہ مشرق وسطی وغیرہ سلطنت عثمانیہ سے چھین لیا جائے۔ چنانچہ جنگ کے دوران ہی 1917ء میں برطانوی وزیرِخارجہ بالفور کے ایک حکم سے یہودوں کو فلسطین میں آباد ہونے اور زمینیں خریدنے کی اجازت مل گئی۔ یہ فلسطین اور یہودیوں کا قبضہ بڑا گہرا ہے مگر جدید تعلیمی نظام پر لعنت ہو کہ وہ صرف ان علوم تک رسائی دیتا ہے جس کی عالمی صہیونی استعمار اپنے مقاصد کے تحت اجازت دیتا ہے باقی معلومات تک رسائی جان جوکھوں کا کام ہے۔ ریسرچ اور تحقیق اور ڈاکٹریٹ کے مقالات بھی صرف انھی عنوانات اور تفاصیل کے ساتھ سامنے آ سکتے ہیں جو نظام چاہیے اس کے مخالف آپ ایک سطر نہیں لکھ سکتے۔ فلسطین اور یہود کا رشتہ کیا ہے وہ قرآن بتاتا ہے یا اسلامی تاریخ۔

آیئے ذرا اس پر نظر ڈال لیتے ہیں:۔

6 سرزمین فلسطین (بیت المقدس کی تولیت) اور بنی اسرائیل (یہود)

سرزمین فلسطین روئے ارضی پر مکہ میں مسجد حرام کے بعد بیت المقدس کی وجہ سے متبرک اور اہم ترین علاقہ ہے اور آسمانی مذاہب کی تاریخ میں حددرجہ اہمیت کا حامل ہے۔ یہ پیغمبروں علیہم السلام کی سرزمین ہے اور ہزاروں پیغمبر یہاں دفن ہیں۔ معلوم انسانی تاریخ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ آج سے 4000 سال قبل (یا 2000 ق م) کا ہے۔ ان کے دو بیٹے تھے: ایک حضرت اسماعیل علیہ السلام، جن کو انھوں نے مکے میں آباد کیا اور کعبہ تعمیر فرمایا، قربانی کا واقعہ ہوا حضرت ابراہیم کے دوسرے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام تھے جن کو آپ نے فلسطین میں آباد کیا تھا۔ اِن کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں جن کا لقب اسرائیل تھا اور اِن کے بارہ بیٹے تھے جن میں 10 سگے بھائی ایک ماں سے تھے اور دو سگے بھائی حضرت یوسف اور بنیامین دوسری ماں سے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام پیغمبر تھے اور مصر کے بادشاہ بھی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہی بنی اسرائیل کہلاتی ہے۔ بنی اسرائیل کی اہمیت گزشتہ 38 صدیوں سے ہے۔ قرآن مجید کے بیان کے مطابق بنی اسرائیل مجموعی طور پر بگڑ گئے تھے اور ان میں قلیل تعداد میں اچھے ہیں باقی فاسق۔ قرآن مجید میں پہلے پارے میں ہی 16 میں سے 10 رکوع بنی اسرائیل کے تذکرہ پر مشتمل ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے ان کی شرارتوں کی وجہ سے 'مغضوب علیہم' بننے کا ذکر کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماننے والی اس قوم (یہود ونصاریٰ) نے 1350ق م سے 610ء تک (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر 610ء میں وحی نازل ہوئی) تقریباً دوہزار سال دنیا میں اودھم مچایا ہے۔ پندرھویں پارے کے پہلے رکوع میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو دومرتبہ زمانے میں عروج عطا فرمایا اور عروج کے زمانے میں نافرمانیوں اور من مانیوں کی وجہ سے دو ہی دفعہ عذاب اور زوال سے دوچار ہوئے۔ مگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ آنے تک یہ بگڑے ہی رہے اور توبہ کرنے کا سوچا ہی نہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے پر (قرآن مجید کے بیان کے مطابق) اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع دے دیا اور سزائے موت کے قیدی کو MERCY APPEAL کا موقع دینے کی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان

لانے کا کہا اور فرمایا کہ اگر تم ایسا کرلو تو اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے گا اور درگزر فرمائے گا۔ مگر بنی اسرائیل کا بگڑا ہو طبقہ اس حد تک بگڑ گیا تھا جیسا چکنا گھڑا پر پانی ڈالیں تو پانی اس میں جذب نہیں ہوتا بلکہ پھیل کر چلا جاتا ہے اسی طرح بنی اسرائیل پر کوئی بڑی سے بڑی نصیحت کہ توبہ کرلیں، اثر نہیں کرسکتی اور یہ اپنی شرارتوں سے باز نہیں آسکتے حالانکہ حضرت محمد ﷺ کو یہ لوگ آسمانی کتابوں (تورات وغیرہ) کی پیش گوئیوں کی روشنی میں اس طرح پہچانتے تھے جیسے انسان رات کے اندھیرے میں بھی اپنے بیٹوں کو پہچان لیتا ہے۔ مگر بدقسمتی کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائے۔ بلکہ توبہ کے عاجزی والے رویے کے برخلاف آپ ﷺ کے خلاف مختلف قسم کی سازشوں میں ملوث رہے۔ جنگ بدر کے موقع پر یہودی قبیلہ بنی قینقاع نے، جنگ اُحد کے موقع پر یہودی قبیلہ بنی نضیر نے اور جنگ خندق کے موقع پر تیسرے قبیلے بنی قریظہ نے اسلام دشمن طاقتوں سے دوستی کی انہیں اندرونی راز دیے اور مسلمانوں کے خلاف LOGISTIC SUPPORT کا وعدہ کیا مگر نہ صرف بُری طرح ناکام رہے بلکہ یکے بعد دیگرے مدینے سے جلاوطن ہو کر خیبر میں آباد ہوئے۔ وہاں بھی شرارتوں سے باز نہیں آئے تو صلح حدیبیہ کے بعد آپ ﷺ نے خیبر پر لشکر کشی فرمائی اور ایک سخت جنگ کے بعد وہاں سے جلاوطن کر دیے گئے۔ سیّدنا محمد ﷺ نے وصیت فرمائی تھی کہ مسلمانوں کے نظامِ حکومت کو استحکام مل جائے تو یہود کو جزیرۃ العرب سے بھی جلاوطن کر دیا جائے۔ اس وصیت پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ مسعود میں عمل درآمد ہوا۔ قرآن مجید میں ہے کہ اب سیّدنا محمد ﷺ کی تشریف آوری پر تمہیں ایک اضافی موقع توبہ کا دیا جارہا ہے مگر اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا اگر تم نے توبہ نہ کی تو ہم بھی تمہارے ساتھ نرمی کرنے کے وعدے سے واپس آجائیں گے۔

تاریخ گواہ ہے کہ یہود نے اس قرآنی پیغام کو مسلمانوں کی کمزوری سمجھا اور اسلام، پیغمبر اسلام اور خلفائے راشدین کے خلاف سازشوں میں منہمک رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ہنگامے اور ان کی مظلومانہ شہادت کا واقعہ اس کے ثبوت ہیں۔ 36ھ سے 41ھ تک مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی اور جہاد کا رُک جانا ــــــ بھی بنی اسرائیل ہی کی ہولناک سازشوں ہی کی کڑی ہیں۔

دورِ بنو عباس میں ذرا استحکام آیا علم، تعلّم، وتعلیم قرآن اور مسلمان اپنی تہذیب وثقافت

کو نکھارنے اور محفوظ کرنے میں منہمک ہوئے تو یہود نے اپنے ہی پروردہ فلاسفہ کے از کار رفتہ علوم (یونانی فلاسفہ کے علوم ___ ارسطو، افلاطون وغیرہ) کی کتابیں یورپ سے لاکر مسلمانوں میں پھیلا دیں اور مسلمان علماء کو لایعنی فلسفیانہ بحثوں اور موشگافیوں میں اُلجھا دیا کہ آج تک پوری طرح اس وار سے سنبھل نہیں سکے۔

● بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ فرعون کی غلامی سے نکلے، سمندر عبور کیا، صحرائے تیہ میں من وسلویٰ، بادلوں کا سایہ اور 12 چشموں کے معجزات سے متمتع ہونے کے باوجود جب جہاد کا موقع آیا تو کورا جواب دے دیا کہ ''اے موسیٰ (علیہ السلام)! آپ جاؤ اور آپ کا ربّ (ہم سے جہاد نہیں ہوتا) ہم تو یہاں بیٹھے ہیں''، فتح ہوجائے تو ہمیں بلا لینا۔

اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو جہاد نہ کرنے کی بنا پر راندۂ درگاہ کر دیا۔ تین صدیوں بعد حضرت طالوت اور حضرت داؤد علیہ السلام کے دور میں جہاد ہوا، فلسطین فتح ہوا۔ حضرت داؤد پیغمبر تھے، بادشاہ بنے ان کا دورِ حکومت 40 سال ہے پھر حضرت سلیمان علیہ السلام (ان کے بیٹے) حکمران بنے وہ بھی پیغمبر تھے، وہ بھی چالیس سال حکمران رہے۔ 980 ق م سے 900 ق م تک یہ بنی اسرائیل کا سنہری دور ہے جیسے ہم مسلمانوں کا خلافت راشدہ کا دورِ مسعود ہے اور ہمیں اس پر فخر ہے۔ مگر یہود، نہ معلوم کیا وجہ ہے، نہ خود حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کی تعلیمات اور اصولِ حکمرانی پر عمل کرتے ہیں نہ دوسروں کو کہتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہود دو رُخا پن چھوڑ دیں اور چاہیں کہ دنیا میں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور کا سا قانون آجائے تو IMF، WB اور UNO کے ذریعے تھوڑے عرصے میں ہر ملک شرائط ماننے پر مجبور ہوجائے گا کہ قرضے اور امداد اس طرزِ حکومت کے قیام سے مشروط کر دی جائے۔ یہ صورت حال آجائے تو مسلمانوں کے یہودیوں سے اختلاف بہت کم رہ جائیں گے ___ مگر بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

● حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں بنی اسرائیل نے جادو سیکھا اور دوسرے سفلی علوم (جو دنیا میں آج بھی نقشِ سلیمانی کے نام سے ملتے ہیں اور غلط طور پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں) جنھیں دنیا OCCULT SCIENCE کہتی ہے سیکھے۔ پھر شرارتوں کی وجہ سے زوال آیا تو عراق کے نمرود بادشاہ کے ہاں ڈیڑھ صدی قید اور غلام رہے۔

● اس دور میں بنی اسرائیل ایک اور مکروہ گندا کام کرتے رہے کہ قرآن مجید اس کا بار بار تذکرہ کرتا ہے۔ یہ کام وقتی اور جذباتی طور پر نہیں (SPONTENEOUSLY) بلکہ بالارادہ اور مستقلاً بارہ صدیاں (600 ق م سے 600ء) تک جو انبیاء کرام علیہم السلام آئے ان کو قتل کرتے رہے اور سینکڑوں پیغمبر ہیں، جو آئے ہی بنی اسرائیل کی رہنمائی کے لیے تھے، اور وہ ان کو قتل کر دیتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ (القرآن 71:05)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے طور پر تو تختہ دار تک پہنچا دیا تھا مگر وہ رسول تھے اللہ نے انھیں بچا لیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے خلاف اسرائیلی رویوں کی بنا پر ان کا عذاب آ گیا۔ یورپ سے ٹائٹس (TITUS) رومی نامی حکمران فاتح 0070ء میں یروشلم پر حملہ آور ہوا۔ لاکھوں یہودیوں کو قتل کر دیا اور باقیوں کو یروشلم چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ یہود یروشلم فلسطین سے اپنے گناہوں اور کرتوتوں کی وجہ سے نکلے تھے۔ بیت المقدس (فلسطین) پیغمبروں کی سرزمین ہے اور یہ پیغمبروں اور ان کے ماننے والوں کے لیے مستقل 'مستحضر' ہے جبکہ اس مقام سے گر چکے تھے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انھیں ہٹا کر (معزول کر کے) یہ علاقہ حضرت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کو دے دیا۔ چنانچہ 70ء سے 636ء تک یہ مقدس علاقہ عیسائیوں کے پاس رہا۔ یہ ان کی سعادت تھی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کے بعد یہ علاقہ اب مسلمانوں کا تھا، یہ علاقہ عام دنیاوی جائیداد کی طرح کی وراثت نہیں تھی بلکہ انبیاء کی وراثت تھی اور صرف پیغمبر کو دل و جان سے (IN LETTER & SPIRIT) ماننے پر اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں 636ء (16ھ) میں مسلمانوں نے خاص حالات میں بغیر جنگ کے فتح کر لیا تھا۔

● حضرت عمر علیہ السلام نے ٹائٹس رومی (TITUS) کے فیصلے کے خلاف عیسائیوں اور یہودیوں کو ریلیف (RELIEF) دیا اور عیسائی تو وہیں آباد رہے مگر شرارتوں سے باز نہیں آئے۔ جبکہ یہود (بنی اسرائیل) کو وہاں آباد ہونے کی تو اجازت نہیں ملی البتہ ان کا مقدس مقام ہونے کے ناطے انھیں عارضی طور پر داخلے اور مقامات مقدسہ کو دیکھنے کے لیے VISIT VISA کی سہولت دے دی (آج کل کے عمرے ویزہ کی طرح) جس سے یہود صدیوں فائدہ اٹھاتے رہے۔ تا آنکہ 1917ء میں انھیں برطانوی حکومت نے فلسطین میں آباد ہونے اور انھیں جائیدادیں

خریدنے کی اجازت دے دی جس سے دنیا کی امیر ترین قوم یہود نے منہ مانگے داموں ہر مارکیٹیں، پلازے، شاپنگ مالز خرید لیے۔ زرعی رقبے خرید لیے۔ اور دنیا پھر سے اپنے ہم مذہبوں کو بلا کر آباد کرلیا اور دوسری جنگ عظیم برپا کر کے ایسے حالات پیدا کیے کہ جنگ کے فوراً بعد مئی 1948ء میں اسرائیل ایک باقاعدہ ملک بن گیا اور دنیا کے نقشے میں اضافہ کر دیا۔

- 1917ء میں فلسطین کی فتح کے بعد برطانوی اتحادی فوجوں کے ایک جنرل گھوڑے پر سلطان صلاح الدین ایوبی کے مزار پر گیا (جنھوں نے 1190ء میں صلیبیوں سے 100 سال بعد بیت المقدس مسلمانوں کو واپس دلایا تھا) اور ان کی قبر پر گھوڑا چڑھا کر کہا تھا:

LOOK SALADIN WE HAVE COME.

زندہ قومیں اپنی تاریخ یاد رکھتی ہیں افسوس بُرا ہو موجودہ مغربی صہیونی عالمی استعمار کے جدید نظام تعلیم کا جس نے تعلیم کے ایسے حصے بخرے کر دیے ہیں کہ کم از کم مسلمان تاریخ نہ پڑھیں اور انھیں یہود کی تاریخ اور اپنی تاریخ کی کوئی ہوا نہ لگے۔ آج مسلمانوں میں تاریخ کا شعبہ ویران، تاریخ نہ سکولوں، کالجوں، یورنیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہے (آج تو IT اور BUSSINESS MANAGMENT کا دور ہے) اور نہ مدارس میں پڑھائی جاتی ہے بلکہ یہودیوں کا بچہ بچہ اپنی تاریخ سے واقف ہے اور زبانی یاد ہے۔ ON FINGER TIPS ہے۔

- اپنی تاریخ سے ناواقف ہے تو صرف مسلمان قوم ہے۔ جہاں 9th اور 10th کلاس میں ڈاکٹر اور انجینئر بننے کا شوق ہوتا ہے پھر ایف ایس سی ہے۔ ایف ایس سی پاس طلبا بھی وکلاء بننا چاہتے ہیں، LAW پڑھتے ہیں۔ اکنامکس پڑھتے ہیں۔ آج کل MBA بنتے ہیں، IT کے شعبوں میں جاتے ہیں، نوجوان اردو، انگریزی، اسلامیات میں ایم اے کر لیتے ہیں۔ تاریخ کو کون پڑھتا ہے؟ اکثر کالجوں میں تاریخ کا کوئی ڈیپارٹمنٹ ہی نہیں ہوتا، نہ ٹیچر نہ سٹوڈنٹ۔

7 بنی اسرائیل قوم یہود ـــــ تعارف اور مستقبل

بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں اور اپنے دین، دین موسوی اور دین

ابراہیم کو ایک نسلی مذہب سمجھتے ہیں۔ غیر یہودی لوگوں کو عام طور پر تبلیغ نہیں کرتے مگر تاریخ کا کیا کیا جائے یہ بتاتی ہے کہ یہودیعنی بنی اسرائیل کے دین پر اور بھی قومیں ایمان لے آئیں۔لیکن بنی اسرائیل انھیں اسرائیلی تسلیم نہیں کرتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جادوگروں سے آپ کا مقابلہ ہوا۔ جادوگر ہار گئے تو سارے جادوگر فرعون کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے رب پر ایمان لے آئے (القرآن)۔ یہ لوگ بھی غیر اسرائیلی تھے یقیناً پورا علاقہ اور قبیلے ہوں گے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک دفعہ فرعون کے دربار میں گئے تو فرعون غصے میں آ گیا اور کہا اے میرے وزیرو، مشیرو! مجھے اجازت دو کہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دوں، دیکھیں اس کا خدا اس کی کیسے مدد کرتا ہے؟ دربار کی صورتحال بڑی خوفناک تھی، قریب تھا کہ ساری کابینہ پوری کی پوری بیک زبان قتل موسیٰ علیہ السلام کے ناپاک فعل پر فرعون کو خوش کرنے کے لیے YES کردے۔ اس وقت قرآن کے بیان کے مطابق فرعون کی کابینہ میں سے ہی فرعون کا مراعات یافتہ ایک باضمیر انسان کھڑا ہو گیا اور اس نے بھرے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں تقریر کر دی۔ قرآن مجید نے سورۃ مومن میں یہ ساری تقریر نقل کر دی ہے۔ کسی ایک انسان کی اتنی لمبی تقریر قرآن مجید میں نقل نہیں ہوئی۔ اس تقریر سے دربار کا ماحول ہی تبدیل ہو گیا۔ اس نے کہا کہ یہ موسیٰ علیہ السلام تم سے مانگتا کیا ہے کہ تم اچھے کام کرو اللہ کو مانو___ ایسا نہ ہو کہ ہم اس کی نافرمانی کریں اور ہم پر اللہ کا عذاب آ جائے۔ قرآن اس شخص کو رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ کہتا ہے جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا کہ ایسے ہی کسی نازک موقع پر اس کا اظہار کرے گا۔ اس سے فرعون کو گھٹنے ٹیکنے پڑ گئے اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکا۔

یہاں سوال یہ ہے کہ وہ فرعون کی پارٹی کا افریقی حبشی کالے رنگ کا انسان کسی وزیر اور MNA کی طرح پورا علاقہ اور CONSTITUENCY رکھتا ہو گا وہ سارا علاقہ قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ لیکن اس کا نام نہیں لیتے نہ ان کو بنی اسرائیل میں شامل کرتے ہیں۔

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور مبارک میں قرآن مجید کے بیان مطابق ملک یمن (جزیرہ نمائے عرب کا جنوبی اور ساحلی حصہ) کی ایک حکمران عورت ملکہ بلقیس حضرت

سلیمان علیہ السلام پر ایمان لے آئی تھی۔ ملکہ بلقیس اس کا ملک اس کی آبادی سب غیر اسرائیلی تھے اس ملک اور اس کے یہودی آثار آج بھی ہیں اور یہود ان کو ساتھ لے کر چل رہے ہیں قرآن مجید میں 'سبا' کا لفظ آیا ہے اور ملکہ سبا اسی سے بنا ہے (ایک تشریح کے مطابق سبا سے سبائی لفظ بنا اور اسی سے لفظ سبی ہے) یہ حبشی النسل (BLACK) ہیں اومان کے آس پاس بھی انہیں کا علاقہ ہے اور گوادر سے اندر بلوچستان کا ایک حصہ میں بھی اس نسل کے لوگ آباد ہیں ان میں اکثریت صدیوں سے اب اسلام میں داخل ہے مسلمان ہیں۔

- تاریخی طور پر چھٹی صدی ق م اور پانچویں صدی ق م میں بنی اسرائیل بخت نصر کی قید میں رہے اسی دور میں یہ بخت نصر کی حکومت کے مختلف علاقوں میں مقتدر اور آباد رہے (پہلے زمانے میں جیلیں نہیں ہوتی تھیں بلکہ غلامی کا تصور تھا ان سے کھیتوں، کارخانوں، گھروں میں کام لیتے تھے لہٰذا غلامی کے دور میں یہ لوگ مقامی لوگوں (عراق اور ایران اور اس سے آگے) گھل مل کر رہے) اس دور میں ایران کا ایک بادشاہ گزرا ہے اس کا نام ذوالقرنین، قرآن میں آیا ہے، اس نے آذربائیجان سے اوپر شمال کی طرف پہاڑی علاقے میں کسی SETTLED علاقے کے لوگوں کی حفاظت کے لیے ایک دیوار بنائی تھی جو سد ذوالقرنین کہلاتی ہے۔ جس سے شمالی روسی ریاستوں جارجیا اور ماسکو وغیرہ سے غیر متمدن لوگوں کے حملے بند ہو گئے تھے۔ ایک حدیث کے مطابق فتح مکہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے تیزی سے بیدار ہوئے ذرا حیرانی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اطوار سے نمایاں تھی حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے پوچھا تو فرمایا کہ سد ذوالقرنین میں سوراخ ہو گیا ہے یعنی اب ذوالقرنین نے جن اقوام کو متمدن دنیا میں آمد سے روکنے کے لیے دیوار بنائی تھی جس میں لوہا اور تانبا (پگھلا ہوا) استعمال ہوا تھا وہ اب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی ہے اور راستہ کھل گیا ہے۔ اس خواب کی ایک تعبیر یہ بھی ہے (تفصیل راقم کی ''یاجوج ماجوج'' نامی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے) اب غیر متمدن اقوام کا بنی اسرائیل کے ان علاقوں میں آمد و رفت کا سلسلہ دوبارہ 1000 سال بعد شروع ہو گیا ہے اور ان کے آپس میں رابطے ہو گئے ہیں یعنی بنی اسرائیل کے اور ماسکو سے ماوراسائبیریا کے علاقے کے غیر متمدن قبائل کا رابطہ ہوا ہے۔ اس بات کی بنو اُمیہ کے دور میں کچھ معلومات حاصل کرنے کے لیے مہمات بھیجی گئی ہیں مگر تفاصیل نہ مل سکیں۔

کوئی پچاس سال پہلے مغرب میں ایک کتاب چھپی تھی اور عام پڑھی گئی کہ 750ء میں سدذوالقرنین سے شمالی علاقہ کا ایک حکمران تھا، اس کی رعایا میں مسلمان بھی تھے عیسائی اور یہودی بھی مگر وہ بوجوہ یہودی ہوگیا۔ اس بادشاہ کا قبیلہ یہودی ہونے کے بعد (یہودی بارہ بھائیوں کی اولاد سے بارہ قبیلے آرہے تھے) اب بنی اسرائیل کا تیرہواں قبیلہ کہلاتا ہے۔ اس انگریزی کتاب کا نام بھی 13th TRIBE ہے (یہ کتاب اب ملتی ہے مطالعہ کے قابل ہے)۔ تفاصیل یہ ہیں کہ روسی ریاست اور دیگر غیر متمدن سائبیرین اقوام کے بڑوں سے بنی اسرائیل کا ایک معاہدہ ہوا تھا جس کی بنیاد پر وہ بادشاہ بنا اور اس کے ساتھ پورے ایک قبیلے کو 13th TIRBE کہہ کر اسرائیلی قبیلہ بنالیا گیا وہ اسی معاہدے کی بنا پر تھا۔ وہ معاہدہ اس طرح کا تھا کہ اصل یہودی (بنی اسرائیل) تعداد میں کم ہیں تاجر پیشہ ہیں صاحب ثروت ہیں ان کے مختلف منصوبے ہیں جن میں سے اہم اور ضروری منصوبہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل فلسطین واپس آباد ہوں اور اسرائیل نام کا ملک قائم کیا جائے اور پھر اس ملک کی سرحدوں کو وسعت دے کر وسیع تر اسرائیل (GREATER ISRAEL) بنایا جائے اور یہ ان کا مقدس فریضہ ہے۔ اس GREATER ISRAEL کے منصوبے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ماضی میں (1000 ق م سے 750ء تک) جہاں جہاں بنی اسرائیل رہے ہیں وہ سب علاقہ جات اس سلطنت میں شامل کیے جائیں۔

اس منصوبہ کا نقشہ دنیا میں ملتا ہے۔ اس منصوبہ کے تحت مدینہ منورہ، خیبر، عراق، مصر، صحرائے سینا وغیرہ وغیرہ اس وسیع تر اسرائیل کا حصہ ہیں۔

بنی اسرائیل کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام جو قرآن کے بیان کے مطابق فلسطین میں آئے تھے اور حضرت مریم علیہا السلام کے بیٹے تھے اور معجزانہ طور پر کسی بچہ کی پیدائش میں باپ کی طرف سے آنے والے حصہ کو اللہ تعالیٰ نے کلمہ کن سے پورا کر دیا تھا۔ بنی اسرائیل نے مجموعی طور پر ان کا انکار کر دیا اور منصوبہ بنا کر ان کو صلیب دیے جانے (سزائے موت) کے لیے رومی حکمرانوں کے حوالے کر دیا تھا مگر وہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) رسول تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں بچالیا (حالانکہ اسی زمانے میں چند سالوں میں وہ حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام، جو نبی تھے، کو قتل کر چکے تھے اسی جرم کو قرآن مجید میں قتل انبیاء کہا گیا ہے)۔

بنی اسرائیل اپنی کتابوں کی پیش گوئیوں کی بناپر اب بھی مانتے ہیں کہ 'مسیحا' آنے والا ہے جو ان کے مسائل حل کرے گا اور ان کو عروج دلوائے گا وہ اس آنے والے 'مسیحا' پر ایمان لائیں گے غالباً بنی اسرائیل کا یہ 'مسیحا' اصفہان سے ظاہر ہوگا جو مسلمانوں کے نزدیک مسلم شریف کی روایت کے مطابق 'مسیح الدجال' ہوگا اور اصفہان سے ظاہر ہوگا اور اصفہان کے ستر ہزار یہودی سیاہ لباس پہنے اس کا ساتھ دیں گے۔

یاد رہے کہ قرآن مجید کے بیان کے مطابق وہ (اصلی) حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو فلسطین میں آئے تھے اور یہ عیسوی سن ان کے سن پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے 30 سال کی عمر میں تبلیغ شروع کی اور 3 سال دنیا میں تبلیغ کرتے رہے وہ رسول تھے ان پر وحی آتی تھی اللہ نے ان کو انجیل کتاب عطا فرمائی۔ دنیا بھر کے عیسائی ذرا سے فرق کے ساتھ انہیں ہی 'عیسیٰ' اور مسیحا مانتے تھے۔ اسی نسبت سے ان کو عیسائی کہا جاتا ہے اور مسیحی بھی کہتے ہیں۔ مسلمان بھی اسی عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں انھیں یہود کے منصوبہ کے مطابق صلیب نہیں ہوئی۔ اللہ نے ان کو اس مرحلہ سے پہلے ہی زندہ آسمانوں پر اٹھالیا۔ وہ اب بھی زندہ ہیں اور قرب قیامت میں ملک شام کے قدیمی شہر دمشق میں ظاہر ہوں گے آج کے اسرائیلی لٹریچر کے مطابق اصفہان سے ظاہر ہونے والا مسیح اصلی مسیح ہوگا اور دمشق سے ظاہر ہونے والا 'نقلی مسیح' ہوگا۔ اس کے لیے انہوں نے انگریزی اصطلاحات ایجاد کر لی ہیں مسیح کو CHRIST کہتے ہیں اور اس کے مقابل میں دمشق سے ظاہر ہونے والا جھوٹا CHRIST، ANTI CHRIST ہوگا۔ جبکہ مسلمانوں کے نزدیک دمشق میں معجزانہ طور پر آنے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی ہوں گے۔ ان سے کئی معجزات ظاہر ہوں گے۔ جبکہ اصفہان سے ظاہر ہونے والا جھوٹا مسیح (مسیح الدجال) اور ANTI CHRIST ہوگا۔

مسلمانوں کی روایات کے مطابق دمشق والے مسیح، اسرائیل کے دارالحکومت پر حملہ آور ہوں گے اور جنگیں ہوں گی پھر اصفہان سے ظاہر ہونے والا مسیح الدجال بھی آئے گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس مسیح الدجال کو اسرائیل کے AIRBASE، لیڈا (LYDA)، جسے ترمذی شریف کی روایت میں لُدّ کہا گیا ہے، کے مین گیٹ (باب لد) پر قتل کریں گے۔

مسلمانوں کے نزدیک یہ 'مسیح الدجال' اسرائیل اور یہودی قوم کا 'مسیحا' بن کر آئے گا

اس دجال کے دور میں انہوں نے کئی منصوبہ جات اس کے ہاتھوں مکمل کرنے کا پروگرام بنا رکھا ہے وہ منصوبہ جات تفصیل میں جائے بغیر چند الفاظ میں درج ذیل ہیں

i حضرت سلیمان علیہ السلام کا تعمیر کردہ ہیکل سلیمانی جو پہلے بخت نصر نے گرایا مگر پھر دوبارہ تعمیر کرلیا گیا تھا۔ پھر 70ء میں ٹائٹس (TITUS) رومی نے حملہ کرکے زمین بوس کر دیا جو 0070ء سے اب تک 19 صدیوں سے گرا پڑا ہے اس ہیکل کو تیسری مرتبہ تعمیر کرنا یہود کا منصوبہ ہے اس کی تیاریاں مکمل ہیں مگر یہ تعمیر ____ موجودہ قبۃ الصخرہ (سنہری گنبد) گرا کر ہوگی، جس کے لیے فلسطینی مسلمان رکاوٹ ہیں۔ یہ منصوبہ آنے والے دور میں مکمل کیا جائے گا۔

ii اسرائیل کے اس مسیحا کے آنے پر وسیع تر اسرائیل (GREATER ISRAEL) کا منصوبہ روبہ عمل لایا جائے گا۔ ذہن میں صحیح تصور بٹھانے کے لیے کہ کون کون سے علاقے اس منصوبہ کی زد میں آئیں گے۔ (نقشہ اگلے صفحہ پر منسلک ہے)۔

iii جیسے اوپر ذکر کیا گیا بنی اسرائیل اپنے آپ کو اصلی یہودی سمجھتے ہیں اور بہت سے PREVELIGES اپنے نام کے ساتھ انہوں نے منسوب کر رکھے ہیں مثلاً قرآن مجید کہتا ہے کہ وہ صرف انسان بنی اسرائیل کے افراد کو ہی سمجھتے ہیں باقی چاہیے کوئی ہو وہ انسان نما حیوان ہے ان کو GOYEMS اور GENTILES کہتے ہیں۔ جب بنی اسرائیل کے علاوہ افراد انسان ہی نہیں تو پھر ان کی عزتوں سے کھیلنا ان کے حقوق غصب کرنا، ان کو غلام بنانا، ان پر ظلم وزیادتی روا رکھنا حتیٰ کہ ان سے سود کھانا وغیرہ سب جائز بلکہ ضروری ہے۔ سود یہود کے لیے بھی حرام ہے مگر آج دنیا کا سارا سودی کاروبار یہود ہی کی ملکیت ہے۔ یہودی یہودی سے سود نہیں لیتا کہ سود حرام ہے مگر باقی سب غیر یہودیوں سے سود کھا رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں یہودیوں کی الگ آبادیاں ہیں۔ جہاں ٹی وی نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ ٹی وی اخلاق خراب کرتا ہے حالانکہ دنیا کے سارے اخلاق خراب کرنے والے چینل، فلمی دنیا اور بے حیائی کی دنیا اصل یہود ہی کے زیر سرپرستی میں چل رہی ہے۔ میڈیا سارا ان کے کنٹرول میں ہے۔

- بنی اسرائیل کے اندر بھی ایک تقسیم ہے۔ ایک ہیں باعمل اور PRACTICING یہودی ہیں اور شدت پسند یا FUNDAMENTAL JEWS کہلاتے ہیں اور باقی آج کل

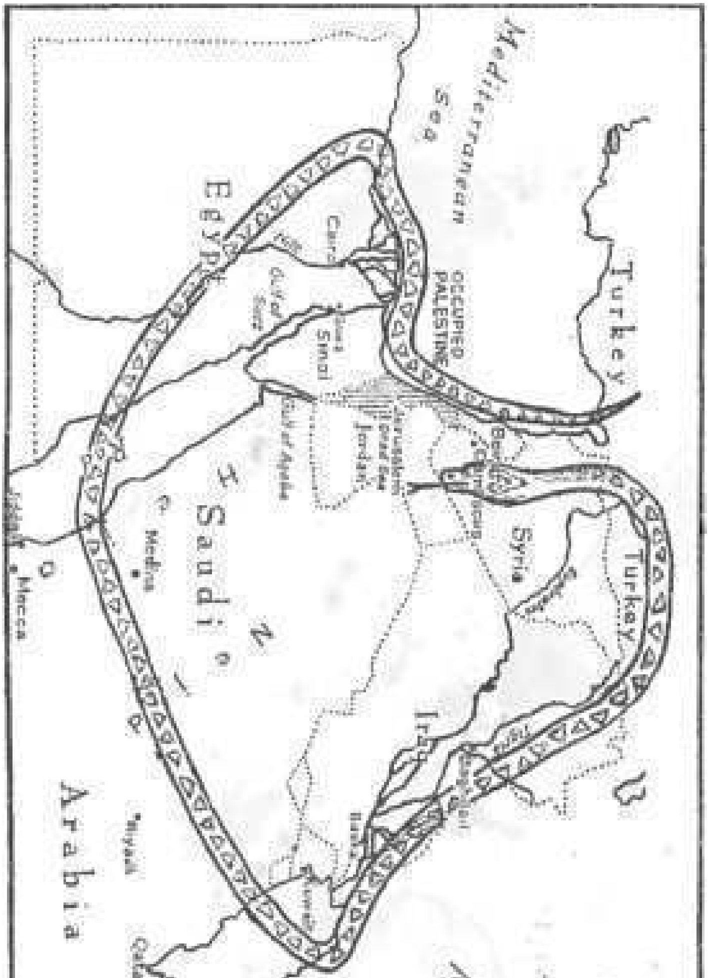
DREAM OF ZIONISM
MAP OF "GREATER ISRAEL"
INTERNATIONAL BOUNDARIES
PROPOSED BOUNDARY OF "GREATER ISRAEL"
FREEMASONS EYE
Turkey
Turkey
Mediterranean Sea
OCCUPIED PALESTINE
Syria
Jerusalem
Dead Sea
Jordan
Cairo
Sinai
Gulf of Suez
Gulf of Aqaba
Egypt
Saudi
Medina
Mecca
Iraq
Basra
Kuwait
Riyadh
Qatar
Arabia
Gulf of Oman

کے مسلمانوں کی طرح نام کے مسلمان ہیں اور اکثر بے عمل ہیں اور لبرل کہلاتے ہیں۔ اور ہر قسم کی مذہبی پابندیوں سے آزاد ہیں۔

iii جو PRACTICING یہودی ہیں وہ گریٹر اسرائیل قائم کر کے اس پر پورا کنٹرول رکھنا چاہتے ہیں اور اس کو اپنی مذہبی روایات کے مطابق ملک بنانا چاہتے ہیں جبکہ لبرل یہودی موجودہ گریٹر اسرائیل میں فرق کرتے ہیں۔ موجودہ اسرائیل کو وہ مذہبی ریاست اور نظریاتی ریاست کے طور پر رکھ کر باقی علاقہ جات کو LOOSE CONTROL کے ساتھ چلانا چاہتے ہیں یعنی یہود خود ملٹی نیشنل کمپنیوں کی ملکیت کی بنیاد پر اسرائیل میں بیٹھ کر عیش کریں گے اور باقی دنیا میں لوگ حیوانوں کی طرح کام کر کے (GOYEMS & GENTILES) کما کر انہیں کھلائیں گے اور وہ خود گھر بیٹھے منافع کمائیں گے۔ جیسے سودی کاروبار پر گھر بیٹھے بغیر محنت منافع ملتا ہے۔

- یہودی ریاست کا کنٹرول عالمی سطح پر پھیل جائے گا اور UNO کے ذریعے حکومت کی جائے گی اور ہر چیز پر یہود کا قبضہ ہوگا۔ اس مقصد کیلئے انکے منصوبہ جات کچھ اس طرح کے ہیں۔
- پچھلی ایک صدی کی محنت اور بینکنگ کے نظام سے انہوں نے پوری انڈسٹری پر قبضہ کر لیا ہے اور ایسی شرائط لگوادی ہیں جن سے ان کو خطیر منافع مفت میں مل جاتا ہے۔ جیسے فیکٹریوں میں کوالٹی کنٹرول کے لیے سرٹیفکیٹ۔ اس پر یہودی فرمیں کنٹرول رکھتی ہیں اور منافع کا ایک حصہ کوالٹی کنٹرول کے نام سے ان کو ملتا ہے۔

انڈسٹری پر کنٹرول کے بعد اب انہوں نے زراعت پر بھی قبضہ کرنا شروع کیا ہے اور گذشتہ دو عشروں میں وہ بہت حد تک کامیاب ہیں۔ زراعت کے پیشہ پر کنٹرول کے لیے انہوں نے جدید HI-BRED کا تصور نکالا اور پھر منصوعی HI-BRED بیجوں کے لیے کھاد (FERTILIZER) کا تصور دیا پھر اچھی فصلوں کے لیے کیمیکل سپرے اور کیڑے مار دواؤں کا معاملہ سامنے آ گیا۔ یہ تصور 60 سال پہلے آیا تھا۔ اب یہ تصور تمام زرعی ممالک میں عام ہو چکا ہے اور لوگ اس کے عادی ہو گئے ہیں تو اگلے مرحلے میں کئی اور پابندیاں آ جائیں گی۔

یہ کنٹرول اسی طرح کا ہے کہ جیسے 'مرغی' کا کاروبار ہے۔ صدیوں سے لوگ اپنے گھروں میں اپنی ضرورت کے مطابق مرغیاں پالتے تھے، انڈے حاصل کرتے تھے، انڈے

کھاتے بھی تھے اور مزید افزائش کے لیے بھی استعمال کرتے تھے مگر اب کیا ہے؟ مغرب نے فارمی مرغی کا تصور دیا ہے HI-BRED مرغی، HI-BRED خوراک سب مصنوعی ہوگی اور فیکٹری میں تیار ہوگی۔ اب انڈے دینے والی فارمی مرغی LYER کے نام سے ملتی ہے جو سال میں 200 یا 250 انڈے دیتی ہے۔ اس کے بعد سستا گوشت بنا کر اس کو کھا لیتے ہیں۔ یہ مرغی جو انڈے دیتی ہے وہ روایتی مرغی کی طرح ایسے انڈے نہیں دیتی جس سے بچے نکلتے ہوں بلکہ یہ انڈے فارمی انڈے کہلاتے ہیں اور صرف خوراک کے طور پر کھائے جاسکتے ہیں۔ نئے چوزوں کے لیے الگ فیکٹریوں میں کچھ مخصوص انڈے مشینوں میں رکھ کر ان سے چوزے نکالے جاتے ہیں۔ آپ مارکیٹ سے ایک دن کا چوزہ، تین دن کا چوزہ وغیرہ مختلف قیمتوں پر آرڈر دے کر گھر بیٹھے فیکٹری میں حاصل کر سکتے ہیں ان کو پال کر بڑا کریں چھ ہفتے دس ہفتوں بعد بیچ دیں پھر نئے چوزے منگا لیں۔ لیئر مرغی جو انڈا دیتی ہے اس سے چوزہ حاصل ہوسکتا ہے۔

اسی طرح اب فصلوں (اجناس اور سبزیوں) کے بیج ہیں یہ ہائی بریڈ ہیں یہ فیکٹریوں میں بنائے جاتے ہیں بہت مہنگے ملتے ہیں ان سے فصل زیادہ ہوتی ہے مگر نئی فصل آنے پر اس سے کچھ بیج بنا کر آپ نہیں رکھ سکتے کہ اس سے اگلے سال فصل کے بیج کے طور پر استعمال کر لیں گے۔ ناممکن ہے۔ نیا بیج آپ کو فیکٹری سے خریدنا ہوگا۔

جاپان ایک چھوٹا سا ملک ہے مگر وہ دیگر مصنوعات کے علاوہ بہت ساری سبزیوں وغیرہ کے بیج بناتا ہے اور عالمی سطح پر سپلائی کر رہا ہے۔ اس کے لیے SEED CORPORATIONS ہیں وہ ملٹی نیشنلز ہیں اور خوب منافع کما رہی ہیں۔ اب کسان بھی سیڈ کارپوریشنز کا محتاج ہے ایک صدی پہلے کا کسان گندم اُگاتا تھا۔ اسی میں بیج رکھ کر گھر کی ضرورت کی گندم علیحدہ کر کے باقی بیچ دیتا تھا۔ اگلے سال وہ گندم بیج کے طور پر استعمال ہوسکتی تھی۔ یہ سلسلہ صدیوں چلا ہے مگر اسرائیلی حکومت اور یہود کی عالمی حکومت اب یہ نہیں چلنے دے گی زراعت پر فرٹیلائزر سپرے، مشینی آلات زراعت کے بعد اب بیج پر بھی یہود کی ملٹی نیشنلز کا قبضہ ہے علیٰ ھذا القیاس۔

اسرائیل کا منصوبہ یہ ہے کہ لوگ محنت کریں اور منافع ہم گھر بیٹھے کھائیں۔ جیسے گندم کا بیج مہنگا بیچ دو۔ (گندم 1600 روپے من ہے۔ جبکہ گندم کا بیج 3500 روپے من ہے۔ یہودی

فیکٹریوں میں خوبصورت ماحول میں کام کرکے بیج بنائے گا اور مہنگے داموں بیچ دے گا۔ اب باقی کسان کی قسمت پانچ ماہ کا منصوبہ ہے زمین تیار کرے، بیج ڈالے پانی دے ٹیوب ویل کا بل ادا کرے، بارشوں کا انتظار کرے، پھر موسم اچھا ہوا تو فصل ہو جائے گی اور کچھ منافع بھی ہو جائے گا یہ اس کی قسمت، سیڈ کارپوریشن کے مالک کو اس سے زیادہ منافع بیج سے گھر بیٹھے ہو گیا۔

◐ اوپر ذکر آیا تھا یہود کا سائبیرین اقوام کے بادشاہ کے ساتھ معاہدے کا، جسے انہوں نے 13th TRIBE کا نام دیا تھا۔ آج موجودہ عالمی سطح پر ملٹی نیشنلز کے اکثر مالک اسی 13th TRIBE کے افراد ہیں۔ ان کے بڑے نام ہیں، ان کی عالمی اجارہ داری ہے۔ یہ معاہدہ یہی تھا کہ یہود 13th TRIBE کو PROTECTION دیں گے، PROMOTE کریں گے، ان کے مفادات کا خیال رکھیں گے جبکہ وہ کوشش کرکے یہود کو فلسطین میں دوبارہ آباد ہونے کے لیے ہر ممکن مدد کریں گے اور یہ معاہدہ اچھے طریقے پر فریقین کامیابی سے نبھا رہے ہیں۔ 13th TRIBE کے لوگ بظاہر یہودی بھی نہیں کہلاتے بلکہ عیسائی ہیں، PROTESTANT ہیں اور گوری نسل (WHITE RACE) ہیں۔ امریکہ میں ان کو ایک وقت WASP کا نام دیا گیا تھا (WHITE ANGLO SEXON PROTESTANTS)۔

دنیا میں اس وقت کوئی پانچ صد سے زیادہ ملٹی نیشنلز ہیں جو سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک کے استعمال اور خوبصورتی و حفاظت کے لیے سامان تیار کرتی ہیں اور آج کا انسان ان ملٹی نیشنلز کا غلام ہے اور ان کے چنگل سے نکل ہی نہیں سکتا۔ آپ شادی کی دعوت میں جاتے ہیں وہاں کھانے کے بعد کولڈ ڈرنک کے بارے میں سوال ہوتا ہے آپ کونسا مشروب پسند کریں گے آپ کسی BRAND کا نام لیں وہ سب ملٹی نیشنلز انہیں کی ہیں حتیٰ کہ کوئی مذہبی مسلمان ہو کہ میں کوئی سافٹ ڈرنک نہیں لوں گا تو آپ AQUAFINIA لے لیں یہ بھی PEPSI کمپنی کا پراڈکٹ ہے گویا عام انسان ہر حال میں انہی ملٹی نیشنلز کے لیے کما رہا ہے اور ان کا غلام ہے۔

بلکہ اب یہود کے منصوبے کے مطابق دیسی مرغی اور فارمی مرغی کی طرح انسان کا DNA بھی HI-BRED تیار ہے اور اگلے 20-25 سالوں تک فارمی مرغیوں کی طرح انسانی بچے فیکٹریوں میں تیار ہوں گے اور لوگ خریدیں گے۔ لڑکی چاہیے یا لڑکا۔ یہ بچے آپ پالیں۔

گھر میں رکھیں عیاشی کریں نگران بچوں کی آگے اولاد نہیں ہوگی لہٰذا ہر پابندی سے آزاد عیاشی کا رواج عام ہو جائے گا اور نہ آنکھ میں شرم، نہ ماں کا احساس، نہ بہن کا احساس، نہ بیوی اور بیٹی کا احساس۔اس لیے کہ یہ بچے فیکٹری سے لیے گئے ہیں ان میں وہ رشتہ داری اور خونی رشتے کا تصور ہی ممکن نہیں ہوگا۔اعاذ نا اللہ من ذالک۔

◐ یہودی پروٹوکالز یہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے ہاں حضرت داؤد علیہ السلام جیسی بادشاہت دوبارہ آئے گی، اسرائیل ملک اسی لیے بنایا گیا ہے۔حضرت داؤد علیہ السلام نے جب (1000 ق م میں) اپنی بادشاہت کا اعلان کیا تھا تو ایک پتھر کی سِل تھی، جس پر بیٹھ کر یہ اعلان کیا تھا وہ پتھر آج بھی 3000 سال سے یہود کے پاس محفوظ ہے اور ان کو انتظار ہے کہ ہماری بادشاہت دوبارہ آئے گی اور اس وقت کا مسیح (الدجال) اسی پتھر پر اپنی بادشاہت کا اعلان کرے گا۔بنی اسرائیل کا یہ بادشاہ (KING) قریب ہے کہ آجائے۔یہ پتھر برطانیہ کے سنٹرل کیتھڈرل (CENTRAL CATHEDREAL) میں محفوظ ہے اور برطانوی بادشاہ یا ملکہ صدیوں سے اسی پتھر پر بیٹھ کر اپنی بادشاہت کا اعلان کرتے ہیں۔یہ پتھر برطانیہ سے اسرائیل لائے جائے گا اور وہاں مخصوص جگہ فٹ کیا جائے گا۔منصوبہ کے مطابق ہیکل سلیمانی (تیسری مرتبہ) تعمیر ہوگا اور یہودی نشاۃ ثانیہ ہوگی اور عالمی حکومت ہوگی اس کا کوئی مدمقابل نہیں ہوگا اور ان کے منصوبے کے مطابق یہ ان کی جنت گم گشتہ ہے اور فردوس بریں ہے جسے وہ دنیا میں ہی حاصل کرلیں گے۔

◐ بنی اسرائیل کے منصوبوں کی پیش رفت اور عالمی اداروں کی اجارہ داری سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہودی بادشاہت کا منصوبہ تیزی سے PLANNING کے مطابق آگے بڑھ رہا ہے۔مگر دنیا میں انسان جو کچھ سوچتا ہے وہ سب کا سب ہر دفعہ جوں کا توں ہو جانا محالات میں سے ہے۔تدبیر کند بندہ، تقدیر کند خندہ، اسے انگریزی میں کہتے ہیں MAN PROPOSES, GOD DISPOSES۔

بنی اسرائیل نے اپنے آنے والے 'مسیح'، جو مسلمانوں کے نزدیک مسیح الدجال ہے، کے ذمے جو بہت سارے کام لگا رکھے ہیں بالخصوص وہ کام جو اس نے آکر کرنے ہیں ان میں سے اکثر کام نہ ہوسکیں گے۔قرآن وحدیث بھی اس بات کی خبر دے رہے ہیں کہ الدجال آنے

والا ہے ایمان ویقین کے معاملات اور کیفیات کے لحاظ سے ایک فتنہ پرور دور ابھی بھی گذر رہا ہے اور بنی اسرائیل کی جانب سے ٹیکنالوجی اور ترقی اور ایجادات کے میدان میں بہت ساری چیزیں 'دجال' کے آنے کے موقع پر ہی سامنے آنے والی ہیں ایسی صورت میں یقیناً ایمان سوز اور شرم وحیا سے عاری حالات میں مزید سختی آئے گی۔

- اسرائیل سعودی عرب اور مصر کی مشترکہ جگہ پر ایک جدید ترین شہر NEOM بسایا جارہا ہے جس کے ائیرپورٹ کا جدید ترین سہولیات کے ساتھ افتتاح ہو چکا ہے باقی تعمیرات اور سہولیات بھی مکمل ہونے جارہی ہے۔ یہ شہر 1500 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری سے جدید طرز کی عیاشی کا مرکز بن جائے گا۔ ابھی دنیا میں 5G ٹیکنالوجی متعارف ہوئی ہے۔ اس شہر میں 7G ٹیکنالوجی اور اس کے متعلقات کو ممکن بنادیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل نے اپنا سب کچھ اپنے 'مسیحا' کے لیے داؤ پر لگا دیا ہے۔ مثلاً آج کسی نے کوئی فلم یا ویڈیو کلپ دیکھنا ہوتا ہے تو موبائل، آئی پیڈ یا سکرین درکار ہے مگر 7G ٹیکنالوجی کے مطابق ویڈیو کلپ دیکھنے کے لیے فضا میں وہ ویڈیو کلپ 3D میں نظر آرہا ہوگا اور مجمع (PUBLIC) اسے دیکھے گا لوگوں کے سامنے جس کے چاہیں گے مناظر لائے جاسکیں گے اور ماحول بنایا جائے گا۔

'الدجال' کے فتنے سے تمام پیغمبروں علیہم السلام نے پناہ مانگی ہے اور اسلام میں بھی اس کے دور میں ایمان کی سلامتی کے لیے خطرات بتائے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس فتنے سے بچائے اور ایمان کو محفوظ رکھے، آمین۔

- انیسویں صدی کے اواخر میں یہود کو ایسے حالات نظر آئے کہ انہیں اپنے منصوبے کے مطابق اسرائیل میں واپسی ممکن نظر آئی اور اپنے کاغذی منصوبے پر عمل درآمد کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ چنانچہ 1897ء میں سوئٹزرلینڈ کے ایک شہر BASEL میں یہودی ڈاکٹر HERZL نے اس کا منصوبہ سامنے لانے کے لیے ایک عالمی جیوش کانفرنس منعقد کی جس میں 17 ممالک سے مندوبین شریک ہوئے اور اس منصوبے کی تفصیلات سے مندوبین کو آگاہ کیا گیا اور ایک سوسالہ منصوبہ کا آغاز ہوا کہ آئندہ ایک صدی میں ہم نے دنیا کے حالات کو مزید سازگار بنا کر اسرائیل کے قیام کے بعد اپنے 'مسیحا' کی آمد کے حالات پیدا کر دینے ہیں۔ اس کانفرنس میں برطانوی ہند سے

مسلمانوں کے دو نمائندے بھی شریک تھے جن میں سے ایک اس وقت آغا خان سوئم بہ عمر 18 سال اس میں شریک ہوئے تھے۔

1900ء کے قریب میں دنیا کا منظر کیا تھا اور اس کے حالات کیا تھے؟ ایک طرف یورپی اقوام پوری طرح دنیا بھر کے علاقوں پر قابض تھیں اور مسلم علاقے بشمول سلطنت عثمانیہ میں بھی مغربی سازشوں کے جال بہت گہرے بن دیے گئے ہیں۔ اس کی گواہی پر برطانوی فلسفی اور مشہور مصنف برٹرینڈ رسل (1872ء-1970ء) اپنی خودنوشت (AUTO BIOGRAPHY) میں لکھتا ہے کہ جب میں جوان تھا (1890ء اور اس کے بعد) اس وقت برطانیہ میں عوام وخواص میں یہ تصور عام تھا اور یقین کے درجے میں تھا کہ دنیا میں یہ برطانوی اقتدار کبھی ختم نہیں ہوگا اور اب یہ برطانوی حکومت دنیا پر ہمیشہ حکمران رہے گی۔ (یہ بات اس دور کی ہے جب برطانوی حکومت عالمی تھی اور اتنی بڑی تھی کہ اس کی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا کہیں نہ کہیں دن رہتا تھا اور برطانوی دفتر خارجہ کا شعبہ 24 گھنٹے کام کرتا تھا)۔ اس جویش کانگریس کے مستقل طور پر اجلاس ہوتے رہے ہیں۔ 1906ء کے اجلاس میں یہودی منصوبہ کی تفاصیل کو آخری شکل دی گئی اور ان دستاویزات کو "THE PROTOCOLS OF THE MEETING OF THE ELDERS OF THE ZIONS" کا نام دیا گیا اور اس کا کچھ حصہ کتابوں اور پریس میں دنیا کے سامنے آ گیا۔

- 1906ء کے بعد کے 100 سال کے حالات و واقعات اور پھر آخری مراحل کے مناظر دور جدید ہے وہ آگے اس شمارے کے بعد کے ابواب میں سامنے آئیں گے۔ ایک صدی کے مشہور واقعات اہل فکر ونظر کے علم میں ہیں مگر یہ واقعات کیوں ہوئے اور ان کا آپس میں کیا تعلق ہے یہ بات ان کے مطالعہ کے بعد ہی سامنے آئی گی۔

8 مغرب کا سب سے بڑا اقدام
ــــ نظامِ تعلیم کی تباہی

- یہ بات اس عالمی صہیونی منصوبہ بندی کا پہلے سے حصہ تھی اور 1897ء کے بعد بالخصوص واضح ہوگئی کہ مغربی اعلیٰ دماغوں نے جمہوریت، آزادی اور لبرل ازم کے نام پر دنیا میں

عام کر دی ہے جس کو عوام تو کیا عالمی قوتوں، ملکوں اور تہذیبوں کے اعلیٰ دماغ بھی سمجھنے میں دیر لگاتے ہیں کہ سیکولر اور لبرل نظامِ تعلیم کے ذریعے 'علم' کو بے شمار خانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور اس میں علم اتنا وسیع کر دیا گیا ہے کہ کوئی انسان ایک شعبے میں ترقی کرتے کرتے ایم فل اور پی ایچ ڈی کرتا ہے پھر اس شعبے کے دسویں حصے کے کسی ایک پہلو کا ماہر کہلاتا ہے مثلاً ایک شخص طب اور صحت کے شعبے سے متعلق ہے تو ہم جانتے ہیں اس ڈاکٹری کے کتنے شعبے ہو گئے ہیں اور ابھی کتنے آنے والے ہیں۔ دل کے ڈاکٹروں کے کئی شعبے ہیں۔ انسانی زندگی میں دل، گردہ، مثانہ، ہڈیاں، کینسر، جنسی بیماریاں، جلدی بیماریاں، دماغی بیماریاں اور نفسیاتی بیماریاں ہیں پھر آنکھ ناک کان کی بیماریاں ہیں ان کے سپیشلسٹ ہیں ہڈیوں کی بیماریاں ہڈیوں کا ٹوٹنا اور جوڑنا وغیرہ۔ زچگی اور بچوں کی پیدائشی کی بیماریاں ہیں۔ پھر ان میں ماہرین کی درجہ بندی ہے، ہر شعبہ کی ادویات ہیں ان ادویات کی تیاری، سپلائی، ڈسٹری بیوشن ہے پھر گلی محلے کے ڈاکٹر ہیں پھر میڈیکل ریپ ہیں دوائی ساز کمپنیوں کے نمائندے ڈاکٹروں کو نئی ادویات سے متعارف کراتے ہیں۔ ڈاکٹر کو مہنگی دواؤں کو PRESCRIBE کرنے کی ترغیب دیتے ہیں ان کو مراعات (کاریں، عمرے کے ٹکٹ، سنگاپور، یورپ، ہانگ کانگ کے سفری ٹکٹ وغیرہ وغیرہ) دیتے ہیں۔

اسی طرح کا حال ایگریکلچر (محکمہ زراعت) کا ہے اس طرح ٹیکسٹائل کا شعبہ ہے اکنامکس کا شعبہ، کمپیوٹرز اور اس کے ماہرین کے معاملات ہیں۔ چرچ اور اس کے متعلقہ افراد کے معاملات ہیں سب سے آخر میں سوشل سائنسز اور اس کے شعبہ جات ہیں۔ ان سب پر مستزاد پریس، ٹی وی اور میڈیا ہے۔ موبائل فون ہیں پھر انفارمیشن ٹیکنالوجی میں MESSAGES، فون پر بات چیت ہے فون ریکارڈنگ ہے، آواز اور تصویر کا شعبہ ہے ENTERTAINMENT کا شعبہ ہے FACEBOOK ہے، WATHSAPP ہے، ٹوئٹر، انسٹا گرام اور ٹک ٹاک وغیرہ ہیں۔ دنیا بھر میں مغرب کی پروردہ NGO's ہیں ان کی کارگزاریاں ہیں۔ صحافت کا شعبہ ہے۔ سپورٹس کا شعبہ ہے کرکٹ ہے اس کے متعلقات ہیں، فلم انڈسٹری ہے اور اس کے متعلقات ہیں، شو بزنس ہے ہالی وڈ اور بالی وڈ وغیرہ وغیرہ کی الگ دنیا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ایک شعبے کا پی ایچ ڈی کے درجے والا اپنے ہی شعبوں سے

واقف ہوتا ہے تو دوسرے شعبوں سے پھر بالکل ہی نابلد ہوتا ہے اور ABC بھی نہیں جانتا۔
پھر مذاہب کی دنیا ہے اس سے متعلق افراد ہیں عبادت گاہیں ہیں اس سے متعلق افراد ہیں لوگوں کی مذہبی تعلیم ہے اس سے متعلق پورا نظام ہے۔ اختلافات ہیں میڈیا ہے لاؤڈ سپیکر ہے۔

بالعموم شادی بیاہ کی محفلوں اور دوسرے برادری کے خوشی غمی کے اجتماعات میں کئی شعبوں کے متعلق رشتہ دار، اعزہ واقارب خواتین وحضرات جمع ہوتے ہیں اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ کسی شعبے میں پی ایچ ڈی ہے مگر نماز صحیح نہیں آتی، زراعت میں بہت اعلیٰ حیثیت کا ماہر ہے مگر اخلاق وکردار، گفتگو اور BEHAVIOUR میں ابھی بچہ ہے۔ اکنامکس اور بینکنگ میں بڑا نام ہے مگر پولیس، کچہری کے معاملات سے ناواقف ہے بہت بڑا کاروباری ہے مگر اپنے مذہبی معاملات اور تاریخ سے بے بہرہ ہے۔

الغرض ایک شعبے میں 'ماہر' اپنے ہی شعبے میں مگن ہے اور اس کی تفصیلات جاننے اور بال کی کھال اتارنے میں لگا ہوا ہے کوئی گویا ہے، کوئی ڈرامہ میں کام کرتا ہے کوئی ہوٹل انڈسٹری میں ہے کوئی میڈیکل کے شعبہ کا ہے کوئی استاد ہے۔ علم کی مختلف خانوں میں تقسیم اسی میں انسانی زندگی کا کھپ جانا زندگی کے دوسرے ناگزیر معاملات، مذہب، اخلاق، رشتہ داریاں، انسانی حقوق، نوعِ انسانی کی خدمت کے شعبوں سے لاتعلقی، یہ اس دور کے فتنوں میں سے بڑا فتنہ ہے۔
ہر شخص کما رہا ہے اور خرچ کر رہا ہے دنیاوی زندگی ہے اچھا مکان بنانے کی فکر سوار ہے۔ مکان بن جائے اچھا کھانا اور مری سوات کی ہر چند ماہ بعد سیر ہے مزید بڑا ہو جائے اور عالمی سطح پر یورپ امریکہ، انڈیا، نیپال سنگاپور کی سیر ہے ہوٹل انڈسٹری ہے ٹورازم ہے۔ پھر اس کے متعلقات ہے۔ HOTLLING ہے۔ بدکاریاں، شراب، ڈانس بے حیائی ہے ناجائز دوستیاں ہیں یہ آزادی کا لبرل ازم کا حاصل ہے اور یہودی پروٹوکالز کے عین مطابق ہے۔

9 1947ء میں پاکستان کا قیام، مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن اور ___ علامہ اقبال

اس عالمی پس منظر میں منحوس برطانوی سامراج ساری دنیا پر قابض تھا جس کا ایک حصہ جنوبی ایشیا سے متعلق ہے جہاں ہمارے آباء واجداد ایک صدی قبل سے آباد ہیں۔ یہ دور غلامی

1757ء سے شروع ہو کر 1947ء میں ختم ہوا۔ بنگال وغیرہ میں دو صدیوں کی غلامی تھی پنجاب اور کے پی کے (سرحد) میں پہلے سکھوں کی غلامی کا دور تھا (1803ء_1846ء) اور پھر سو سال کی صہیونی برطانوی استعمار کی بدترین غلامی کا دور ہے۔ علامہ اقبال ہی مسلمان نوجوانوں کے بارے میں فرماتے ہیں:ؔ

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

ؔ
افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں
پوشیدہ نہیں مردِ قلندر کی نظر سے
معلوم ہیں مجھ کو ترے احوال کہ میں بھی
مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہِ گزر سے

موجودہ پاکستان میں پنجاب اور کے پی کے آدھا پاکستان ہے اور یہاں انگریزی اقتدار سے پہلے سکھوں کی غلامی کا دور ہے جہاں تین نسلوں رنجیت سنگھ، کرتار سنگھ اور نونہال سنگھ نے حکومت کی ہے۔ یہ دور 1846ء تک رہا۔ رنجیت سنگھ کی حکومت بھارتی پنجاب اور پاکستان کے پنجاب سے کشمیر، پشاور اور کابل تک تھی اور سکوں کے عہد میں شاہی مسجد گھوڑوں کا اصطبل تھا، ملک بھر کی مساجد بند تھیں، نماز باجماعت اور اذان پر پابندی تھی، قرآن مجید لے کر باہر نکلنا جرم تھا۔ 1846ء میں یہ علاقہ انگریز نے فتح کیا تو پنجاب اور کے پی کے میں جشن منایا گیا کہ چلو سکھا شاہی سے جان چھوٹی۔ انگریز نے مسجدیں کھول دیں، اذان اور نماز کی اجازت دے دی، قرآن پڑھنے کی اجازت دے دی۔ پنجاب اور اس کے ملحقہ علاقہ جات میں انگریز کے آنے کا خوشی سے استقبال کیا گیا جبکہ باقی پورے جنوبی ایشیا میں انگریزی حکومت سے نفرت پائی جاتی تھی، بنگال میں وہ نفرت عروج پر تھی ملحقہ صوبہ سندھ پر پگاڑا خاندان نے 1941ء تک انگریز کی مخالفت کی اور انگریز کے عتاب میں رہے آزادی کے لیے قربانیاں دیں۔ پنجاب میں آزادی کا جذبہ علامہ اقبال اور دیگر مصلحین نے پیدا کیا۔

علامہ اقبال نے شاعری سے مسلمانوں کو جگایا چنانچہ شکوہ 1911ء، شمع وشاعر 1912ء، جوابِ شکوہ 1913ء، طلوعِ اسلام 1923ء، انگریزی خطبات 1929ء، الہ آباد کا مشہور خطبہ دسمبر

1930ء، ابلیس کی مجلس شوریٰ 1936ء وغیرہ نظمیں لکھ کر پنجاب کے عوام بلکہ پڑھے لکھے طبقہ کو بھی جگایا اور انہوں نے قیام پاکستان میں علی گڑھ کے طلبہ کے بعد سب سے نمایاں رول ادا کیا۔

- عالمی صہیونی سازشوں کے علی الرغم برطانوی استعمار کا یہاں سے دفع ہوجانا اور پاکستان کا بن جانا یقیناً___ ایک معجزہ سے کم نہیں۔

10 قیامِ پاکستان اور ہماری ذمہ داریاں ___ کرنے کا کام

آغاز میں گفتگو شروع ہوئی تھی دین و مذہب کے فرق سے۔ سیکولر اور لبرل نظام کو نہ صرف عام مذاہب سے بلکہ سب مذاہب مل کر بھی جدوجہد کریں تو ان سے کوئی خطرہ نہیں، جب تک اجتماعی نظام POLITIO-SOCIO-ECNOMIC SYSTEM سیکولر اور لبرل قوتوں (یعنی صہیونی استعمار) کے پاس رہے۔ خطرہ کی گھنٹی اس وقت بجنے لگتی ہے اور سائرن گونجنے لگتے ہیں جب مسلمان کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک اجتماعی نظام بھی ہے اور وہ سب نظاموں سے اچھا ہے اور فطرتِ انسان کے عین مطابق ہے اور دنیا اس کی ماضی میں ایک مثال 'خلافت راشدہ' کے مبارک دور کی جانتی ہے۔ لہٰذا سیکولر اور لبرل قوتیں اور سیکولر و لبرل اینکر پرسن و میڈیا و پروفیسرز و لیکچرز و وکلاء و بیوروکریٹ وغیرہ اس وقت شور مچاتے ہیں کہ مسلمان 'دہشت گرد' ہیں کہ یہ پولیٹیکل اسلام کی بات کرتے ہیں پھر اس نظام کے غلبے کی بات کرتے ہیں۔

لبرل اور سیکولر دانشوروں کو خوب معلوم ہے کہ اسلام کا اجتماعی نظام ہی عین فطرت ہے اور انسانی مسائل کا واحد صحیح حل ہے۔ عالمی صہیونی طاقتوں کو اس وقت پولیٹکل اسلام ایک گالی لگتا ہے کہ اسلام پہلے کسی ملک میں آئے گا پھر پھیل کر گلوبل ہوجائے گا۔ عام آدمی کے لیے یہ جملہ خطرناک نہیں ہے مگر آج کی سپر پاوز اور ایٹمی طاقتیں اور UNO کے مستقل ارکان کو یہ جملہ ایک 'گالی' کی طرح کاٹتا ہے کہ اسلام کا عالمی غلبہ ہوگا___ اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ موجودہ عالمی سیکولر و لبرل نظام لپیٹ دیا جائے اور اس کے سارے قوّال (اس کے حق میں باتیں کرنے والے) گھروں کو چلے جائیں گے خاموش ہوجائیں گے یا اسلام لے آئیں گے اگر مقابلہ کریں

گے تو قتل کر دیے جائیں گے۔

سیکولر اور لبرل طبقات کا یہ غصہ بجا ہے اور فطری ہے کہ اسلام کے دین ہونے کا مطلب ہے مستقبل قریب میں اس کا عالمی غلبہ ہوگا اور کسی سازش کے ذریعے نہیں بلکہ دن کی روشنی میں علیٰ رؤس الاشہاد ہوگا اور اسلام کا عادلانہ اجتماعی معاشی وسیاسی وسماجی نظام ـــــ دنیا برت کر دیکھے گی اور اس کی برکات سے مستفید ہوگی۔

ملک پاکستان کا انگریز کی حکومت کے عروج کے دور میں بننا یقیناً ایک معجزے سے کم نہیں، علامہ اقبال اس لیے مجوز پاکستان اور مصور پاکستان ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

ے وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

ے عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری
میرے درویش خلافت ہے جہانگیر تری

ے کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں (جواب شکوہ 1913ء)

ے عطا مومن کو درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہن ہند، نطق اعرابی (طلوع اسلام 1923ء)

علامہ اقبال نے عالمی صہیونی استعمار کے فرنٹ میں برطانیہ کے ابلیسی منصوبے یوں آشکار کیے تھے (ابلیس کی مجلس شوریٰ (1936ء))

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اسکے سب مہرے ہوں مات!
خیر اسی میں ہے، قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات!

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

علامہ اقبال نے 1930ء کے خطبہ الٰہ آباد میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کا جو مطالبہ کیا تھا اس کے الفاظ یہ تھے:

"I WOULD LIKE TO SEE THE PUNJAB. THE NORTH-WEST FRONTIER PROVINCE, SINDH AND BALUCHISTAN AMALGAMATED INTO A SINGLE STATE. SELF-GOVERNMENT WITHIN THE BRITISH EMPIRE OR WITHOUT THE BRITISH EMPIRE, THE FORMATION OF A CONSOLIDATED NORTH WEST-INDIAN MUSLIM STATE APPEARS TO ME TO BE THE FINAL DESTINY OF THE MUSLIMS, AT LEAST OF NORTH-WEST INDIA."

''میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو متحد ہو کر ایک واحد ریاست کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں، جس کی اپنی حکومت ہو خواہ سلطنتِ برطانیہ کے تحت یا اس سے الگ اور مجھے نظر آ رہا ہے کہ یہ متحدہ شمال مغربی مسلم ریاست کم از کم شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے تقدیرِ مبرم ہے۔''

"I THEREFORE DEMAND THE FORMATION OF A CONSOLIDATED MUSLIM STATE IN THE BEST INTERESTS OF INDIA AND ISLAM."

''لہٰذا میں ہندوستان اور اسلام کے بہترین مفاد میں ایک الگ مسلم ریاست کے بنانے کا مطالبہ کرتا ہوں۔''

" FOR ISLAM (IT WILL BE) AN OPPORTUNITY TO RID ITSELF OF THE STAMP THAT ARABIAN IMPERIALISM WAS FORCED TO GIVE IT, TO MOBILIZE ITS LAWS, ITS EDUCATION, ITS CULTURE AND TO BRING THEM INTO CLOSER CONTACT WITH ITS OWN ORIGINAL SPIRIT AND WITH THE SPIRIT OF THE MODERN TIMES."

''اسلام کے لیے یہ ایک موقع ہوگا کہ عرب ملوکیت کے تحت اس پر جو پردے پڑ گئے تھے ان سے چھٹکارا حاصل کر سکے اور اپنے قوانین، تعلیمات اور ثقافت کو اپنی اصل روح کے ساتھ روحِ عصر سے ہم آہنگ کر سکے۔''

علامہ اقبال کا فکر قرآن وحدیث سے ماخوذ ہیں:

(i) قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: تَکُوْنُ النُّبُوَّۃُ فِیْکُمْ مَاشَاءَ اللّٰہُ اَنْ تَکُوْنَ ثُمَّ یَرْفَعُھَا اللّٰہُ اِذَا شَاءَ اَنْ یَرْفَعَھَا، ثُمَّ تَکُوْنُ خِلَافَۃٌ عَلٰی مِنْھَاجِ النُّبُوَّۃِ فَتَکُوْنُ مَاشَاءَ اللّٰہُ اَنْ تَکُوْنَ ثُمَّ یَرْفَعُھَا اِذَا شَاءَ اَنْ یَّرْفَعَھَا، ثُمَّ تَکُوْنُ مُلْکًا عَاضًّا فَتَکُوْنُ مَاشَاءَ اللّٰہُ اَنْ تَکُوْنَ ثُمَّ یَرْفَعُھَا اِذَا شَاءَ اَنْ یَّرْفَعَھَا، ثُمَّ تَکُوْنُ مُلْکًا جَبْرِیًّا فَتَکُوْنُ مَاشَاءَ اللّٰہُ اَنْ تَکُوْنَ ثُمَّ یَرْفَعُھَا اِذَا شَاءَ اَنْ یَّرْفَعَھَا، ثُمَّ تَکُوْنُ خِلَافَۃٌ عَلٰی مِنْھَاجِ النُّبُوَّۃِ ثُمَّ سَکَتَ (رواہ احمد عن النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارے اندر عہد نبوت جب تک اللہ چاہے گا موجود رہے گا پھر جب اللہ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اس (عہد نبوت) کو ختم کردے گا، اسکے بعد خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوگی جو قائم رہے گی جب تک اللہ چاہے گا پھر جب اللہ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اسے ختم کردے گا پھر (اس کی جگہ) کاٹ کھانے والی بادشاہت قائم ہوگی جو جب تک اللہ چاہے گا برقرار رہے گی پھر اسے بھی جب اللہ ختم کرنا چاہے گا تو ختم کردے گا پھر جابرانہ ملوکیت کا دور ہوگا جو جب تک اللہ چاہے گا باقی رہے گا پھر اللہ جب اسے بھی ختم کرنا چاہے گا تو ختم کردے گا پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ (دوبارہ) قائم ہوگی۔ پھر آپ ﷺ خاموش ہوگئے۔

(ii) عَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْاَسْوَدِ، اَنَّہٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ: لَایَبْقٰی عَلٰی ظَھْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَ لَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَہُ اللّٰہُ کَلِمَۃَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِیْزٍ اَوْ ذُلِّ ذَلِیْلٍ، اِمَّا یُعِزُّھُمُ اللّٰہُ فَیَجْعَلُھُمْ مِنْ اَھْلِھَا اَوْ یُذِلُّھُمْ فَیَدِیْنُوْنَ لَھَا۔ قُلْتُ: فَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔ (رواہ احمد)

حضرت مقداد ؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''رُوئے زمین پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر رہ جائے گا اور نہ اونٹ کے بالوں کا بنا ہوا کوئی خیمہ، جس میں اللہ کلمۂ اسلام کو داخل نہ کر دے۔ خواہ کسی سعادت مند کو عزت دے کر اور خواہ کسی بدبخت کی مغلوبیت کے ذریعے۔ یعنی یا تو اللہ تعالیٰ لوگوں کو (اسلام کی بدولت) عزت عطا فرما دے گا اور انہیں کلمۂ اسلام کا قائل وحامل بنا دے گا یا (حالت کفر پر برقرار رہنے کی صورت میں) انہیں مغلوب فرما دے گا کہ وہ اس کے محکوم اور تابع بن کر رہیں گے''۔ حضرت مقداد ؓ فرماتے ہیں کہ اس پر میں نے اپنے دل میں کہا: ''پھر تو واقعتاً دین کل کا کل اللہ ہی کے لیے ہو جائے گا!''

پاکستان کا قیام مسلمانانِ جنوبی ایشیا کی آزادی کے ساتھ ایک بہت بڑی ذمہ داری کا بیان تھا اور عالمی غلبہ اسلام کی خوش خبری بھی۔ لہٰذا ابھی وقت ختم نہیں ہوا، آج بھی دینی ذمہ اریوں کو سمجھیں اور ان کو ادا کریں تو علامہ اقبال اور قائد اعظم (بانیانِ پاکستان) کا خواب سچا ہو سکتا ہے اور یہاں نظامِ خلافت آ سکتا ہے اور علامہ اقبال و محمد علی جناح کی روحوں کو سکون مل سکتا ہے۔

پاکستان میں 73 سال سے اسلام کیوں نہیں آیا؟ قیامِ پاکستان کا مقصد اور علامہ اقبال کا خواب ابھی کیوں پورا نہیں ہوا؟ زمینی حقائق بتاتے ہیں کہ 1947ء میں ہمیں ایک خطہ زمین تو مل گیا مگر ذہنی غلامی اور نفسیاتی و تہذیبی غلامی کا دور ابھی جاری ہے۔ برطانیہ کے منحوس دور غلامی کے بعد اب منحوس تر دور سے ہم گذر رہے ہیں اور وہ امریکی غلامی کا دور اس دور غلامی سے جب ہم نکلیں گے تو پھر ہم ایک زندہ و آزاد قوم کے افراد کی طرح کام کر کے جلد پاکستان کو اسلام کا گہوارہ بنا دیں گے۔

آیئے ہم سب اس مقدس مشن کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیار ہو جائیں

ے یہ بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنے ہارے بھی تو بازی مات نہیں

فرمودۂ اقبال

گدائی

میکدے میں ایک دن اک رندِ زیرک نے کہا
ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا!
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اُسے؟
کس کی عُریانی نے بخشی ہے اسے زرّیں قبا؟
اس کے آبِ لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی
دینے والا کون ہے ؟ مردِ غریب و بے نوا !
مانگنے والا گدا ہے! صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا!

(ماخوذ از انوری)

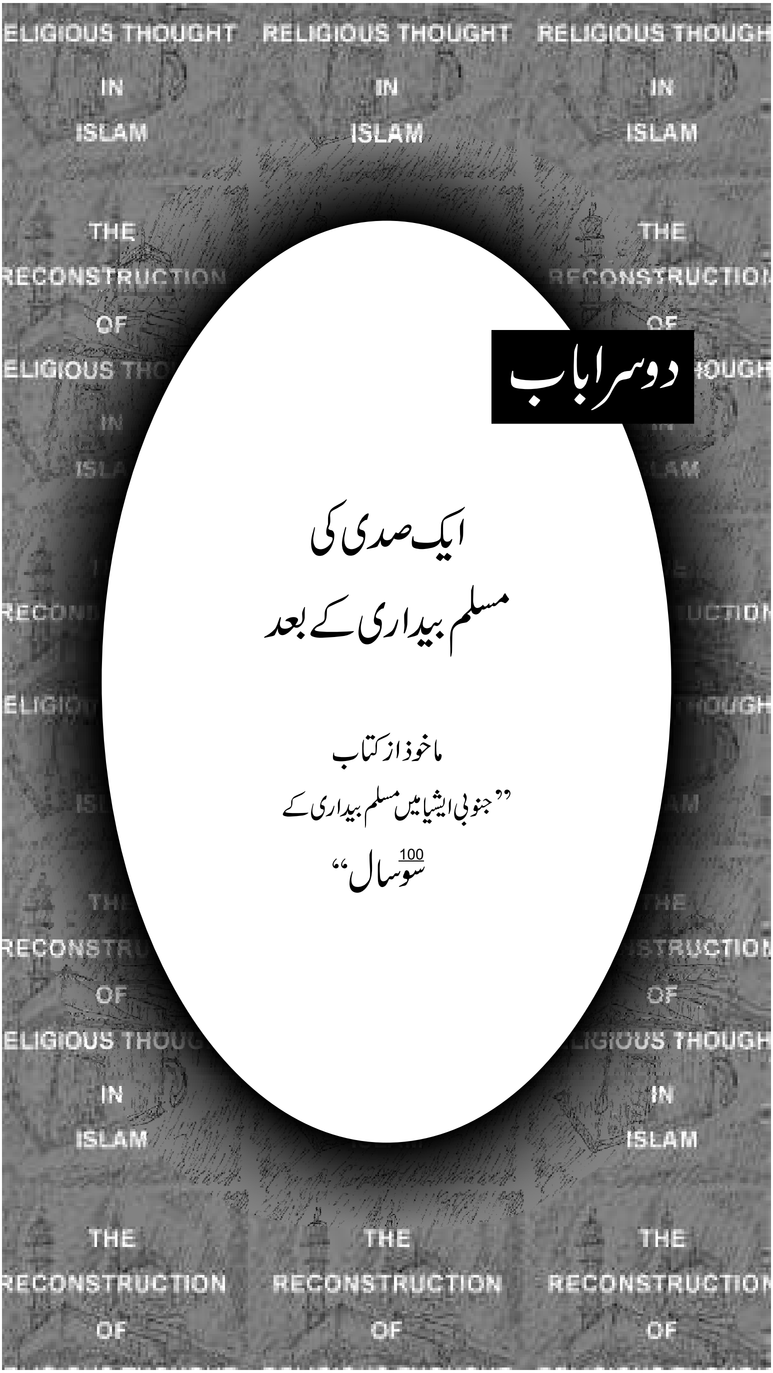

دوسرا باب

ایک صدی کی
مسلم بیداری کے بعد

ماخوذ از کتاب

”جنوبی ایشیا میں مسلم بیداری کے

100
سو سال“

1۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے تناظر میں
مسلمان، ہندو اور برطانوی سامراج 72

2۔ اُمّت مسلمہ کی بیداری ــــ ایک صدی کا سفر 88

3۔ مفکّرِ پاکستان حضرت علامہ اقبال کے نام
مصنّف کا ایک خط 94

1857ء کی جنگ آزادی

برطانوی ہند کی اس جنگ کے تین فریق

1

(برطانوی استعمار، ہندو، مسلمان)

قرآن کے قانونِ عروج وزوال کی روشنی میں

جنوبی ایشیا میں گنگا، جمنا اور سندھ کے میدانی علاقے دنیا کے تہذیبی اور تمدنی ارتقاء میں نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ آج سے چار ہزار سال قبل انسان دریاؤں اور چشموں کے پاس ہی آباد تھے اور زندگی کے وسائل نہایت ہی محدود بھی اور کمیاب بھی تھے۔ تاریخِ انسانی میں کئی تہذیبیں اُٹھیں، پھلی پھولیں، عظمت کے پھریرے گاڑے اور بالآخر فنا کے گھاٹ اُتر گئیں۔ علامہ اقبال نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا تھا: ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیرِ اُمم کیا ہے ۔۔۔ شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رُباب آخر!

فاتحین، شہنشاہوں اور مطلق العنان حکمرانوں کے جبر اور ظلم کے تحت زندگی گزارنے والے معاشروں کو چھوڑ کر تاریخ انسانی پر نگاہ رکھنے والا ہر آدمی جانتا ہے کہ وہی نظریہ یا خیال پھیلتا ہے اور جغرافیائی سرحدوں کی پرواہ کیے بغیر، علاقوں اور اقوام کو مسخر کرتا چلا جاتا ہے جو انسانی فلاح اور کامرانی اور عدل وانصاف کا علمبردار ہوتا ہے، جو قومیں ایسی اقدار کو لے کر اُٹھتی ہیں وہ چھا جاتی ہیں اور دوسری قومیں اور تہذیبیں جو اِن اَخلاقِ عالیہ سے عاری ہوتی ہیں یا بے عملی کا شکار ہوتی ہیں، محکوم ہو جاتی ہیں اور غلام بنالی جاتی ہیں۔

جنوبی ایشیا میں اسلام آیا اور چھا گیا۔ کیا جب غزنوی اور غوری نے حملے کیے اور سلطنتیں قائم کیں تو مقامی لوگوں کے کسی نے ہاتھ باندھ دیے تھے؟ یقیناً نہیں! بلکہ ان کی محکومی میں، ان کے نظریات کی کمزوری اور اجتماعی سوچ کی کمی کے ساتھ ساتھ مقامی حکمرانوں کے ظلم اور ناانصافی کا

بڑا عمل دخل تھا۔ یہ ایسے عالمگیر اصول ہیں کہ خود مسلمان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ جب تک مسلمانوں میں یہ اعلیٰ اصول رہے، اللہ تعالیٰ نے حکومت، عزت اور وقار دیے رکھا اور جب یہ اعلیٰ اصول نہ رہے تو سابقہ محکوم قوموں نے ہی اُٹھ کر حاکموں کو زیر کر لیا۔ تاریخ انسانی ایسی حیران کن مثالوں سے بھری پڑی ہے تاہم اس سے سبق کوئی شاذ و نادر ہی حاصل کرتا ہے۔

جنوبی ایشیا میں مسلمانوں نے کئی صدیاں اقلیت میں ہونے کے باوجود حکمرانی میں گزاریں اور مجموعی طور پر اعلیٰ اقدار، رواداری، عدل و انصاف اور انسانی احترام کو فروغ دیا۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات پر تو گویا مسلمانوں کی عظمت کا مینار یکا یک زمین بوس ہو گیا اور تیزی سے زوال کے آثار نمودار ہونا شروع ہوئے، جگہ جگہ خانہ جنگی اور باہمی چپقلش کے مناظر سامنے آئے اور محکوم قوموں نے بھی انگڑائی لی اور بجا طور پر موقع سے فائدہ اُٹھایا اور سپین کی طرح مسلمانوں ہی سے عدل و انصاف اور مساوات کے اعلیٰ اصول سیکھ کر مسلمانوں کے زوال پر ان اصولوں کے علمبردار ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ مسلمان اُمت عروج سے زوال کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی اور ہندو زوال سے عروج کی طرف قدم بڑھا رہا تھا اور مسلمانوں سے ایک طرح کا انتقام لینا چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی اجتماعی اور عالمگیر قوتِ ارادی نے احمد شاہ ابدالی کے ذریعے ہندو مرہٹہ قوت کو پاش پاش کر دیا۔ لیکن مسلمانوں میں اجتماعی قوت اور ضمیر اتنا منظّم اور بیدار نہیں تھا کہ وہ ہندوستان پر قابض رہ سکتا۔

اسی دوران یورپ میں یہی عمل چار صدیوں کے فرق سے منطقی انتہا تک پہنچ چکا تھا اور مسلمانوں کو مغلوب کر لیا گیا تھا اور عیسائی دنیا یورپ میں مسلمانوں پر غلبہ حاصل کر کے انہی سے حاصل علم و آگہی اور سائنسی اکتشافات کے سہارے یورپی صلیبی استعمار سارے عالم پر قبضہ کے خواب دیکھ رہا تھا کہ برطانوی سامراج کو بنگال میں پاؤں جمانے کا موقع مل گیا۔ برطانوی سامراج کا تصادم زیادہ تر مسلمانوں سے رہا شاید یہ وجہ تھی کہ پہلے مسلمان ہی حکمران تھے۔ ہندوؤں نے اکثر و بیشتر مسلمانوں کے خلاف برطانوی سامراج ہی کا ساتھ دیا۔ ہندوؤں کے لیے انگریزوں کی غلامی کوئی نئی اور انوکھی چیز نہ تھی بلکہ نئے حکمرانوں اور CHANGE OF MASTERS کا معاملہ تھا۔ چنانچہ جنگ پلاسی (1753ء) جنگ میسور سلطان ٹیپو کی شہادت (1799ء) سے لے کر 1857ء کی جنگ آزادی تک غالب اکثریت میں

مسلمان ہی اُٹھتے، مقابلہ کرتے، مرتے اور پھانسیوں پر لٹکائے جاتے نظر آتے ہیں اور غاصب برطانوی سامراج کے خلاف ہندوؤں کو کالے پانی بھیجے جانے یا تختہ دار پر لٹکائے جانے کی سعادت بہت کم نصیب ہوسکی۔ جو ہندو کی اٹوٹ اور روایتی نفسیات کا مظہر ہے۔

بطور جملہ معترضہ یہ بات بھی سامنے آجائے تو مضائقہ نہیں کہ ظلم و جبر اور دار و رسن کی جو داستان برطانوی سامراج نے 1857ء کے بعد صرف جنوبی ایشیا کے مرکز دہلی کے آس پاس رقم کی تھی، وہی داستان آج امریکہ اپنے اتحادیوں کے ساتھ عالمی سطح پر عراق، دارفور، افغانستان اور تیمور یہ میں رقم کر رہا ہے۔ تختۂ ستم اس وقت بھی مسلمان تھے اور آج بھی مسلمان ہی ہیں مسلمانوں کا قصور ہی ایسا ہے کہ نا قابل معافی ہے۔ دوسری اقوامِ عالم بالخصوص ہندو اس وقت بھی مفادات کا پجاری تھا اور آج بھی بدرجہ اَتم مفادات کا غلام ہے۔

1857ء کے مسلم کُش دور کے بعد جب حالات ذرا پرسکون ہوئے اور برطانوی سامراج نے قدم جما لیے تو مسلمانوں کے لیے ایک اور کڑی آزمائش کا وقت آ گیا۔ مسلمان اُمت جنوبی ایشیا میں دو مختلف دھاروں میں بٹ گئی۔ دیوبند اور علی گڑھ زمینی طور پر زیادہ دور نہیں (صرف ساٹھ کلومیٹر ہیں) تاہم وہاں سے دو علمی تحریکوں نے جنم لیا اور یوں ہر آنے والے دن نے مسلمانوں کے درمیان ظاہری تقسیم کے اثرات بہت گہرے کر دیے اور مسلمان قوت اور ذہن منقسم ہو کر رہ گیا جبکہ ہندو منظّم ہونے کے ساتھ دیگر غیر مسلم اقوام کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کے مقابلے پر اُتر آیا۔

1867ء سے 1947ء تک کی جدوجہد میں مسلمانوں کے یہ دو دھارے بڑے نمایاں رہے اگرچہ مسلمانوں کے ایک (اہم اور قیادت کے حامل) دینی طبقہ نے کانگریس کا ساتھ دیا تاہم عوام الناس نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ آخری سالوں میں علماء کا ایک طبقہ بھی مسلم لیگ کے ساتھ آملا لیکن مجموعی طور پر مسلمان قوت منقسم رہی اور اس کا فائدہ خواہی نخواہی ہندو نے ہی اُٹھایا۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں 1947ء میں برطانیہ بوریا بستر گول کر کے ہندوستان سے چلا گیا اور جنوبی ایشیا میں بھارت اور پاکستان کے نام سے دو سلطنتیں یا ریاستیں وجود میں آگئیں۔

مسلمانوں نے 1857ء سے 1947ء تک کا سفر ایک نئے تجربے اور غلامی کے ساتھ طے کیا۔ مزید برآں انگریز کی طرف سے ظلم و ستم کا نشانہ بھی بنے رہے جبکہ ہندو پہلے سے ہی بیدار

اور آمادۂ عمل تھا وہ تنظیمی، تعلیمی اور معاشی بیداری میں مسلمانوں سے آگے تھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ 1947ء کی آزادی کے بعد مسلمانوں اور ہندوؤں کی اگرچہ دو ریاستیں تو معرضِ وجود میں آ گئیں تھیں تاہم ان ریاستوں کے معاملات اور اس کے استحکام کے لیے قوم کی تیاری کے اعتبار سے دونوں ملکوں کی لیڈرشپ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

پاکستان بننے کے بعد تبادلۂ آبادی کا معاملہ آیا اور بلالحاظ مسلم لیگ اور کانگریس وہ مسلمان بھی ہجرت کر کے پاکستان آئے جنہوں نے بظاہر کانگریس کا ساتھ دیا تھا لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے دو طبقات کے لوگ موجودہ ملک پاکستان میں جمع ہو گئے تھے۔

تاریخِ عالم گواہ ہے کہ کوئی گروہ، قوم یا اجتماعیت اُٹھتی ہے اور محنت کرتی ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوتا ہے اور یہی اس کی خواہش اور مطمع نظر ہوتا ہے کہ اس کی کسی خاص علاقے میں حکومت قائم ہو جہاں وہ اپنے مخصوص نظریات کے مطابق زندگی گزارنے کے قابل ہو سکے اور دنیا کو اپنے نظریات کے ثمرات سے آگاہ کر سکے۔

مذکورہ تین صدیوں کے دوران اس کی مثال سکھ مت کی ہے۔ سکھ مت ہندو ذہن کی پیداوار ہے اور مسلمانوں اور اسلام کے غلبہ کے خلاف پہلا ردّ عمل یہی سکھ مذہب تھا اور دیگر غیر ہندو نظریات کی طرح ہندوؤں نے اسلام کے مقابلے میں بھی ہندو مسلم نظریات کا ایک ہندو ایڈیشن نکالا تا کہ ہند کے عوام کو مسلمان ہونے سے روکا جا سکے اور اس کو پروان چڑھا کر مسلمانوں ہی کے مدمقابل کر دیا، جس نے محنت کر کے پنجاب کے ایک بڑے حصے بشمول سرحدی علاقہ جات میں حکومت قائم کی اور اپنے مرضی کے مطابق ملک چلایا۔ مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا، مساجد کی کیا بے حرمتی کی یہ الگ داستان ہے۔ شاہی مسجد سکھ دور 1789ء تا 1846ء میں گھوڑوں کا اصطبل تھا، اس پورے دورِ حکومت میں نماز کی پابندی، اذان کی پابندی (سوائے ایک چھوٹی سی مسجد کے)، قرآن لے کر چلنے پر پابندی تھی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی رسومات پر پابندی کا قانون تھا۔

اسی طرح ایک مسلمانوں کا وہ حصہ جو جنگ آزادی کے وارثان یعنی تحریک دیوبند کے زیر اثر آیا اور یوں انہیں قدامت پرست مسلمان (ORTHODOX MUSLIM) کہیں یا

راسخ العقیدہ مسلمان بہرحال انہوں نے خلوص اور کوشش کے نتیجے میں شمالی مغربی علاقوں میں اپنا اثر و رسوخ دکھایا اور افغانستان میں طالبان کے نام سے حکومت قائم کر دی۔ اس حکومت کے جلد منظر سے ہٹ جانے کا سبب اور کمزوریاں بالکل الگ موضوع ہے۔

جبکہ مسلمانوں کے دوسرے حصے کا سفر سرسیّد احمد خان مرحوم کے علی گڑھ سے شروع ہوا اور جدید تعلیمی نظریات کے زیر اثر سکولوں کالجوں سے ہوتا ہوا مغربی افکار و نظریات کے زیر اثر چلا گیا۔ اسلام اور اسلامی تعلیمات سے اس طبقہ کا تعلق صرف بچپن میں ہی قرآن پاک ناظرہ پڑھ لینا یا نماز اور تلاوت کی کسی حد تک پابندی رہ گیا۔ یہ اثر بھی ایک صدی پہلے زیادہ تھا اب اوسطاً کم ہوتا جا رہا ہے۔

اس طبقہ میں سب سے بڑی شخصیت علامہ اقبال کی تھی جنہوں نے اس طبقہ کو مغربی گمراہ کن افکار و نظریات میں بہہ جانے کی بجائے قرآن مجید اور عشق رسول ﷺ کا درس دیا اور شاعری میں پیغام دیا، مسلمانوں کی زبوں حالی پر مرثیے کہے اور مسلمانوں کو جگایا تا آنکہ مسلمانانِ ہند مسلم لیگ کے پرچم تلے، قائداعظم محمد علی جناح کی زیر قیادت پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے مگر اس تحریک کی کم عمری اور اغیار کی سازشوں کی وجہ سے یہ مملکت خداداد پاکستان کو ایک مثالی جمہوری اسلامی فلاحی مملکت میں نہیں ڈھال سکے، جس کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا تھا۔ ابھی یہ سفر جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ملک پاکستان کی حفاظت فرمائے اور اسے اُس منزل سے ہمکنار کر دے جس کے لیے یہ حاصل کیا گیا تھا۔ آمین

مسلمانانِ پاکستان کی اسی کوتاہی کا ثمر ہے کہ پاکستان کے بارے میں عالمی سطح کے تجزیوں میں کبھی کہا جاتا ہے کہ پاکستان ہنوز اپنے تشخص کی تلاش میں ہے (IN SEARCH OF IDENTITY) گویا یہ بات بھی نگاہوں سے اوجھل ہے کہ پاکستان کیوں بنایا تھا۔ یا کبھی کہا جاتا ہے کہ پاکستان ایک ناکام ریاست ہے (FAILED STATE) یا پاکستان کا وجود خطرے میں ہے، حصے بخرے ہو جائیں گے۔ خاکم بدہن یہ حقیقت ہے کہ آدھا پاکستان 71ء میں ہم سے الگ ہو چکا۔

تاہم مسلمانوں کی بظاہر اس جدوجہد کی عمر ابھی ایک صدی ہے لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اگر

ہمارے اندر خلوص تھا اور خلوص ہے تو ان شاء اللہ اگلے 40-50 سال میں (گویا پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے سو سال بعد) یہاں ایک اسلامی جمہوری فلاحی ریاست کا آغاز ہو گا جو ٹھوس اور مثبت بنیادوں پر قائم ہو گی اور پھر ہر دوسرے نافع نظریہ کی طرح نوعِ انسانی کے دل کی آواز بن کر عالمی ریاست کا رُوپ دھار لے گی یہ بات مستقبل کا مؤرّخ ہی طے کرے گا۔

ذرا زیادہ گہرائی میں جائیں! مسلمانانِ ہندو پاک کی احیائی و تجدیدی مساعی کی تاریخ ایک لحاظ سے گزشتہ چار صدیوں پر محیط ہے اور حضرت شیخ احمد سرہندیؒ، شیخ عبدالحقؒ محدث دہلوی، اورنگزیب عالمگیرؒ اور شاہ ولی اللہؒ، تحریک شہیدین اور شہدائے جنگ آزادی کے علاوہ حضرت شیخ محمود حسنؒ، علامہ اقبال اور دیگر رہنماؤں کے اسمائے گرامی لیے جاسکتے ہیں۔ اس جدوجہد میں اسلام کو سمجھنے اور اس کو عصر حاضر میں پیش کرنے کے اعتبار سے دو دھارے علیحدہ علیحدہ کام کرتے نظر آتے ہیں۔

ایک دھارا روایتی علماء، بنواُمیہ اور بنو عباس کے دور کے نظریات اور فقہ اسلامی کی من وعن تقلید اور علمِ ہندسہ اور علمِ ہیئت کے سابقہ اُصول اور نظریات کے مطابق قرآن وحدیث کی تشریحات اور فلسفہ معاشرت وتمدن کا حامل نظر آتا ہے، ان کے نزدیک نفاذِ اسلام کا مطلب حدود اللہ کا قیام اور نظامِ صلوٰۃ وزکوٰۃ کا قیام ہے اور یہی اسلام کے غلبہ اور اِظہارِ دین کے مترادف ہے چنانچہ فتاویٰ عالمگیری، تحریک شہیدین، تحریک آزادئ ہند میں جمعیت علماء ہند کا نقطۂ نظر اور عصر حاضر میں طالبان کی حکومت کا قیام اسی سوچ کا مظہر ہے اور گویا اس سوچ کے حاملین کے خلوص واخلاص کا ثمر ہے کہ وہ ایک عارضی ریاست کے قیام پر منتج ہوا ہے۔ اسی سوچ کے حامل قدیم علماء کی مساعی کا ایک دوسرا مظہر عالم عرب میں شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی حکومت میں شرکت کے اصول کے تحت کامیابی ہے جس میں اسلام کی کچھ حدود کا نفاذ ہے اور شرک وبدعت کا خاتمہ ہے۔

ان چار صدیوں کی جدوجہد کا دوسرا دھارا اس جدوجہد کے ساتھ ساتھ مرج البحرین کی سی شان سے چلتا آ رہا ہے اور اوپر درج شدہ عظیم مجدّدین ملت کی اَنتھک مساعی میں اسلام کی روح اور قرونِ اولیٰ (پہلی صدی ہجری تک، جن کی فضیلت خود لسانِ رسالت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے بیان

ہوئی ہے) کی شاندار روایت، خالص عربی ثقافت اور شانِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مظہر رہی ہے۔ گویا قیامِ پاکستان کی جدوجہد کی تاریخ بھی چار صدیوں پر محیط ہے اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے اس دوسرے دھارے کی جدوجہد میں بھی اکابرینِ ملّت اور مجدّدینِ اُمت کی کاوشوں کو فیصلہ کن عامل کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ پاکستان کی جدوجہد میں:

مجدّد الف ثانیؒ کی تجدیدی شان۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی اطاعت واتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبے کا احیاء۔

اورنگ زیب عالمگیر کی اسلامی قانون کی تدوین وتنفیذ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سادگی اور زورِ حیدری کا رنگ۔

شاہ ولی اللہؒ کی وسعت نگاہ اور عمرانی اور سیاسی مسائل پر توجہ۔

فتح علی سلطان ٹیپو کی استقامت۔

سر سیّد احمد خان کی ملت اسلامیہ کے لیے بے قراری۔

شیخ محمود حسن کی علی گڑھ تشریف آوری سے اس دھارے میں اسلامی رنگ کا ظہور۔

تحریک خلافت کی امانت۔

علامہ اقبال کا مغربی سائنسی ترقی کو ایمان کی تفسیر اور قرآن کے عین مطابق قرار دینا، ملّی اور دینی جذبات کی آبیاری اور اسلام کے عالمی غلبے کی نوید۔

جوہر برادران کا ملّی جذبہ۔

قائداعظم کی ژرف نگاہی اور دوقومی نظریہ کی بے لوث وکالت۔

مولانا شبیر احمد عثمانی اور ظفر احمد عثمانی کا خلوص واخلاص اور اکابرین وقائدین ملت، صوفیائے عظام پاک وہند کی شب کی آہوں اور سحری کے آنسوؤں اور ملت اسلامیہ کے گمنام مرد وخواتین شہداء کے خون کی لالی ـــ شامل ہے جس کے نتیجہ میں پاکستان کی مملکت خداداد معرضِ وجود میں آئی اور یقیناً ع روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

کی طرح آج پاکستان اپنی 'روح' اور شناخت، نظامِ عدل وقسط، اسلامی سیاسی سماجی معاشی عدل کے اصولوں پر ہر قسم کے استحصال سے پاک معاشرے کی تدوین اور تعمیر کے لیے شکست وریخت

کے عمل سے گزر رہا ہے اور چونکہ اس میں مسلمانوں کے دوسرے دھارے کے تصورِ اسلام سے فکری بُعد اور کہیں تعبیراتی اختلافات کا مسئلہ درپیش ہے اس لیے نئی تعمیر کے لیے پرانے تصورات کی ویرانی اور صفائی اس میں کہیں کہیں روایتی علماء اور فکری وارثانِ تحریک پاکستان میں ٹکراؤ کی شکل پیدا ہو جاتی ہے، جوان شاء اللہ عارضی اور مبنی بر غلط فہمی ہونے کی وجہ سے جلد رفع ہو جائے گی۔

اسی جدوجہد کا منطقی نتیجہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت للعالمینی کا ظہور اور انسانیت کے لیے کامل مساوات، معاشی عدل اور سیاسی جبر سے پاک معاشرے کا قیام اور غیر مسلموں کے مکمل تحفظ کی گارنٹی یعنی جدید عالمی اسلامی جمہوری مثالی عوامی ریاست کا قیام ناگزیر ہے جو دنیا کے تمام ذہین عناصر اور فہیم طبقات کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لے گی اور وہ دن مسلمانوں کی نہیں اولادِ آدم اور انسانیت کی فتح کا دن ہوگا۔

جنوبی ایشیا میں گزشتہ تین صدیوں میں برطانوی سامراج کی آمد اور اس سے آزادی کا دوسرا فریق ہندو تھا، جو شہنشاہ اکبر (مرتد) کے دور سے بھی دو صدیاں پہلے بیدار ہو چکا تھا اور کئی نشیب و فراز گزار کر 1947ء تک پورے طور پر ایک منظّم قوم کی حیثیت اختیار کر گیا تا آنکہ آزادی کے وقت ہندو ملک سنبھالنے کے پوری طرح اہل تھے۔

آیئے دیکھتے ہیں دیگر اقوام کی طرح جب ہندو کو اقتدار ملا اور آزادی کے ساتھ اکثریت بھی اور بیداری بھی، تو اس نے اپنے ملک کو اپنے نظریات کے مطابق ایک ریاست بنانے کا مقصد کیسے اور کہاں تک حاصل کیا۔

مثالی ہندو جمہوری فلاحی ریاست

مثالی ہندو جمہوری فلاحی ریاست پر کچھ شواہد سامنے لانے سے پہلے ایک بنیادی بات پیش نظر رکھنا ضروری ہے ورنہ اکثر شدید خلط مبحث واقع ہو جاتا ہے اور گوہر مقصود ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ وہ اہم بات یہ ہے کہ ہندومت یا دیگر مذاہب عالم (ماسوائے اسلام) کے پاس مذہبی تعلیمات کا جو بھی کچھ مواد تحریری، زبانی یا روایات کی شکل میں موجود ہے اس کے مطابق انسانی زندگی کے انفرادی گوشوں کو کسی حد تک رہنمائی ملتی ہے اور کم ازکم اس حد تک دوسرے مذاہب سے

تقابل اور EVALUATION کے لئے پیش بھی کیا جاسکتا ہے۔ تاہم ان مذاہب میں انسانی معاشرہ کے اجتماعی گوشوں از قسم معاشرتی یا سماجی، اقتصادی یا معاشی اور سیاسی یا ریاستی پہلوؤں پر بہت کم رہنمائی میسر ہے۔ یہ صورتحال ان مذاہب کے اکابرین کو بھی معلوم ہے، لہٰذا (اسلام کے سوا) تمام مذاہب نے اس معاملے میں ایک متفقہ لائحۂ عمل (UNDERSTANDING) یہ طے کرلیا ہے کہ اجتماعی گوشوں میں اپنے مذہب کی رہنمائی کے فقدان کو اسی بات سے پورا کرلیا جائے کہ یہ گوشے SECULAR بنیادوں پر چلائے جائیں اور ان میں مذہب اور آسمانی ہدایت یا وحی یعنی REVEALED KNOWLEDGE کے عمل دخل کو آہستہ آہستہ مفقود کردیا جائے تا کہ انسانی مزاج ہی SECULAR اور 'لادین' قسم کا بن جائے جس میں دین کا عنصر نہ ہونے کے ساتھ دین بیزاری اور دین سے فرار کا پہلو غالب رہے۔ اس معاملے میں غیرمسلم دنیا تقریباً متفق ہے اوراس پر CONSENSUS رکھتی ہے کہ مذہب یا RELIGION کو ایک انفرادی فعل اور خدا اور بندے کا PRIVATE AFFAIR بنادیا جائے اوراس طرح کی ریاست کو عالمی سطح پر آشیر باد بھی حاصل ہو اور باہمی تعاون بھی، اس لئے کہ اس طرح کی ریاست اپنے تمام تر مذہبی رنگ (RELIGIOUS TOUCH) کے باوجود اپنے اندازِ حکمرانی میں ایک جیسی ہوں گی، اس قسم کی حکومت کو SECULAR کا نام دیا گیا ہے۔ اور یوں شعوری یا غیرشعوری طور پر اور بالارادہ اسلام کے عالمی اجتماعی نظامِ عدل وقسط کے خلاف ایک WELL-PLANNED راستہ بنایا گیا ہے تا کہ اسلام اور دوسرے الفاظ میں اسلام کے عدلِ اجتماعی کا راستہ روکا جاسکے اور حکمرانوں کی لوٹ کھسوٹ کے ساتھ وسائل اور حکومتوں پر ناجائز قبضہ قائم ودائم رہے۔

اس پس منظر میں ہندو نقطۂ نظر سے عہد اکبری سے آج تک جو اجتماعی کامیابیاں حاصل کی گئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

انفرادی اور مذہبی گوشے میں عقائد (DOGMAS) وعبادات (MODES OF WORSHIP) اور مذہبی رسومات (RITUALS) سے دیکھیں تو ہندو نقطۂ نظر آج کل کوئی

ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے بلکہ انٹرنیٹ پر میسّر ہونے کی وجہ سے ہر شخص کی دسترس میں ہے اس پر کوئی علمی تنقید یا بحث اس مضمون کا موضوع نہیں ہے تاہم چند اہم تاثرات جو اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں وہ ضرور پیشِ خدمت ہیں:

- بیوہ عورتوں کے ستی ہونے (شوہر کے ساتھ اپنے آپ کو زندہ جلا لینے) کی رسم۔
- غیر ہندو اقلیتوں پر حملے اور اس کے مذہبی معاملات میں مداخلت۔

(i) عیسائیوں کے ساتھ غیر انسانی رویہ اور ان کا قتل۔

(ii) مسلمانوں کے ساتھ فسادات کا معاملہ اور مسلمانوں کی نسل کُشی کے منصوبے، عبادت گاہوں بالخصوص بابری مسجد وغیرہ کی بے حرمتی۔ بمبئی اور احمد آباد کے فسادات وغیرہ مسلمانوں کی مسجد حیدر آباد پر حملہ۔

- مسلمانوں کے لئے مذہبی جبر اور 20% آبادی ہونے کے باوجود ملازمتوں، کاروبار، فوج، عدلیہ میں مسلمانوں کی نہ ہونے کے برابر نمائندگی، سکولوں میں مسلمانوں کو زبردستی ہندو تہوار اور رسوم ادا کرنے پر مجبور کرنا، ہندو انتہا پسند تنظیموں کا نعرہ 'مسلمانوں کے دو استھان پاکستان یا قبرستان' وغیرہ وغیرہ۔

اجتماعی معاملات میں بھارت کے 60 سال کی جدوجہد کے تناظر میں حصول مقصد کی طرف جو اقدامات ہوئے اس کا ایک خلاصہ پیشِ خدمت ہے جس سے اہل علم و دانشور حضرات آئندہ چند دہائیوں کا نقشہ خود نگاہوں کے سامنے لا سکتے ہیں۔

کامیابیاں

- 1947ء کے بعد آئین کی تیاری اور منظوری۔
- جاگیرداری کا کسی حد تک خاتمہ۔
- سیکولر سٹیٹ کا اعلان اور اقلیتوں کو حقوق دینے کا وعدہ۔
- جمہوریت کا قیام اور تسلسل۔
- حکومتی اداروں کا قیام اور ان کا باہمی اشتراک کے ساتھ کام کرنا۔
- جمہوری اقدار کی پرداخت و نگہداشت اور سیاسی استحکام۔

- معاشی ترقی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے شعبے میں مغرب کا مقابلہ۔

ناکامیاں

- قیام ملک کے ساتھ ہی پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے والی ریاست حیدرآباد پر قبضہ اور استحصال۔
- پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے والی ریاست جوناگڑھ پر ناجائز قبضہ اور استحصال۔
- UNO میں وعدے کے باوجود کشمیریوں کو حقِ خود ارادیت نہ دینا۔
- اقلیتوں کے ناک میں دم کر دینا خصوصاً مسلمانوں پر ظلم وستم اور مختلف حیلوں بہانوں سے ان کے کاروبار تباہ کرتے رہنا۔
- ہندو انتہا پسند تنظیموں کا فروغ اور مسلمانوں پر حملے۔
- مسلمانوں کے حقوق، کاروبار، شہری آزادیوں کا بری طرح تعطل۔
- سرکاری ملازمتوں اور کارپوریشنوں میں مسلمانوں کو ملازمتیں نہ دینے کا معاملہ۔
- پڑوسیوں بالخصوص پاکستان کے ساتھ جارحانہ رویہ اور پاکستان کو دل سے تسلیم نہ کرنا۔
- مشرقی پاکستان کو عالمی مشن کے ذریعے بنگلہ دیش بنانے میں بنیادی کردار ادا کرنا۔
- معاشی بدحالی اور کسانوں کی خودکشیوں کی طویل فہرست۔
- عورت کا استحصال۔
- تعلیم کا فقدان۔
- مراعات اور سہولتوں کا اعلیٰ طبقات تک محدود ہونا۔ اور ملک میں سرمایہ دارانہ نظام کا فروغ اور غلبہ۔
- ذات پات کی تمیز اور مساواتِ انسانی کا مذاق۔
- انسانی حقوق کی دھجیاں بکھیر دینا اور غیر ہندو اقلیتوں کو ہندو بنانے کا منصوبہ۔
- ملک کی 40% آبادی کا خط غربت (POVERTY LINE) سے نیچے زندگی بسر کرنا۔
- پڑوسیوں کے معاملات میں مداخلت۔ سری لنکا، نیپال، بھوٹان اور پاکستان، سب سے کشیدہ حالات اور ان کو مسلسل دباؤ میں رکھنا۔

- علاقے میں کسی بڑے دشمن کے سامنے نہ ہونے کے باوجود ایٹمی ہتھیاروں میں پہل کرنا اوراس کے انبار لگا دینا جبکہ عوام بنیادی حقوق تک سے محروم ہوں۔

نتیجتاً یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ:

بھارت بے شمار کامیابیوں کے باوجود ایک جمہوری ریاست سہی ایک فلاحی ریاست کا ابھی نام بھی لینے کی پوزیشن میں نہیں اور غریب عوام کے لئے ملکی وسائل کا کوئی حصہ نہیں بلکہ سارے وسائل صرف اعلیٰ طبقات کی لوٹ کھسوٹ کا میدان ہے۔

بھارت کی طرف سے ممکنہ دفاع میں صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس طویل اجتماعی نشأۃ ثانیہ کے لئے ساٹھ سال کا عرصہ کم ہے اور آئندہ دہائیوں میں یہ کام مکمل ہو جائے گا۔ لہٰذا یہ بات نوشتۂ دیوار ہے کہ قوموں اور تہذیبوں کا قانونِ عروج و زوال اَٹل حقیقت ہے اور اس سے مسلمان، ہندو، یورپی اور امریکی حکومتیں بھی مستثنیٰ نہیں ہیں کہ عصر حاضر میں جو اجتماعیت اپنے عوام کو اجتماعی عدل و انصاف، مساوات اور اظہارِ رائے کی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کا احساس فراہم نہیں کرسکتی وہ جلد یا بدیر مایوسیوں کے گہرے بادل چھوڑ کر صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ یہ دنیا MIGHT IS RIGHT کے اصول کے تحت ایک MINUTE MINORITY کے ہاتھوں میں کھلونا ہے اور وہی اس کے وسائل پر قابض ہیں اور عدل و انصاف اور آزادیٔ مساوات کے دشمن ہیں اس لئے ایسی حکومتوں کو برداشت نہیں کرسکتے جو ان اعلیٰ اقدار کی علمبردار ہوں۔ تاہم کسی حکومت کا ان اعلیٰ اجتماعی اقدار کے قیام کے لئے جدوجہد اور مسلسل محنت کے بعد کامیابی سے ہمکنار ہونا اور اس کا ایک قابل ذکر عرصے تک باقی رہ جانا یہ بالکل دوسری بات ہے اور بالکل جدوجہد ہی نہ کرنا اور اس کا کوئی عندیہ اور ایجنڈا اور نقشہ ہی اہل علم و دانشور حضرات کے سامنے نہ ہونا، یہ ناکامی کا ہی دوسرا نام ہے۔

بھارت نے بھی اگر آئندہ تین چار دہائیوں میں اپنے ملک کے باسیوں کو ان اعلیٰ اجتماعی اقدار کے حوالے سے اپنے ہندو غریب محنت کش عوام اور بالخصوص اقلیتوں کے احساسِ محرومی کا بھرپور اِزالہ نہ کیا تو خود ہندوؤں کی آئندہ نسلیں اس بات سے اتفاق کریں گی کہ ہندو

مذہب کے پاس انسانی فلاح کا کوئی پروگرام نہیں ہے اورعوام میں تو مایوسی ہی مایوسی کا سایہ رہے گا ELITE طبقہ کسی دوسرے قابل عمل اور انسانی حقوق کے ضامن JUST POLITICO-SOCIO-ECONOMIC SYSTEM اور عدل ومساوات کے علمبردار مذہب اور دین کی طرف چل کھڑے ہوں گے اور تاریخ برعظیم پاک وہند ایک نیا موڑ لے رہی ہوگی۔ ہو بہو ایسا ہی موڑ ہندوستان کے باسیوں نے غوری وغزنوی کے دور میں بھی مقامی ہم مذہب راجاؤں کے ظلم وستم سے نجات کے لیے لیا تھا اور کہیں تاریخ گھوم کر دوبارہ اسی مقام کی طرف نہ آ جائے۔ اس وقت یہ کام عوامی سطح پر ہوا تھا اور اب شاید یہ کام ملک کے تعلیم یافتہ، مراعات یافتہ اور ELITE طبقہ یعنی برہمن کے اجتماعی اسلام پر منتج ہو کہ ع انقلابِ دوراں ہم نے یوں بھی دیکھے ہیں

تاہم ـــــ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ دنیا میں انسان کی طرح انسانوں کی اجتماعیت یعنی قوموں، نسلوں، حکومتوں، نظریات اور تہذیبوں کی بھی ایک زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ مواقع ہر قوم کو دیتا ہے، عروج ہوتا ہے، حکومت بن جاتی ہے، کسی خاص خطہ زمین میں اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر انہیں لوگوں کی دوسری تیسری نسل میں ایسے لوگ سامنے آتے ہیں جو ظلم، ناانصافی، لوٹ کھسوٹ، نسلی، لسانی اور مذہبی امتیاز روا رکھتے ہیں اور نتیجتاً صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے ہیں۔ یہ اصول خالق کائنات کا اتنا اٹل اصول ہے کہ اس سے کافر اور غیر مسلم تو کیا کوئی مسلم معاشرہ اور اجتماعیت بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔

اسی دنیا میں قومیں اور تہذیبیں کچھ انسان دوست اصول اور محنت و دیانت کا جذبہ لے کر اُٹھتی ہیں اور بے اصول، کمزور، ظالم اور انسانی تحقیر اور امتیازات کے حامل معاشروں کو بہا کر لے جاتی ہیں مگر صدی دو صدی بعد وہ خود ایسے ہی خود غرضانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتی ہیں اور کسی اور بااصول اور نوخیز اجتماعیت یا تہذیب کے ہاتھوں فنا ہو جاتی ہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی بااُصول، دیانت اور امانت پسند اجتماعیت اپنے قدم جمانے کی فکر کرتی ہے مگر گردوپیش کے ظالم معاشرے اور غالب تہذیبیں ایسی نوزائیدہ خیروبرکت والی اجتماعیت کو اپنے لیے 'موت کا پیغام' سمجھ کر اس کو نیست ونابود کر دیتے ہیں۔

مستقبل کے حالات تو اللہ تعالیٰ خالق کائنات ہی بہتر جانتے ہیں یا کسی قدر وہ

اہل علم جانتے ہیں جن کی عقابی نگاہیں حالات کو اس اعلیٰ مقام سے دیکھ رہی ہیں۔ تاہم یہ بات علی الاعلان کہی جاسکتی ہے کہ اگر پاکستان اور اہل پاکستان کا وہ طبقہ جو جنگ آزادی کے بعد جدید تعلیم سے روشناس ہوا اور قدیم و جدید اسلامی رنگ کا حامل ہے اور اس کی جدوجہد علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد سے گزر کر مسلم لیگ کے ذریعے سے قیام پاکستان پر منتج ہوئی تھی اگر قیام پاکستان کے مشن کو سینے سے لگا کر اور بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کے اسلامی ذہن کو لے کر آگے چلتا ہے اور ایک مثالی اسلامی جمہوری فلاحی ریاست بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے...... جس کی طرف صرف ایک اشارہ کافی ہے۔ فرمایا مصورِ پاکستان علامہ اقبال نے:

"I WOULD LIKE TO SEE THE PUNJAB. THE NORTH-WEST FRONTIER PROVINCE, SINDH AND BALUCHISTAN AMALGAMATED INTO A SINGLE STATE. SELF-GOVERNMENT WITHIN THE BRITISH EMPIRE OR WITHOUT THE BRITISH EMPIRE, THE FORMATION OF A CONSOLIDATED NORTH WEST-INDIAN MUSLIM STATE APPEARS TO ME TO BE THE FINAL DESTINY OF THE MUSLIMS, AT LEAST OF NORTH-WEST INDIA."

''میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو متحد ہو کر ایک واحد ریاست کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں، جس کی اپنی حکومت ہو خواہ سلطنتِ برطانیہ کے تحت یا اس سے الگ اور مجھے نظر آ رہا ہے کہ یہ متحدہ شمال مغربی مسلم ریاست کم از کم شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے تقدیر مبرم ہے۔''

"I THEREFORE DEMAND THE FORMATION OF A CONSOLIDATED MUSLIM STATE IN THE BEST INTERESTS OF INDIA AND ISLAM."

''لہٰذا میں ہندوستان اور اسلام کے بہترین مفاد میں ایک الگ مسلم ریاست کے بنانے کا مطالبہ کرتا ہوں۔''

"FOR ISLAM (IT WILL BE) AN OPPORTUNITY TO RID ITSELF OF THE STAMP THAT ARABIAN

IMPERIALISM WAS FORCED TO GIVE IT, TO MOBILIZE ITS LAWS, ITS EDUCATION, ITS CULTURE AND TO BRING THEM INTO CLOSER CONTACT WITH ITS OWN ORIGINAL SPIRIT AND WITH THE SPIRIT OF THE MODERN TIMES."

''اسلام کے لئے یہ ایک موقع ہوگا کہ عرب ملوکیت کے تحت اس پر جو پردے پڑ گئے تھے ان سے چھٹکارا حاصل کر سکے اور اپنے قوانین، تعلیمات اور ثقافت کو اپنی اصل روح کے ساتھ روحِ عصر سے ہم آہنگ کر سکے۔''

اور فرمایا بانی پاکستان محمد علی جناح نے:

GOD HAS GIVEN AN OPPORTUNITY TO BE ARCHITECTS OF A NEW NATION AND LET IT NOT SAID WE DID NOT PROVE EQUAL TO THE TASK.
(KARACHI 11 OCTOBER 1947)

مفہوم: ''خالق کائنات نے ہمیں ایک نئے ملک، ایک نئی تہذیب، ایک نئی قوم کی تعمیر کا موقع فراہم کیا ہے اور ہمیں اس کے لئے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے کہیں مستقبل کا مؤرخ یہ لکھنے پر مجبور نہ ہو کہ ہم اس کام کے اہل ثابت نہ ہوئے''۔

اور دنیا کو اعلیٰ حکومتی لیول پر حریت، آزادی، مساوات اور کفالت عامّہ کے تصورات کا چلتا پھرتا نمونہ پیش کر دیتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس وقت ساری دنیا اس کی طرف متوجہ نہ ہو جائے۔

اُوپر درج کردہ تمام گزارشات میں براہِ راست تذکرہ ہندو اور مسلم تہذیبوں اور سوچ کا ہے جبکہ ان تین صدیوں پر پھیلی ہوئی جدوجہد کا ایک تیسرا فریق بھی تھا اور وہ تھا 'یورپی مسیحی استعمار' جس کا نمائندہ برطانیہ تھا اور جو پہلے تجارتی انداز میں ایک تجارتی کمپنی ایسٹ انڈیا کمپنی (E.I.C) کے نام سے آیا اور پھر برطانوی شہنشاہیت کے زیر سایہ ملک کو فتح کر لیا۔

اس ملک برطانیہ اور اس کے عالمی مسیحی استعمار پر گزشتہ تین صدیوں میں کیا گزری وہ بھی دنیا کے اصول عروج و زوال سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس برطانیہ کا مختصر تذکرہ بھی قارئین کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

◉ اٹھارھویں صدی میں برطانیہ (اور دیگر یورپی اقوام) تمام دنیا پر بحری قبضہ کر چکی تھیں اور بہت سے علاقوں پر در پردہ برّی قبضے کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔

◉ یورپی مسیحی استعمار جو صہیونیت کے اشاروں پر چل رہا تھا اس کا یہ عالمی حکومت کا بنانا اور ہماری دنیا پر قبضہ کس طرح ہوا اس کا تذکرہ سیموئیل پی ھنٹنگٹن نے "CLASH OF CIVILIZATIONS" نامی کتاب میں کیا ہے، جس کا اقتباس پیش خدمت ہے:

''......1500ء سے 1750ء کے درمیانی عرصے میں پہلی عالمی سلطنت کو قائم کرنے میں مغرب والوں کی کامیابی کا دارومدار ان کی جنگی استعداد میں اضافے پر تھا جس کو ''فوجی انقلاب'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ مغرب نے دنیا کو اپنے نظریات یا اقتدار یا مذہب میں برتری کی وجہ سے فتح نہیں کیا تھا بلکہ اس وجہ سے فتح کیا تھا کہ منظّم تشدد کرنے میں اس کو برتری حاصل تھی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کو مغرب کے لوگ تو بھول جاتے ہیں لیکن غیر مغربی لوگ فراموش نہیں کرتے۔''

◉ اُنیسویں صدی عیسوی میں علمی ترقی، نئی ایجادات اور جنگی صلاحیت کے جلو میں وہ ہندوستان اور عثمانی سلطنت کے ساتھ ساتھ ساری دنیا پر عملاً قابض ہو چکا تھا۔ کہیں فرانسیسی اور ولندیزی تھے بھی تو ان کی سوچ اور تہذیب ایک ہی تھی۔

◉ بیسویں صدی کے آغاز میں برطانیہ کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا تاہم پہلی جنگ عظیم 18-1914 اور دوسری جنگ عظیم 45-1939 کے بعد برطانیہ کی قسمت کا ستارہ ڈوبنا شروع ہوا اور عالمی استعمار کی باگ دوڑ ظاہراً امریکہ اور در پردہ UNO، IMF اور WB کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

◉ مسیحی یورپی استعمار چونکہ نادیدہ قوتوں کے زیر اثر رہا ہے لہٰذا برطانیہ کے کمزور ہونے پر ان نادیدہ قوتوں نے اپنا دستِ شفقت امریکہ پر رکھ دیا اور اب ساٹھ سال بعد شاید یہ دستِ شفقت یورپی یونین پر رکھا جانے والا ہے۔ تاہم اس مغربی تہذیب کی بھی چھ صدیوں کی داستانِ عروج اب انجام کو پہنچنے والی ہے۔

2 اُمت مسلمہ کی بیداری ___ ایک صدی کا سفر

اُمّت مُسلمہ کی کامیابیاں

آج کی اس مایوسی کی فضا میں حالات کا مثبت اور روشن پہلو بھی دیکھیں تو ایک روشن باب یہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں جب سارا عالم اسلام مغربی تسلط میں چلا گیا، اس ماحول میں 1947ء میں فوجی نہیں سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں ایک تقسیم سے پاکستان ایک اسلامی سلطنت بن کر اُبھرا اور اس کے بعد جیسے کوئی مالا ٹوٹتی ہے اور اس کے دانے تیزی سے گرتے ہیں، عالم اسلام کے ممالک یکے بعد دیگرے آزاد ہوتے چلے گئے اور آج 60 کے لگ بھگ آزاد مسلمان ممالک ہیں۔

قوموں کی زندگی میں نصف صدی کوئی لمبی مدت نہیں ہے۔ اس مختصر عرصے میں عالم اسلام کا مغربی سامراجی قوتوں سے آزادی حاصل کر لینا ہی ایک معجزے سے کم نہیں۔ ذیل میں ہم مسلمان ممالک کے نام اور تاریخ آزادی کا گوشوارہ شائع کر رہے ہیں تاکہ یاد رکھنے میں آسانی ہو۔

دنیائے اسلام............ایک نظر میں

نمبر شمار	نام ملک	آبادی (ملین میں)	رقبہ مربع کلومیٹر (ہزار میں)	آزادی کا دن یا سال
1	لبنان	2.80	10.40	22 نومبر 1943ء
2	شام	13.7	185	یکم جنوری 1944ء

3	البانیہ	2.5	28	1944ء
4	انڈونیشیا	191.7	1905	17 اگست 1945ء
5	اُردن	4.9	98	25 مئی 1946ء
6	پاکستان	132.9	796	14 اگست 1947ء
7	عمان	2.0	212	20 اکتوبر 1951ء
8	لیبیا	5.0	1759	24 دسمبر 1951ء
9	ایتھوپیا	33.0	1780	1952ء
10	مصر	60.3	1001	1952ء
11	سوڈان	26.6	2506	یکم جنوری 1956
12	تیونس	8.6	164	20 ستمبر 1956ء
13	ملائیشیا	19.2	330	31 اگست 1957ء
14	مراکش	26.0	447	2 مارچ 1956ء
15	عراق	19.5	438	جولائی 1958ء
16	گنی	6.3	246	2 اکتوبر 1958ء
17	صومالیہ	9.0	638	یکم جنوری 1960ء
18	کیمبرون	12.5	475	یکم جنوری 1960ء
19	ٹوگو	2.8	56	27 اپریل 1960ء
20	بینن	5.1	113	یکم اگست 1960ء
21	برکینافاسو	9.8	274	5 اگست 1960ء
22	نائیجر	8.8	1267	3 اگست 1960ء
23	آیوری کوسٹ	9.29	319	7 اگست 1960ء

11اگست1960ء	1284	6.0	چاڈ	24
13اگست1960ء	626	2.5	وسطی افریقہ	25
17اگست1960ء	268	1.2	گیبون	26
20اگست1960ء	197	7.9	سینی گال	27
22 ستمبر1960ء	1240	10.1	مالی	28
یکم اکتوبر1960ء	924	105.3	نائیجریا	29
28نومبر1960ء	1026	2.2	مریطانیہ	30
27اپریل1961ء	72	4.3	سیرالیون	31
19 جون1961ء	18	1.8	کویت	32
9دسمبر1961ء	945	28.0	تنزانیہ	33
5جولائی1962ء	2382	26.7	الجزائر	34
9اکتوبر1062ء	241	19.9	یوگنڈا	35
18فروری1965ء	11	1.0	گیمبیا	36
26جولائی1965ء	0.3	0.2	مالدیپ	37
30نومبر1967ء	527	16.0	یمن	38
16دسمبر1971ء	114	115.2	بنگلہ دیش	39
25جون1971ء	802	15.1	موزمبیق	40
15اگست1971ء	0.68	0.5	بحرین	41
2دسمبر1971ء	84	1.8	متحدہ عرب امارت	42
3دسمبر1971ء	11.0	0.5	قطر	43
10 ستمبر1974ء	36	1.0	گنی بساؤ	44

45	کمورو	0.6	2.23	6 جولائی 1975ء
46	جبوتی	0.6	23.2	27 جون 1977ء
47	ایران	64.2	1633	1979ء
48	برونائی دار السلام	0.33	5.8	یکم جنوری 1984ء
49	قازقستان	17	2717	16 اگست 1991ء
50	تاجکستان	5.8	143	26 اگست 1991ء
51	آذربائجان	7.4	87	30 اگست 1991ء
52	کرغستان	4.6	198	31 اگست 1991ء
53	ازبکستان	21.9	447	31 اگست 1991ء
54	ترکمانستان	3.9	488	26 اکتوبر 1991ء
55	بوسینیا ہرزیگوینیا	3.5	51	دسمبر 1991ء

اس کے علاوہ افغانستان (17.7 ملین) سعودی عرب (171 ملین) ترکی (59.6 ملین) پہلے سے آزاد ممالک تھے۔ ان آزاد ممالک کے علاوہ مسلمان دنیا بھر کے کئی ممالک میں بطور اقلیت موجود ہیں اور آزادی کے منتظر ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

مسلم اقلیتیں۔ مختلف ممالک میں

نمبر شمار	نام ملک	کل آبادی	مسلم آبادی
01	آسٹریلیا	2 کروڑ	3 لاکھ
02	اٹلی	5 کروڑ، 70 لاکھ	8 لاکھ
03	ارجنٹائن	3 کروڑ، 70 لاکھ	7 لاکھ
04	اسپین	4 کروڑ	2 لاکھ
05	امریکہ	27 کروڑ۔ 30 لاکھ	80 لاکھ

06	برطانیہ	5 کروڑ۔95لاکھ	35لاکھ
07	برما(میمنار)	4 کروڑ۔80لاکھ	36لاکھ
08	بلغاریہ	83لاکھ	14لاکھ
09	بھارت	ایک ارب۔10لاکھ	18 کروڑ
10	بلجیم	ایک کروڑ۔5لاکھ	ڈھائی لاکھ
11	تائیوان	2 کروڑ۔20لاکھ	2لاکھ
12	تھائی لینڈ	6 کروڑ۔5لاکھ	26لاکھ
13	ٹرینڈاداورٹوباگو	11لاکھ	2لاکھ
14	جاپان	12 کروڑ۔70لاکھ	3لاکھ
15	جارجیا	51لاکھ	12لاکھ
16	جرمنی	8 کروڑ۔20لاکھ	15لاکھ
17	جنوبی افریقہ	4 کروڑ۔35لاکھ	ایک لاکھ
18	چین	ایک ارب۔25 کروڑ	بارہ کروڑ
19	روس	15 کروڑ	40لاکھ
20	زیمبیا	95لاکھ	30لاکھ
21	سری لنکا	ایک کروڑ۔95لاکھ	15لاکھ
22	سنگاپور	35لاکھ	6لاکھ
23	فرانس	5 کروڑ۔95لاکھ	30لاکھ
24	فلپائن	7 کروڑ۔90لاکھ	60لاکھ
25	کانگو	5 کروڑ	50لاکھ
26	کینیا	2 کروڑ۔90لاکھ	55لاکھ

10لاکھ	3 کروڑ	کینیڈا	27
7لاکھ	28لاکھ	لائبیریا	28
2لاکھ	25لاکھ	ماریشس	29
18لاکھ	ایک کروڑ۔50لاکھ	مڈغاسکر	30
7لاکھ	21لاکھ	مقدونیہ	31
21لاکھ	ایک کروڑ	ملاوی	32
7لاکھ	2 کروڑ۔40لاکھ	نیپال	33
4لاکھ	7 کروڑ۔60لاکھ	ویت نام	34
4لاکھ	ایک کروڑ۔60لاکھ	ہالینڈ	35
45لاکھ	2 کروڑ۔25لاکھ	یوگنڈا	36
22لاکھ	ایک کروڑ۔5لاکھ	یوگوسلاویہ	37
4لاکھ	ایک کروڑ۔8لاکھ	یونان	38

(یہ اعداد و شمار ''شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا'' سے اخذ کیے گئے ہیں)

عالم اسلام کی ان کامیابیوں کے ضمن میں پیش رَفت اور ناکامیوں میں اضافہ کا ملا جلا احساس ہے جو گزشتہ نصف صدی سے مسلمانوں میں بیک وقت موجود ہے۔اس کا تذکرہ یہاں شامل نہیں ہے۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

3 مفکّرِ پاکستان حضرت علامہ اقبال کے نام مصنّف کا ایک تصوّراتی خط

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرَّحیم

بخدمت بزرگوار علامہ محمد اقبال مسرور وشگفتہ باشید

مضمون: سوسال بعد آپ کا ایک انقلابی VISIONARY ہونے کا اعتراف

السّلام علیکم و رحمۃ اللّٰہ

01۔ اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ آپ عالم برزخ میں اپنی مرقد منور میں آرام سے ہوں گے آپ کی مرقد جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہوگا جو بے پناہ وسعتوں کا حامل ہوگا۔

02۔ آپ کے کلام سے جذبہ حاصل کرنے والے خوش نصیب لوگوں میں سے ایک ان سطور کا راقم بھی ہے۔ کافی عرصے سے خواہش تھی کہ آپ سے رابطہ کر کے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے حالات آپ کے سامنے رکھوں مگر مناسب ماحول اور مناسب الفاظ نہیں پا رہا تھا اس لیے دیر ہوگئی۔

03۔ آپ نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے 'شکوہ' اور 'جوابِ شکوہ' کے ذریعے جو 'صور' پھونکا تھا (شکوہ جولائی 1911ء اور جوابِ شکوہ ستمبر 1913ء اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور)

اس کے ٹھیک ایک صدی بعد آپ سے رابطہ ممکن ہوسکا ہے۔

04۔ صدی ڈیڑھ صدی کی اغیار کی غلامی میں 'آسودہ' اُمت مسلمہ نے انگڑائی لی اور آنکھ کھولی تو آپ نے اپنی بانگ درا (گھنٹی کی آواز) سے اُسے ایک باوقار اور خوبصورت قافلہ بنا دیا کہ دنیا حیران رہ گئی اور بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں 1366ھ کے رمضان کی 27ویں شب ملک پاکستان منصۂ شہود پر آ گیا۔

05۔ آپ کی شاعری نے ابلیسی صہیونی مغربی استعمار پر شانِ کلیمی سے ایسی کاری ضرب لگائی (ضربِ کلیم) کہ برطانیہ کی عظیم سلطنت وقوت اس سے جانبر نہ ہوسکی۔ ابلیس کی فوری منعقدہ مجلس شوریٰ اگر امریکہ کو آگے بڑھا کر حالات کو نہ سنبھالتی تو دنیا کا نقشہ ہی اور ہوتا۔ برطانیہ عظمیٰ کے ایک سابق وزیراعظم کے اعترافی بیان کی کاپی اس خط کے ساتھ منسلک ہے۔

06۔ ابلیسی صہیونی برطانوی استعمار نے مسلم بیداری کے جوش اور ولولہ کے نتیجے میں پاکستان کا مطالبہ مان تو لیا مگر پہلے مرحلے میں ہی بدنیتی سے بہت سے مسلم اکثریت کے علاقے ہندو کو دے دیے پھر کشمیر میں جنگ چھیڑ دی اور کشمیر جنت نظیر کو متنازعہ بنا کر ایک ناسور بنا دیا کہ آج تک اس سے مسلم خون بہہ رہا ہے۔ حیدرآباد دکن پر ہندو نے برطانوی اشیر باد پر قائداعظم محمد علی جناح کی وفات کی شب قبضہ کرلیا۔ جوناگڑھ پر بھی یہود کے فلسطین پر قبضے کی طرح ہنود نے ناجائز قبضہ کرلیا۔ مسلم دشمنی کے ان اقدامات پر عالمی طاقتیں ہندو غاصب کی پیٹھ پر تھپکی دیتی رہیں۔

07۔ نم آنکھوں کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت بھی کررہا ہوں کہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات، امریکی اشارے، روسی تعاون اور ہندو کی مسلم دشمن سوچ کے تحت 1971ء میں پاکستان کا ایک بازو کاٹ کر الگ کر دیا گیا، جو اَب برادر ملک بنگلہ دیش کہلاتا ہے۔

08۔ پاکستان کا وجود، وطنیت پرستی کی نفی، خدا کا اثبات اور مذہب وریاست کے یکجا ہونے کی علامت تھا اور اُمید تھی کہ پاکستان ایک مسلم نظریاتی ریاست کی حیثیت سے اُبھرے گا——— مغرب کی ابلیسی طاقتوں کو 1949ء کی قراردادِ مقاصد کی منظوری کی صورت میں اپنی موت نظر آئی۔ لہٰذا پاکستان کی سالمیت کے خلاف ابلیس کی پے بہ پے مجالس شوریٰ منعقد ہوئیں اور عالمی یہودی کانگریس (WORLD JEWISH CONGRESS) اور اسرائیلی عمائدین پاکستان

کے وجود ہی کے خلاف سازشیں کرنے لگے، فوجی حکمرانوں کے ذریعے پاکستان کو مسلسل عدمِ استحکام کا شکار بنائے رکھا اور مرضی کے سول حکمرانوں کو بھی کبھی سکون نہ آنے دیا۔

09۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم تھا کہ ہماری کوتاہیوں اور لغزشوں کے باجود 1998ء میں پاکستان ایٹمی قوت بن گیا۔ اس سلسلے میں ابلیسی قوتوں کا زبردست دباؤ تھا مگر پاکستان کے بہی خواہ متعدد عمائدین حکومت لائق صد تحسین ہیں کہ اُنہوں نے پہلے بھی اور اب تک اس سلسلے سے میں کوئی دباؤ قبول نہیں کیا۔

10۔ آپ کو یہ جان کر انتہائی مسرت بخش اطمینان ہوگا کہ 79ء میں شمالی مغرب کی طرف سے بے خدا کیمونسٹ استعمار بری نیت سے پاکستان کی طرف بڑھ رہا تھا کہ پاکستان افغان عوام نے مل کر اس بدمست عالمی طاقت کو ہزیمت سے دوچار کر کے قصۂ ماضی بنا دیا، اس طرح مسلمانوں کے ہاتھوں برطانیہ عظمیٰ کے زوال کے بعد جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے ہاتھوں 1990ء میں دوسری عالمی طاقت بھی غوری، غزنوی اور ٹیپو سلطان کے جانشینوں کے ہاتھوں ماضی کے دھندلکوں میں گم ہوگئی۔

11۔ برادر مسلم ملک افغانستان کا آپ نے ذکر فرمایا تھا اور ان کے مسلّم آہنی عزم اور دینی غیرت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کچھ مشورے دیے تھے۔ الحمدللہ کہ برادر افغان بھائیوں نے پہلے روس کے خلاف سینہ سپر ہوکر درویشانہ بہادری کی داستان رقم کردی۔ دوسری مرتبہ اس ابلیسی صہیونی استعمار نے امریکہ کی سربراہی میں 2001ء میں پھر افغانستان کا رُخ کیا اور خواہش کے باوجود اب تک افغانوں کے جسم و جان سے 'رُوحِ محمدؐ' کو نہیں نکال سکا۔ بلکہ دس سالوں کی مسلسل ناکامیوں کے بعد بدحواس ہو چکا ہے اور عنقریب زخموں سے چور ہوکر ایسا گرے گا کہ واقعی مغربی استعمار پر END OF HISTORY کا لیبل لگ جائے گا۔ برطانوی ہند کا مسلم علاقہ جہاں آپ نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا خواب دیکھا تھا وہ ایک صدی میں تین عالمی طاقتوں کی موت کا گھاٹ ثابت ہوا ہے۔

پاکستان پہلے چالیس قمری سال تو ہر طرح سے دشمنوں کے نرغے میں رہا ہے مگر اس کے بعد 86ء سے حالات چیونٹی کی رفتار سے مجموعی طور پر بہتری کی طرف جا رہے ہیں اور الحمدللہ

پاکستان کی ریاست اپنے قیام کے مقصد کی طرف بڑھ رہی ہے۔

12۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ مئی 1948ء صہیونیت اور ابلیس کی ذرّیت صلبی و معنوی نے اسرائیل نام سے ایک 'ناجائز' ریاست بنالی تھی جو مسلسل مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں شریک ہے اور مشرقِ وسطیٰ میں اس نے فلسطینی مسلمانوں پر قیامت ڈھا رکھی ہے۔

13۔ حالات کا رُخ بتا رہا ہے کہ آپ کے VISION کے عین مطابق تہران و اصفہان سے ایک قوت اُٹھ کر اس صہیونی عفریت کو پابہ زنجیر کردے گی اور یوں اگلے چند عشروں میں آپ کی یہ توقع پوری ہوتی نظر آرہی ہے کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے ؎
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر!

14۔ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے اس بے پایاں احسان پر احسان مندی کے جذبات کے ساتھ ساتھ فخر بھی ہے کہ آپ جیسا رہنما ملا جس نے یہاں کے مسلمانوں کو وہ جذبہ اور ولولہ دیا جس کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ہے۔ آپ کی بانگ درا ـــــــ سے بیدار ہو کر آگے بڑھنے والے مسلمان ایسے آگے بڑھے ـــــــ ایسی شمشیر بے زنہار بنے، ایسا سیل رواں بنے کہ ـــــــ دنیا حیران ہے کہ صرف ایک سو سال کے اندر تین عالمی صہیونی مغربی سپر طاقتوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے کا باعث بن گئے اور فرشتے آسمان پر سہمے ہوئے ہیں کہ کل کے غلام آج کے غوری اور غزنوی کیسے بن گئے اور آپ کی عقابی نگاہ میں برطانوی ہند کا شمال مغربی علاقے کی بڑی اہمیت تھی جس کے بارے میں آپ نے کہا تھا: ؎

افغان باقی کوہسار باقی ‏ الحکم للہ الملک للہ

اور ؎

آسیا یک پیکرِ آب و گل است ‏ ملت افغان درآں پیکر دل است!
از فسادِ اُو فساد آسیا ‏ از کشادِ اُو کشاد آسیا

(ترجمہ: ایشیا مٹی اور پانی کا ایک جسم ہے۔ اس جسم میں ملت افغان ایک دل ہے۔ اس کے فساد سے ایشیا کا فساد ہے اور اس کی خوشحالی میں ایشیا کی خوشحالی ہے۔)

____ آپ کا مشاہدہ صد فی صد درست نکلا اور آج آپ کی عظمت فکر، عروج تخیّل اور صحت فکر کا لوہا دنیا مانتی ہے کہ برطانوی ہند کا شمال مغربی علاقہ عصر حاضر میں ابلیسی عالمی صہیونی سپر طاقتوں کا قبرستان بن گیا ہے اور وہ دن دُور نہیں جب آپ کی بصیرت (VISION) کے مطابق مشرقِ وسطیٰ میں حق و باطل کی عظیم جنگ (ARMAGADON) کے فیصلہ کن مرحلہ میں اسی وادئ سندھ (دریائے کابل بھی دریائے سندھ میں آکر گرتا ہے، لہٰذا افغانستان بھی سندھ کی وادی کا حصہ ہے) کا بازوئے شمشیر زن اُٹھ کر باطل کا ستیاناس کردے گا۔

؎ از خاکِ سمرقندے ترسم کہ دگر خیزد
آشوبِ ہلاکوئے ہنگامۂ چنگیزے

؎ خضر وقت از خلوت دشت حجاز آید بروں
کارواں زیں وادی دور و دراز آید بروں

اور اس طرح نوعِ انسانی پر آشکار ہوگا کہ میرِ عرب ﷺ کو مشرق سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کی رمز کیا تھی۔

؎ میر عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے ، میرا وطن وہی ہے

اور جنوبی ایشیا میں مسلم ریاست کے لیے آج کے صوبہ خیبر پی کے، سندھ، پنجاب، بلوچستان کے علاقوں پر خالق کائنات کی نگاہِ انتخاب کیوں پڑی تھی اس لیے کہ افغانستان اور پاکستان کے یہ علاقے مل کر ہی انسانیت کو ابلیسی قوت کے جال سے نکالنے کا عزم رکھتے ہیں اور بے پناہ جذبے سے سرشار ہیں۔ آپ کا یہ تجربہ بھی بالکل صحیح تھا کہ آپ کے مخاطب مسلمان کم کوش تو ہوسکتے ہیں بے ذوق نہیں تھے۔ ایک صدی کے حالات وواقعات نے اس پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔

15۔ آپ کے (اپنی مرقد میں) آرام میں مخل ہونے اور سمع خراشی کی بے باکانہ جرأت پر معذرت خواہ ہوں۔

بصد احترام

ایک دردمند مسلمان
انجینئر مختار فاروقی

”100 سوسال“ کتاب کی تقریب رونمائی کا خلاصہ

مدیر حکمت بالغہ، انجینئر مختار فاروقی کی کتاب ”جنوبی ایشیا میں مسلم بیداری کے سوسال“ کی اشاعت اوّل جنوری 2012ء میں ہوئی تھی۔ اس کتاب کے مضامین پہلے حکمت بالغہ میں شائع ہو کر قارئین حکمت بالغہ کی نظروں سے گزر چکے تھے پھر بہت سے دوستوں، اہل علم اور معاصر جریدوں نے اس کتاب پر تبصرے لکھے جو شائع ہو کر مزید تعارف کا سبب بنے۔ تاہم بعض بہی خواہوں کے اصرار پر اس کتاب کی تعارفی نشست کا تقاضا تھا اس کے لیے 12 فروری 2013ء کو نمازِ ظہر کے بعد قرآن اکیڈمی جھنگ میں تقریب رونمائی منعقد ہوئی۔ تقریب کے آغاز میں تلاوتِ قرآن مجید اور نعت رسولِ مقبول ﷺ کے بعد انجینئر مختار فاروقی صاحب نے ابتدائی کلمات میں حاضرین کو انجمن خدام القرآن جھنگ کے مقاصد اور قرآن اکیڈمی جھنگ کا تعارف کرایا اور بتایا کہ انجمن کے مقاصد کے فروغ کے لیے قرآن اکیڈمی جھنگ سے ایک ماہانہ جریدہ حکمت بالغہ کے نام سے جنوری 2007ء سے جاری ہے۔ 2010ء میں اسلام و پاکستان کے بارے میں مایوسی کی کیفیت کے پیش نظر ایک سلسلۂ مضامین شروع ہو کر اختتام پذیر ہوا جس میں موجودہ عالمی اور علاقائی مایوس کن حالات میں اُمت مسلمہ کی بالعموم اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی بالخصوص گزشتہ ایک صدی کی کامرانیوں کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ قوموں کی زندگی میں ایک صدی کا عرصہ زیادہ نہیں ہوتا تاہم جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے گزشتہ صدی (1910ء۔2010ء) میں بے مثال کامیابیاں حاصل کی ہیں، جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ ان کے بعد پروفیسر حسن محمود اقبال صاحب (سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج جھنگ) نے اپنے خطاب میں قرآن اکیڈمی کی خدمات اور اس کتاب کے فراہم کردہ ملّی جذبہ کو سراہا۔ پھر جناب ڈاکٹر طالب حسین سیال صاحب ڈائس پر تشریف لائے اور حاضرین کے قلب و ذہن پر اپنے مسحور کن انداز سے ایسے چھا گئے کہ سب محظوظ ہوتے رہے۔ ان کے بعد مہمانِ خصوصی جناب ڈاکٹر محمد سہیل عمر صاحب نے نرم دم گفتگو گرم دم جستجو والی کیفیت سے شرکاء کو اُمت مسلمہ کے مسائل پر سوچنے کا راستہ دکھا گئے۔ آپ نے فرمایا کہ قوموں کے مصلحین ہمیشہ مشکل لمحات میں بھی مایوس کن حالات کا تجزیہ، آئندہ کا لائحہ عمل اور اس کا طریق کار واضح کرتے آئے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں حالات کا ایک تجزیہ اور اُمت مسلمہ کی گزشتہ ایک صدی کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا تذکرہ ایک رجائیت پسند انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں جناب ڈاکٹر ابصار احمد صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں عالمی سطح پر مسلم اُمت کے حالات اور اس کی بیداری کے لیے کی جانے والی کوششوں کا تذکرہ فرمایا۔ اُنہوں نے زیرِ نظر کتاب کو مجموعی طور پر مسلم یوتھ کے لیے راہِ عمل کی وضاحت کرنے والی اور حوصلوں کو مہمیز دینے والی کتاب قرار دیا۔

مسلمانوں کے حقیقی جذبات کی ترجمان

اَلْحَمْدُ لِلّٰه

اشاعت دوم

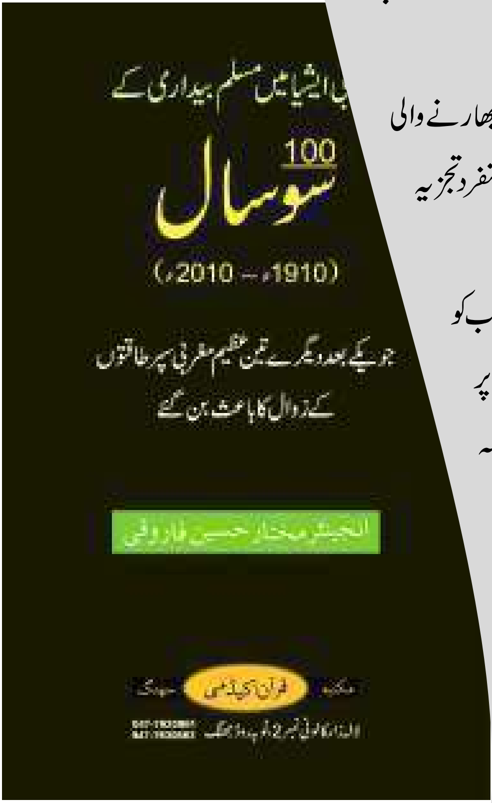

......قوموں کی تاریخ میں ایک صدی کا عرصہ زیادہ عرصہ نہیں ہے پھر بھی گزشتہ ایک صدی میں عالمی سطح پر مسلمانوں نے بالعموم (اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے بالخصوص) بے حد اہم کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

......یہ کتاب جذبوں کو جلا بخشنے والی کتاب ہے۔

......مسلم یوتھ کی اُمنگوں کو اُبھارنے والی تحریروں پر مشتمل تاریخ کا منفرد تجزیہ ہے۔

......کیا ہی اچھا ہو کہ اس کتاب کو کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر شامل نصاب کیا جائے، تاکہ پاکستانی نوجوان آزادی کی قدر و قیمت سے آشنا ہو سکیں۔

صفحات: 168

کارڈ بائنڈنگ

قیمت: 240 روپے
(ترسیل بذریعہ کوریئر)

مکتبہ قرآن اکیڈمی جھنگ

''سوسال'' کتاب کے انگریزی ترجمے کا اشتہار

Just

3.15 billion

seconds

of Muslim

AWAKENING

in South

Asia,

CAUSED

3 Western,

Global,
Zionist,
Super
powers, to

FADE AWAY

in history.

ENGLISH TRANSLATION UNDER PROCESS

مکتبہ قرآن اکیڈمی جھنگ

لالہ زار کالونی نمبر 2، ٹوبہ روڈ جھنگ
047-7630861
0336-6778561

جناب محمد فیاض عادل فاروقی (لندن) کا 'سوسال' کتاب پر تبصرہ

گزشتہ چار صدیوں سے عالمِ اسلام کا علمی، روحانی، تجدیدی اور عملی مرکزِ ثقل قدرت نے جنوبی ایشیا میں ثبت کر دیا ہے۔ ذرا پیچھے جا کر حالات کا جائزہ لیں تو طائرانہ نظر ڈالنے سے ہی عالم عیسائیت اور صہیونیت، عالم اسلام کے خلاف جن سازشوں کا جال بن رہے تھے وہ واضح نقشہ سامنے آجاتا ہے اور جنوبی ایشیا میں عالمی صہیونی ابلیسی سوچ کا کردار دیکھا جاسکتا ہے۔ دشمن یہ چاہتا تھا کہ سپین کی طرح جنوبی ایشیا میں بھی مسلمانوں کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کے لیے ہندو، عیسائی، یہودی سب اکٹھے ہو گئے تھے اور انہوں نے مسلمانوں کو چکر دینے کے لیے کئی نئے گروہ مختلف ناموں سے کھڑے کر کے ہند بلا لیے تھے۔

قدرت نے 1930ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں علامہ اقبال کے خطبۂ صدارت کا اہتمام فرمایا اور یوں مسلمانوں کے مستقبل کے لیے تقسیمِ ہند کا منصوبہ منصۂ شہود پر آ گیا۔ 1934ء میں علامہ اقبال، جناب محمد علی جناح کو انگلستان سے راضی کر کے واپس جنوبی ایشیا لائے اور مسلم لیگ کی مستقل صدارت دلوائی جس نے مارچ 1940ء کو قراردادِ پاکستان منظور کی، اور 14 راگست 1947ء کو پاکستان دنیا کے نقشہ پر اُبھر آیا۔...... فاطر فطرت نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے خوابوں اور ارمانوں کی اس سرزمین کی تراش خراش ایسے مقدس لمحات میں کی ہے کہ ایک طرف 13، 14 اگست کی یہ درمیانی رات 27 رمضان المبارک لیلۃ القدر 1366ھ تھی اور دوسری طرف جغرافیائی طور پر یہ خطۂ زمیں، کعبے کے دروازے کے سامنے ہے اور زہے نصیب کہ اس علاقے کے لوگ جب نماز میں سجدہ کرتے ہیں تو عین کعبے کے دروازے کے سامنے ملتزم میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اس ملک کی حقیقی عظمت ایسی لازوال ہے کہ جس کو دنیا ابھی پہچاننے سے قاصر ہے یہ ایک نوشتۂ دیوار ہے کہ گذشتہ صرف 13.2 ارب سیکنڈوں میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی علامہ اقبال کی شاعری کے ذریعے بیداری نے تین عظیم مغربی صہیونی عالمی طاقتوں کی عظمت کو گہنا دیا ہے۔ پہلے برطانیہ، پھر روس اور بعد ازاں امریکہ اس پاک وافغان علاقے سے 'انگور کھٹے ہیں' کہہ کر ماضی کے دھندلکوں میں جا چکے ہیں۔

اِس پس منظر میں لکھی گئی یہ کتاب پڑھنے کے لائق ہے۔ اختلاف کے باوصف طرزِ تحریر، اندازِ فکر، اُمت کا درد، عالمِ اسلام کی عظمت کی بازیافت کی کسک اور مستقبلِ قریب میں عالمی اسلامی خلافت کے قیام کی نوید کے خمیر سے کشید کی ہوئی یہ تحریر ہر مسلمان کے دل کی آواز ہے۔ میری دِلی خواہش ہے کہ یہ کتاب اس موضوع سے دلچسپی لینے والے موافقین ومخالفین کے مطالعے کی میز کی زینت بنے۔

حصّہ دوم

تیسرا باب — معروف معاصر دانشور حضرات کے نثر پارے اقتباسات و مضامین 105

چوتھا باب — RELIGIOUS THOUGHT کی بازیافت سے پہلے اسلامی فکر کا........ 271

پانچواں باب — اسلامی کی انقلابی فکر کی تجدید کے لیے ....ایک اجتماعی اُمنگ ناگزیر ہے 295

چھٹا باب — علامہ اقبال کا تجویز کردہ 'اجتہاد' کا راستہ اور ....'اجتہاد' کی ضرورت ہے 303

ساتواں باب — جنوبی ایشیا کے اہم مسلمان رہنما ــ اور ہم عصر عالمی تحریکیں 313

تیسرا باب

معروف معاصر دانشور
حضرات کے نثر پارے
اقتباسات و مضامین

1۔	فکرِ اقبال کی تعمیل کا تاریخی جائزہ	ڈاکٹر اسرار احمد	108
2۔	فکرِ اسلامی کی تجدید اور علامہ اقبال	ڈاکٹر اسرار احمد	129
3۔	تازہ حکمت عملی	پروفیسر محمد عارف	144
4۔	قانونِ اسلامی کے مستقل مآخذ	ڈاکٹر اسرار احمد	149
5۔	امالی غلام محمد اور تصورِ اقبال کا تقابلی مطالعہ	پروفیسر ارشاد شاکر	167
6۔	اقبال کا خطبہ ''الاجتہاد فی الاسلام'' ــــ ایک مطالعہ	امتیاز حسین	170
7۔	خطبہ الٰہ آباد، اقبال کی سیاسی بصیرت	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	187
8۔	پاکستان، نفاذِ اسلام اور اقبال	چودھری مظفر حسین	201
9۔	فکر اقبال میں اجتہاد کی اہمیت	ڈاکٹر شفیق عجمی	248

پاکستان کا قیام جنوبی ایشیا کے تمام مسلمانوں کا مسئلہ تھا کچھ لوگ APRROACH کے اختلاف پر کانگریس کا ساتھ دے رہے تھے اور ایک طبقہ مسلم لیگ کے نام سے اس جدوجہد میں شریک تھا جس کے محور و مصور علامہ اقبال تھے اور رہنما و لیڈر محمد علی جناح قائداعظم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے علامہ اقبال اور محمد علی جناح کے موقف کو زیادہ موزوں اور اَقرب الی الحقیقت قرار دے کر اس کو کامیابی عطا فرمائی۔ جو لوگ بھارت میں رہ گئے ان کے حصے کا کام بھی اب اہل پاکستان کو ہی کرنا تھا۔ مگر بعض داخلی و بعض خارجی رکاوٹوں کی بنیاد پر قیام نظام عدل اسلامی کا معاملہ لٹک گیا اللہ تعالیٰ نے اس وعدہ خلافی پر ہمیں خانہ جنگی کی طرف دھکیل دیا اور بعض دشمنوں کی سازشوں کی وجہ مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو گیا (جواب بنگلہ دیش) کہلاتا ہے۔

اس وقت جنوبی ایشیا میں رہنے والے تمام اہل اسلام کی طرف سے مسلمانانِ پاکستان کے کاندھوں پر اس ملک میں نظامِ اسلام کے عملی نفاذ کی ذمہ داری ڈال دی گئی ہے انہوں نے قربانیاں دے کر ہمیں ایک آزاد ملک دے دیا اس کی نعمتوں سے متمتع ہو کر اسلام نافذ کر دینا۔ ہم بوجوہ ایسا نہیں کر سکے۔ اس کی وجوہات ایک لمبی داستان ہے اصل موضوع کہ قیام پاکستان کا مطلب کیا تھا۔ اب تک ایسا کیوں نہیں ہو سکا اور اب بھی کرنے کا ایک کام ہے۔ اس تفصیلی خاکہ میں فکر اقبال کا کیا مقام ہے۔ اس موضوع پر معاصر اہل فکر و نظر کی آراء ہمارے سامنے ہیں۔ فارسی کا شعر ہے ؎ نہ من تنہا دریں میخانہ مستم　　جنید و شبلی و عطار ہم مست

مفہوم: اس وطن عزیز میں فکر اقبال کی تنفیذ کے بارے میں اکیلا میں ہی ہلکان نہیں ہو رہا بلکہ اس درد میں میرے ساتھ اور بے شمار بزرگ احباب اور مخلص اہل وطن شامل ہیں۔

ان حضرات کے افکار و خیالات کا ایک گلدستہ نذرِ قارئین ہے۔

آیئے ان معاصرین کے قیمتی افکار کا مطالعہ کرتے ہیں۔

1

فکرِ اقبال کی تعمیل کا تاریخی جائزہ

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

کی کتاب (مطبوعہ 1994ء) کا ایک باب

سب جانتے ہیں کہ انقلابِ فرانس کو فکری غذا والٹیئر ، روسو اور بعض دیگر مصنّفین نے فراہم کی تھی، تاہم انقلاب کی قیادت تو کجا، اس کی عملی جدوجہد میں بھی ان میں سے کسی کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اسی طرح انقلابِ روس کے لیے فکری مواد مارکس اور اینجلز نے جرمنی اور انگلستان میں بیٹھ کر تیار کیا تھا' تاہم نہ صرف یہ کہ ان میں سے کوئی بھی مردِ میدان نہ تھا، بلکہ ان دونوں ملکوں میں تو کمیونسٹ انقلاب کی کوئی آواز کبھی بلند ہی نہ ہو سکی اور اشترا کی انقلاب بالفعل روس میں بالشویک اور مانشویک لوگوں کی جدوجہد اور لینن کی اتفاقیہ قیادت کے ذریعے برپا ہوا ____ خود مسلمانوں کی پوری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ دورِ صحابہؓ کے بعد' سوائے ایک امام ابن تیمیہؒ کے' جتنے لوگ علم وفکر اور قلم وقرطاس کے میدان میں نمایاں ہوئے ان میں سے کوئی بھی سیف وسنان کا حامل نہ ہوا۔ چنانچہ دوسری صدی ہجری کے مجددِ اعظم امام ابوحنیفہؒ نے بھی اگرچہ حضرت نفس زکیہؒ کی اخلاقی تائید بھی کی اور ان کے ساتھ مالی تعاون بھی کیا لیکن عملاً جہاد وقتال میں شرکت نہیں کی۔ اسی طرح اُمت کی تاریخ کے دوسرے ہزار سالہ دور (الفِ ثانی) کے آغاز پر دو عظیم ترین مجددوں یعنی شیخ احمد سرہندیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مساعی بھی صرف قلم وقرطاس کی خدمت یا باطنی اور روحانی اصلاح تک محدود رہیں۔

علیٰ ہٰذا القیاس، اگر علامہ اقبال مرحوم نے بھی صرف اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید کا کارنامہ سرانجام دیا اور خود عملی طور پر نہ کسی تحریک کا آغاز کیا نہ کسی جماعت کی تاسیس کی تو اس میں ہرگز نہ کوئی تعجب کی بات ہے، نہ ہی اس سے ان کی ذات اور شخصیت پر کوئی حرف آتا ہے۔ اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح گزشتہ صدی کی عظیم تحریک مجاہدینؒ فی الواقع شاہ ولی اللہؒ ہی کی تجدیدی مساعی کا ظہور تھی، اسی طرح اگر ذرا بنظرِ غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ بیسویں صدی عیسوی کی جملہ احیائی مساعی کی بنیاد میں بھی علامہ اقبال ہی کا فکر کارفرما ہے۔ اگر اللہ کو منظور ہوا اور سلطنت خداداد پاکستان اسلام کی ''نشأۃ ثانیہ'' کا گہوارہ اور عالمی نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نقطۂ آغاز بنی، اور اس کے لیے یہاں منہجِ نبویؐ پر کوئی انقلاب برپا ہوا، جس کے تاریخی شواہد بہت قوی ہیں (اگرچہ موجود الوقت احوال و کیفیات کی بنا پر گاہ بگاہ مایوسی اور بددلی کے آثار بھی پیدا ہو جاتے ہیں!) تو اس کی اصل اساس علامہ اقبال کے اسی ''کارنامے'' پر ہو گی جو انہوں نے اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید کی صورت میں سرانجام دیا --- تاہم اس حقیقت کے کما حقہ ادراک کے لیے ضروری ہے کہ پہلے علامہ مرحوم کی شخصیت کو تاریخ کے فریم میں فٹ کر لیا جائے۔

علامہ اقبال کی ولادت ۱۸۷۷ء میں اسی سال ہوئی جس سال مسلم انڈیا میں ایک نئی فکری اور سیاسی روایت کے بانی اور موجد سرسید احمد خان کے ہاتھوں ایم اے او کالج علی گڑھ کی تاسیس ہوئی (اس سے قبل سرسید مرحوم علی گڑھ ہی میں ۱۸۲۶ء میں ''سائنٹفک سوسائٹی'' اور ۱۸۷۵ء میں ایم اے او ہائی اسکول قائم کر چکے تھے)۔ پھر علامہ کی شاعری کا آغاز لگ بھگ اُس وقت ہوا جب سرسید کی زندگی کا چراغ گل ہوا ہی چاہتا تھا۔ سرسید کا انتقال ۱۸۹۸ء میں ہوا تھا اور علامہ اقبال اگرچہ لاہور کے حلقۂ شعر و ادب میں تو ۱۸۹۵ء ہی سے متعارف ہو چکے تھے، تاہم ان کی وہ پہلی نظم جس کے ذریعے وہ ہندوستان کے وسیع تر علمی و ادبی حلقوں میں متعارف ہوئے ''ہمالہ'' ہے جو اپریل ۱۹۰۱ء میں آنریبل سر عبدالقادر کے جاری کردہ ماہنامے ''مخزن'' کی پہلی اشاعت میں شائع ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں علامہ کا پہلا اردو مجموعہ کلام ''بانگِ درا'' شائع ہوا تو اس کا دیباچہ بھی ان ہی سر عبدالقادر نے لکھا، جس میں انہوں نے علامہ کی شاعری کو بجا طور پر تین ادوار میں منقسم قرار دیا۔ (واضح رہے کہ ''بانگِ درا'' سے قبل علامہ کے فارسی کلام پر مشتمل تین کتابیں شائع ہو چکی

تھیں‘ یعنی---اسرارِ خودی ۱۹۱۵ء میں‘ رموزِ بیخودی ۱۹۱۸ء میں‘ اور پیامِ مشرق ۱۹۲۳ء میں!)

علامہ کی شاعری کا پہلا دور ۱۹۰۵ء تک ہے‘ جس میں وہ زیادہ تر حالی کی ’’نیچرل شاعری‘‘ کے انداز میں انگریزی شعراء کا اتباع کرتے اور ہندی قومیت کا راگ الاپتے نظر آتے ہیں۔ دوسرے دور (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) میں وہ اردو اور فارسی شاعری کے روایتی مضامین یعنی گل و بلبل‘ حسن و عشق‘ فراق و وصال کی دشت پیمائی کرتے نظر آتے ہیں-----لیکن ۱۹۰۸ء میں جیسے ہی ان کی حیاتِ مستعار کی چوتھی دہائی کا آغاز ہوتا ہے‘ ان کی ’’ملی شاعری‘‘ کا دور بھی بھرپور انداز میں شروع ہو جاتا ہے۔ اب وہ مسلمانوں کی وحدتِ ملی کے ترانے گاتے‘ اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر آنسو بہاتے‘ لیکن ساتھ ہی ان دونوں کے احیاء اور عروجِ نو کی نویدِ جان فزا سناتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے پہلی دونوں حیثیتوں میں وہ شبلی اور حالی کی روایت کے تسلسل کی حیثیت رکھتے ہیں (جو خود اپنی جگہ آسمانِ سرسید ہی کے ستارے تھے)۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۴ء میں حالی کے انتقال پر انہوں نے کہا: ؎

خاموش ہو گئے چمنستاں کے رازدار
سرمایۂ گداز تھی جن کی نوائے درد!

اور ؎

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہل گلستاں
حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد!

لیکن تیسری حیثیت میں‘ یعنی اسلام کے احیاء و تجدید کے علمبردار اور مسلمانوں کے عروجِ نو کے مبشر اور نقیب ہونے کے اعتبار سے وہ بالکل ’’منفرد‘‘ بھی ہیں اور ایک نئے دور کے ’’فاتح‘‘‘ یعنی افتتاح کرنے والے بھی!

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے‘ وہ بنیادی طور پر ’’مردِ میدان‘‘ نہیں بلکہ ایک مفکر و مصور اور حکیم و دانا انسان تھے‘ لہٰذا فکر اور فلسفہ کی سطح پر انہوں نے جن بلندیوں کو چھوا‘ (اس اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ جو شعر انہوں نے غالب کے بارے میں کہا تھا اس کے مصداقِ کامل و اتم وہ خود ہیں یعنی: ’’فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا‘ ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا!‘‘) اور جس وسعتِ نظر کا ثبوت دیا‘ اور اس سے بھی بڑھ کر ’’آنے والے دَور کی دھندلی سی اِک تصویر‘‘ نہ صرف

خود دیکھی بلکہ دوسروں کو بھی دکھائی‘ اس کے مقابلے میں عمل کے میدان میں ان کا مقام زیادہ بلند اور نمایاں نظر نہیں آتا (بقول خود ان کے کہ ع ”گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا!“)۔ تاہم انہوں نے مسلمانانِ ہند کو اپنے جداگانہ قومی تشخص کا احساس وشعور عطا کرنے میں جو عظیم کامیابی حاصل کی (اس اعتبار سے راقم الحروف کے نزدیک وہ مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے ظل اور بروز کی حیثیت رکھتے ہیں) اور اس سے بھی بڑھ کر ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد کے ذریعے ان کی قومی جدوجہد کے لیے جو منزلِ مقصود اور نصب العین معین کیا‘ اور ان سب پر مستزاد مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں جس طرح ایک عام کارکن کی طرح حصہ لیا‘ اس کے پیش نظر وہ عمل کے میدان میں بھی بالکل خالی ہاتھ نہیں ہیں اور پاکستان کے قیام میں ان کا حصہ کسی دوسرے قائد سے ہرگز کم نہیں ہے!

لیکن دوسری جانب احیاءِ دین اور ”طلوعِ اسلام“ کا جو زبردست صور انہوں نے پھونکا تھا‘ برعظیم پاک و ہند کی پوری اسلامی تحریک فی الحقیقت اسی کی مرہونِ منت ہے اور خود اقبال کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!

بیسویں صدی عیسوی میں برعظیم پاک و ہند میں احیاءِ اسلام کا جو غلغلہ بلند ہوا وہ سب اسی مردِ درویش کا فیض ہے جسے ہم اوپر حضرت مجددؒ کا ظل قرار دے چکے ہیں۔

☆☆☆

تجدید واحیائے دین کے عملی میدان میں اگرچہ آغاز میں سرسید مرحوم کے مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے متعدد اہم اشخاص ”حکومتِ الٰہیہ“ کے زوردار نعرے کے ساتھ اُترے‘ لیکن کچھ حالات کی ناموافقت اور کچھ اپنی استقامت کی کمی کے باعث سب کے سب ناکام ہو گئے۔ چنانچہ ان میں سے بعض تو فوراً ہی منظر سے غائب ہو گئے‘ جیسے خیری برادران‘ اور بعض نے اپنے جوش و جذبے اور تنظیمی و عسکری صلاحیت کی بنا پر کچھ عرصے کے لیے بڑا سماں باندھا‘ جیسے علامہ مشرقی‘ لیکن وہ واحد شخصیت جس سے ایک ایسی نئی روایت کا آغاز ہوا‘ جس کا تسلسل خود اس کے منظر سے

ہٹ جانے کے بعد بھی قائم رہا‘ مولانا ابوالکلام آزاد کی تھی‘ اگرچہ یہ نہ خود انہوں نے کبھی تسلیم کیا نہ ان کا کوئی عقیدت مند آج تسلیم کرے گا کہ انہوں نے کوئی اثر علامہ اقبال سے قبول کیا تھا‘ لیکن اگر ذرا شخصی محبت وعقیدت کے پردے ہٹا کر حقیقت پسندانہ نگاہ سے دیکھا جائے‘ اور زمان ومکان کے ناقابل تردید حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو صاف محسوس ہوگا کہ ۱۹۰۸ء میں جب اقبال کی ملی شاعری کا ڈنکا بجنا شروع ہوا‘ احمد المکنی باَبی الکلام کی عمر کل بیس برس تھی۔ گویا یہ اس ذہین اور طباع نوجوان کی زندگی کا سب سے زیادہ حساس اور اخاذ دور تھا‘ تو کیسے ممکن ہے کہ اس کے ذہن وفکر کی تشکیل میں اس ’’بانگِ درا‘‘ اور ’’بانگِ رحیل‘‘ کا کوئی حصہ نہ ہو جو اقبال کی ملی شاعری کی صورت میں برعظیم کے پورے طول وعرض میں گونج رہی تھی‘ خصوصاً جبکہ اس کی ابتدائی تربیت میں مؤثر حد تک عمل دخل آسمانِ سرسید کے ایک ٹوٹے ہوئے تارے علامہ شبلی کو بھی حاصل تھا!

بہرحال اس وقت نہ اس پر زیادہ بحث کا موقع ہے کہ مولانا آزاد کے قلب وذہن میں احیاءِ اسلام کا جذبہ وارادہ علامہ اقبال کی ملی شاعری کے زیر اثر پیدا ہوا تھا‘ یا یہ براہِ راست ع ’’آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں!‘‘ کی صورت تھی‘ یا پھر ’’توارد باہمی‘‘ والا معاملہ تھا۔ اس وقت جس حقیقت کی جانب توجہ دلانی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے ابو الکلام کی شخصیت اور کارنامے کو اگر دو حصوں میں تقسیم کر لیا جائے تو ان میں سے ایک کو تو ان کے اور علامہ اقبال کے مابین قدرِ مشترک کی حیثیت حاصل ہے اور فرق صرف اسلوب اور انداز کا ہے‘ البتہ دوسرا حصہ کم از کم ظاہری اور عملی اعتبار سے قدرے مختلف اور‘ جیسے کہ اوپر عرض کیا گیا‘ ایک نئی روایت کے نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان میں سے مقدم الذکر حصہ یعنی امت مسلمہ کی زبوں حالی اور اولاً جنگِ بلقان اور پھر پہلی عالمگیر جنگ کے دوران مسلمانوں پر دُوَلِ یورپ کے مظالم پر مرثیہ خوانی‘ اور عظمتِ قرآن کے بیان اور اس کی جانب مؤثر اور زوردار دعوت کو علامہ اقبال اور مولانا آزاد کے مابین قدرِ مشترک کی حیثیت حاصل ہے۔ ان میں سے بھی ظاہر ہے کہ احیاءِ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے زیادہ اہمیت دوسری بات کی ہے‘ اور اس کے ضمن میں ان دونوں کے مابین ایک اعتبار سے تو صرف اسلوب اور انداز کا فرق ہے‘ یعنی جہاں اقبال نے قرآن کو اپنے اشعار میں ’’سمو‘‘ دیا‘ وہاں آزاد

نے اسے اپنی نثر کی روحِ رواں بنا دیا۔ (واقعہ یہ ہے کہ اسی سے آزاد کی نثر کو یہ حیثیت حاصل ہوئی کہ حسرت موہانی ایسا شخص پکار اٹھا کہ ؎ ''جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر' نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا!'') اسی طرح جہاں اقبال کے یہاں ''فکر'' کا پلڑا بھاری رہا وہاں آزاد کے یہاں ''دعوت'' کا انداز غالب ہے---- البتہ ایک دوسرے پہلو سے راقم اپنا یہ تاثر بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ''عظمتِ قرآن'' کے انکشاف کی جو شدت وحدت اور گہرائی و گیرائی اقبال کے یہاں نظر آتی ہے اس کی دوسری مثال کم از کم راقم کے علم میں نہیں ہے۔

البتہ مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کے متذکرہ بالا آٹھ سالہ دور کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں وہ ''منفرد'' ہیں۔ یعنی اقبال نے اللہ کی حاکمیت اور ''نورِ توحید کے اتمام'' کا جو نعرہ لگایا اور ملت بیضا کی ازسرنو ''شیرازہ بندی'' اور ع ''یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!'' کی جو نوید جان فزا سنائی' اس کے لیے عملی جدوجہد کے ضمن میں ''راست اقدام'' کے ناگزیر تقاضوں کی تعمیل اور تکمیل کی جانب توجہ دلانے کے ساتھ ساتھ پہلا عملی قدم ابوالکلام نے اٹھایا۔

اس سلسلے میں انہوں نے جہاں فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اہمیت' حکومتِ الٰہیہ اور خلافتِ اسلامیہ کے قیام کی فرضیت' اور اس کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کے لزوم کو اپنی تحریر اور تقریر کے اہم موضوعات کی حیثیت دی وہاں' واقعہ یہ ہے کہ' دو عظیم حقیقتوں کی جانب مسلمانوں کی توجہ مبذول کرانا تو ان کا پوری امتِ مسلمہ پر بالعموم اور حال اور مستقبل کی تمام احیائی تحریکوں پر بالخصوص عظیم احسان ہے۔ یعنی (۱) یہ کام ایک منظّم اور سمع وطاعت کی خوگر جماعت کے قیام کے بغیر ناممکن ہے' اور (۲) مستقبل کا ''اسلامی انقلاب'' بھی صرف اسی طریقہ کار پر عمل پیرا ہو کر برپا کیا جا سکتا ہے جس کے ذریعے چودہ سو سال قبل نبی اکرم ﷺ نے یہ انقلاب جزیرہ نمائے عرب میں برپا کیا تھا!

ان میں سے پہلی بات کے لیے تو انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث مبارک کا حوالہ دیا جو مشکوٰۃ شریف میں مسند احمدؒ اور جامع ترمذیؒ کے حوالے اور حضرت حارث اشعری h کی روایت سے موجود ہے' یعنی: آپ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمانو! میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں (ایک روایت میں یہ اضافی الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں: ''مجھے ان کا حکم اللہ نے دیا ہے'') یعنی

جماعت کا حکم، سننے کا حکم، اطاعت کا حکم، ہجرت کا حکم، اور جہاد فی سبیل اللہ کا حکم!'' ان پانچ باتوں کا تعلق اسلامی حکومت یا نظام خلافت کے ساتھ تو اظہر من الشمس ہے۔ یعنی اگر اسلامی حکومت یا نظامِ خلافت قائم ہو تو ان پانچوں احکام پر عمل لازمی طور پر خود بخود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک عالم اسلام میں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں (خواہ ملوکیت ہی کی صورت میں) قائم رہیں ان پانچ احکام کا حوالہ بھی کسی نہ کسی درجہ اور حیثیت میں برقرار رہا۔ لیکن جب مسلمان ممالک پر غیر مسلم اقوام کی حکومتیں قائم ہو گئیں تو یہ پانچوں احکام بھی غیر متعلق اور رفتہ رفتہ ''آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل'' کے مصداق ذہن سے محو ہوتے چلے گئے۔ کسی کو یہ خیال ہی نہ آیا کہ اس حدیث مبارک میں اسلامی حکومت یا نظام خلافت کے از سرِ نو قیام کی جدوجہد کے ضمن میں بھی بنیادی رہنمائی موجود ہے--- چنانچہ جب ۱۹۱۲ء میں یہ حدیث ''الہلال'' میں شائع ہوئی تو بہت سے مسلمان چونک گئے اور انہیں گویا اپنا بھولا ہوا سبق یاد آ گیا۔ بہر حال مولانا آزاد نے مسلمانانِ ہند کو اس حدیث مبارک کی جانب صرف متوجہ ہی نہیں کیا بلکہ ۱۹۱۳ء میں اسی پر عمل کرتے ہوئے بیعت کی اساس پر ''حزب اللہ'' کے نام سے ایک جماعت بھی قائم کر دی۔

دوسری بات کے لیے مولانا آزاد نے اولاً ۱۹۱۲ء ہی میں امامِ دار الہجرۃ حضرت مالک بن انس m کے اس قول کا حوالہ دیا کہ: ''اس امت کے آخری حصے کی اصلاح ہرگز نہ ہو سکے گی مگر صرف اسی طریق پر جس پر پہلے حصے کی اصلاح ہوئی تھی'' ----- اور پھر دوبارہ لگ بھگ دس سال بعد نومبر ۱۹۲۱ء میں جمعیت علماء ہند کے تیسرے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں اپنے تحریری خطبے میں اس کا حوالہ دیا۔ اب (۱۹۹۲ء) سے تقریباً دس سال قبل جب ''منہج انقلابِ نبویؐ'' راقم کی تحریر اور تقریر کا خاص موضوع بنا تو اس کے ضمن میں مولانا آزاد کے حوالے سے امام مالکؒ کا یہ قول بھی بہت نقل ہوا۔ اس پر بعض بزرگوں نے توجہ دلائی کہ اس قول مبارک کی حیثیت بھی حدیث کی ہے۔ اس لیے کہ یہ اصلاً حضرت ابوبکر صدیق h کے اس خطبے میں وارد ہوا ہے جو انہوں نے اپنی حیاتِ دنیوی کے آخری ایام میں ارشاد فرمایا تھا اور جس کے ذریعے خلافت کے لیے حضرت عمر h کی نامزدگی ہوئی تھی۔

الغرض، میرے نزدیک ۱۹۱۳ء میں ''حزب اللہ'' کا قیام علامہ اقبال کے انقلابی فکر کی

تعمیل کی جانب پہلا قدم تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مولانا آزاد اس پر صرف آٹھ سال تک استقامت کا مظاہرہ کر سکے اور انہوں نے خود اپنے قول کے مطابق ان علماء کی مخالفت کے باعث پٹڑی تبدیل کر لی جن کے دینی تصورات بارہ سو سالہ زوال وانحطاط کے باعث صرف عبادات و رسومات اور اس سے بڑھ کر زیادہ سے زیادہ نکاح وطلاق اور میراث کے مسائل تک محدود ہو کر رہ گئے تھے----- چنانچہ اپنے ایک سرگرم رفیق اور جان نثار ساتھی مولانا محی الدین قصوری مرحوم کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: ''میں اپنے پندرہ سال کے طلب وعشق کے بعد وقت کے عدم مساعدت واستعداد کا اعتراف کرتا ہوں ...... میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ موجودہ طبقہ علماء سے میں بالکل مایوس ہوں اور اس کو قوانین اجتماعی کے خلاف سمجھتا ہوں کہ ان کے جمود میں کسی قسم کا تقلب وتحول پیدا ہو......'' لیکن بعض دوسرے حضرات (جن میں ان کے بعض عقیدت مند ہی نہیں بیعت کرنے والے بھی شامل ہیں) کے نزدیک اس کا اصل سبب مولانا کی اپنی کم ہمتی تھی۔ یہاں تک کہ ان کے ایک دوسرے مخلص رفیق اور مولانا محی الدین قصوری ہی کے برادر اصغر مولانا محمد علی قصوری نے یہ الفاظ تک لکھ دیے کہ: ''......لیکن عین وقت پر مولانا آزاد کی بزدلی نے تمام کھیل بگاڑ دیا اور وہ سارے کا سارا محل جس کی تعمیر پر لاکھوں روپیہ صرف ہوا تھا اور سینکڑوں مسلمانوں نے اسے اپنے خون سے سینچا تھا' مولانا کی گریز پائی کی وجہ سے آن کی آن میں دھڑام سے نیچے آن گرا''۔ (ان دونوں حوالوں کے لیے دیکھئے: ''تحریک نظم جماعت'' تالیف ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری' صفحات ۱۰۱' ۱۰۴ اور ۱۰۵)---- بہرحال جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' اس بحث کے فیصلے کی تو نہ گنجائش ہے نہ ضرورت ---- اصل بات یہ ہے کہ علامہ اقبال کے انقلابی فکر کی تعمیل کے لیے ''راست اقدام'' کی سعی اول ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ ختم ہوگئی' لیکن اس فکر کی روح باطنی اور قوتِ متحرکہ نے بہت جلد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی صورت میں نیا پیکر تلاش کر لیا جن کے فکر اقبال سے اثر پذیر ہونے کا معاملہ ویسے بھی اظہر من الشّمس ہے۔ مزید برآں اس کا یہ تاریخی ثبوت تو ناقابل تردید ہے ہی کہ انہیں علامہ اقبال نے جنوبی ہند سے شمالی ہند نقل مکانی کی صرف دعوت ہی نہیں دی تھی' اس سلسلے میں ان کے ساتھ عملی تعاون بھی کیا تھا۔

یہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ اگرچہ بیسویں صدی عیسوی میں اسلام کے انقلابی

فکر کی تجدید اور احیاء کا سہرا تمام تر علامہ اقبال کے سر ہے‘ تاہم انہوں نے اپنی عملی مساعی کو صرف مسلمانانِ ہند کی اس قومی تحریک کی تائید اور تقویت تک محدود رکھا جو سر سید احمد خان مرحوم کے مکتب فکر کے تحت شروع ہوئی تھی‘ اور خود اسلام کے احیاء اور غلبے کی براہِ راست جدوجہد کے لیے نہ کسی تحریک کا آغاز کیا نہ کوئی جماعت بنائی۔ البتہ اس حقیقت کو نگاہوں سے ہرگز اوجھل نہیں ہونے دینا چاہیے کہ حضرت علامہ نے اپنے ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد کے ذریعے مسلمانانِ ہند کی متذکرہ بالا قومی تحریک کو ایک معین سمت اور واضح منزل کا شعور عطا کر کے اس میں صرف نظریاتی ہی نہیں ’’احیائی‘‘ رنگ کی آمیزش بھی کر دی تھی۔ چنانچہ اپنے اس تاریخ ساز خطبے میں انہوں نے جہاں مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کا مدلل اور فلسفیانہ انداز میں اثبات کیا‘ اور یہ پیشین گوئی بھی کی کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں ایک آزاد مسلم ریاست کا قیام ’’تقدیر الٰہی‘‘ ہے‘ وہاں یہ فرما کر کہ: ’’اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کے چہرۂ روشن پر جو تاریک پردے عرب ملوکیت کے دور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر عالم انسانیت کو اس کی اصل تعلیمات سے روشناس کرا سکیں!‘‘ خلافتِ راشدہ یا ’’خلافت علیٰ منہاج النبوۃ‘‘ کے قیام کو مسلمانانِ ہند کی قومی جدوجہد کا نصب العین قرار دے دیا تھا‘ اس لیے کہ دورِ ملوکیت سے قبل کا اسلام‘ ظاہر ہے کہ‘ دورِ نبوت اور خلافتِ راشدہ کا اسلام ہی تھا۔ چنانچہ کون نہیں جانتا کہ بعد میں یہی نظریاتی اپیل اور احیائی جذبہ مسلمانانِ ہند کو ’’پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!‘‘ کے نعرے کے تحت مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کرنے کا ذریعہ بن گیا‘ جس کے نتیجے میں قیام پاکستان کا ’’معجزہ‘‘ صادر ہو گیا۔

تاہم یہ باتیں تو بہت بعد کی ہیں‘ اقبال کی ملی شاعری کا ڈنکا تو ۱۹۰۸ء ہی سے بجنا شروع ہو گیا تھا۔ اس سے جو احیائی جذبہ بیدار ہوا تھا اس نے مختلف پیکر اختیار کرنے شروع کر دیے تھے۔ ان میں اولاً جو داعی اور قائد سامنے آئے ان میں اہم ترین شخصیت ابوالکلام آزاد کی تھی اور جب ۱۹۲۰ء کے بعد وہ منظر سے ہٹ گئے تو جو دوسری شخصیت سامنے آئی اور جس کے نام کا شہرہ مشرق و مغرب میں ہوا وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تھی۔

مولانا مودودی کی ولادت ۱۹۰۳ء میں ہوئی تھی۔ گویا علامہ اقبال سے تو وہ چھبیس برس چھوٹے تھے اور اس طرح ان دونوں کے مابین تو پوری ایک نسل کا واضح فصل تھا۔ البتہ جہاں تک

مولانا آزاد کا تعلق ہے تو اگرچہ ''عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابِ'' (بنی اسرائیل:۱۲) کے اعتبار سے تو وہ ان سے صرف پندرہ برس چھوٹے تھے' لیکن چونکہ مولانا آزاد بہت نوعمری میں نمایاں ہو گئے تھے (چنانچہ صرف چوبیس برس کی عمر میں مطلع ہند پر ''الہلال'' کی صورت میں نمودار ہو چکے تھے!) لہٰذا ان دونوں کے مابین بھی معنوی فصل کم وبیش بیس سال کا تھا---- بہرحال جب ۱۹-۱۹۱۸ء کے لگ بھگ نوجوان ابوالاعلیٰ نے شعور کی آنکھ کھولی تو اس وقت ہندوستان کی فضا میں ایک جانب حکیم الامت علامہ اقبال کی نہ صرف ملی شاعری اور اس سے پیدا شدہ احیائی جذبے کی دھوم تھی بلکہ ان کا ''فلسفہ خودی'' بھی پوری آب وتاب کے ساتھ سامنے آ چکا تھا جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نظریۂ ''وحدت الشہود'' کے ظل کی حیثیت رکھتا ہے اور جس نے ہمہ اوستی خیالات اور وجودی تصوف کی جڑ کاٹ کر ''فنا فی اللہ'' کی بجائے ''بقا باللہ'' کو سلوک کے مقصود اور مطلوب کی حیثیت دے دی تھی' اور ''اسرارِ خودی'' کے بعد ''رموزِ بیخودی'' کے ذریعے نبی اکرمﷺ کی اطاعت' محبت اور اتباع کو اصل الاصول قرار دے کر اسلام کے جداگانہ ملی تشخص کو ازسرنو مستحکم کر دیا تھا۔ دوسری طرف الہلال اور البلاغ کے مدیر' حزب اللہ کے امیر' ''دارالارشاد'' کے بانی' اور قرآن اور جہاد فی سبیل اللہ کے داعی ابوالکلام آزاد کی شخصیت کا سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ چنانچہ جواں سال ابوالاعلیٰ نے ان دونوں اعاظم رجال سے بھرپور استفادہ بھی کیا اور گہرا تاثر بھی قبول کیا۔ اور اس طرح ''مجمع البحرین'' کی حیثیت اختیار کر کے ان دونوں کے مشن کی تکمیل کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔

علامہ اقبال کے اتباع میں مولانا مودودی نے مغربی تہذیب کے اصول ومبادی اور اس کے ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!

کے مصداق نگاہوں کو چکا چوند کرنے والے مظاہر کو پوری خود اعتمادی کے ساتھ چیلنج کیا۔ اپنے سلیس' عام فہم اور دل نشین اندازِ بیان اور اسلوبِ نگارش کے ذریعے ''اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی'' (واضح رہے کہ یہ مولانا کی ایک اہم اور ابتدائی تالیف کا نام ہے) کی مفصل وضاحت اور مدلل اثبات کا فریضہ باحسن وجوہ سرانجام دیا۔ چنانچہ اسلام کے معاشرتی نظام پر ''پردہ'' اور اسلام

کی اقتصادی تعلیمات کے موضوع پر ''سود'' ایسی مبسوط کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔ رہیں اسلام کی سیاسی تعلیمات تو اگرچہ ان کے ضمن میں ان کا مختصر کتابچہ ''اسلام کا نظریۂ سیاسی'' ضخامت کے اعتبار سے ''بقامتِ کہتر'' کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اپنے پختہ اور محکم استدلال کی بنا پر یقیناً ''بقیمتِ بہتر'' کا مصداقِ کامل ہے۔ ہر صاحب نظر جانتا ہے کہ ان جملہ امور میں مولانا مودودی کی اصل حیثیت علامہ اقبال کے شارح اور مفسر کی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ حضرت علامہ ہی کے اتباع میں مولانا مودودی نے بھی مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کا پُرزور اور مدلل اثبات کیا اور اس طرح وہ بھی مسلمانانِ ہند کی قومی جدوجہد کی تقویت کا ذریعہ بنے۔ چونکہ ادھر جمعیت علماء ہند ایسی طاقتور اور اثر و رسوخ کی حامل جماعت اور اس پر مولانا آزاد کی بھاری بھرکم شخصیت بھی پٹڑی بدلنے کے بعد انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہونے کے باعث ''متحدہ قومیت'' کی زوردار حمایت اور تائید کر رہے تھے' اور ادھر حضرت علامہ علالت کے باعث کسی قدر پس منظر میں جا چکے تھے' لہٰذا واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں متحدہ قومیت کی مخالفت اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے اثبات کے میدان میں سب سے مؤثر اور فیصلہ کن کردار مولانا مودودیؒ کے قلم ہی نے ادا کیا۔ ان کی تالیفات ''مسئلہ قومیت'' اور ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' کے حصص اول و دوم کو اُس وقت کی قومی تحریک کے اہم ترین ہتھیاروں کی حیثیت حاصل ہو گئی ----- چنانچہ مولانا مودودی کے اسی قلمی جہاد کی بنا پر علامہ اقبال کی عقابی نگاہ ان پر پڑی اور انہوں نے انہیں دکن کی سنگلاخ زمین سے ''اچک'' کر اپنے خوابوں کی سرزمین یعنی مستقبل کے پاکستان کے زرخیز ترین خطے پنجاب میں لا بسایا۔

دوسری طرف الہلال اور البلاغ کی زوردار دعوتِ جہاد کی تائید و توثیق ہی نہیں مزید تفصیل اور توضیح کے لیے مولانا مودودی نے ''الجہاد فی الاسلام'' ایسی مبسوط اور معرکۃ الآراء کتاب تحریر کی جس نے ایمان کے اہم ترین رکن جہاد فی سبیل اللہ کے بارے میں مغرب کے زیر اثر پیدا ہونے والے معذرت خواہانہ انداز کی نفی کر دی' جس کا نقطۂ عروج تو غلام احمد قادیانی کا نعرۂ منسوخیٔ جہاد و قتال تھا' تاہم اس کے جراثیم اس حد تک متعدی ہو چکے تھے کہ علامہ شبلی نعمانی ایسے لوگ بھی اس سے بالکل محفوظ اور مامون نہیں رہ سکے تھے۔

مزید برآں مولانا آزاد کے اتباع ہی میں مولانا مودودی نے بھی اس حدیثِ نبویؐ کے مطابق جس کی جانب مولانا آزاد ہی نے ۱۹۱۲ء میں توجہ دلائی تھی ['مسلمانو! میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں' اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے' یعنی التزامِ جماعت کا حکم' امیر کے احکام کو سننے کا حکم' اطاعت کا حکم' ہجرت کا حکم' اور جہاد کا حکم!'' (مشکوٰۃ المصابیح بحوالۂ مسند احمدؒ و جامع ترمذیؒ عن الحارث الاشعری رضی اللہ عنہ)] مسلمانوں کو خالص غلبۂ دین اور حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی جدوجہد کے لیے ایک منظّم جماعت قائم کرنے کی دعوت دی۔ اس سلسلے میں جو زوردار مضامین انہوں نے لکھے اور جنہوں نے بعد میں ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' کے حصہ سوم کی صورت اختیار کی' ان کا نقطۂ عروج ''ایک صالح جماعت کے قیام کی ضرورت'' نامی مضمون تھا جس کی اساس پر اگست ۱۹۴۱ء میں ''جماعت اسلامی'' قائم ہوگئی' جو گویا مولانا آزاد کی ''حزب اللہ'' کا معنوی تسلسل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے متعدد حضرات اس میں شامل ہو گئے جنہوں نے پہلے مولانا آزاد سے بیعت کر کے حزب اللہ میں شمولیت اختیار کی تھی' جیسے مستری محمد صدیق' ملک نصر اللہ خان عزیز' اور شیخ قمر الدین وغیرہ۔

مولانا مودودی کے اس ''احیائی فکر'' میں جماعت اسلامی کے قیام کے بعد خالص قرآنی اور دینی اصطلاحات کی پیوندکاری مولانا امین احسن اصلاحی کے ذریعے ہوئی' جس کے زیر اثر ایک جانب نصب العین کے ضمن میں ''حکومتِ الٰہیہ'' کی غیر قرآنی اصطلاح کی بجائے ''اقامتِ دین'' اور ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کی خالص دینی اصطلاحات کا رواج ہوا۔ مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری کے ضمن میں ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کی اس قرآنی اصطلاح پر جس کو مولانا آزاد نے اپنی دعوت کی اساس بنایا تھا ''شہادت علی الناس'' کی گہری فلسفیانہ قرآنی اصطلاح کا اضافہ ہوا۔

اسی طرح امت کی اصلاح اور قیامِ نظامِ خلافت کے طریق کار کے ضمن میں مولانا آزاد نے جس قولِ امام مالکؒ یا اثرِ صدیق اکبرؓ کا حوالہ دیا تھا گویا اس کی وضاحت کے سلسلے میں مولانا مودودی کا سب سے زیادہ معرکۃ الآراء خطبہ وہ ہے جو انہوں نے ۱۹۴۱ء ہی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سٹریچی ہال میں ''اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے؟'' کے موضوع پر دیا' جس

کا ترجمہ مولانا مسعود عالم ندویؒ نے عربی زبان میں ’’منہاج الانقلاب الاسلامی‘‘ کے عنوان سے کیا۔اس میں مولانا نے اسلامی ریاست یا حکومت کے قیام کی سعی یا بالفاظِ دیگر اسلامی انقلاب کی جدوجہد کی جملہ شرائط اور لوازم کا بیان نہایت وضاحت اور جامعیت کے ساتھ کیا اور ثابت کیا کہ ایک خالص قومی طرز کی جدوجہد کے نتیجے میں مسلمانوں کی ایک قومی ریاست تو وجود میں آ سکتی ہے‘ اسلامی ریاست یا حکومت قائم نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ یہیں سے جماعت اسلامی کا راستہ مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گیا۔اگر بات صرف اسی حد تک رہتی تو کوئی حرج نہ ہوتا‘ لیکن بعد میں‘ جیسا کہ بالعموم ہوتا ہے‘اس اختلاف میں شدت بھی پیدا ہوتی چلی گئی اور تلخی کا زہر بھی گھلتا چلا گیا۔

بایں ہمہ راقم کے نزدیک مولانا مودودی کا یہ پورا علمی و قلمی جہاد اور دعوت و تنظیم کی جملہ مساعی فکرِ اقبال ہی کی تعمیل کے مرحلۂ ثانی کی حیثیت رکھتی ہیں۔البتہ جیسے کہ ہم ان ہی کالموں میں کچھ عرصہ قبل تفصیل سے عرض کر چکے ہیں‘ نبی اکرمﷺ پر نبوت و رسالت کے اختتام کے بعد اب اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا عمل لامحالہ کچھ نامکمل یا ناقص داعیوں ہی کی مساعی کے ذریعے سورۃ الانشقاق کی آیت ۱۹ کے مطابق ’’درجہ بدرجہ‘‘ آگے بڑھے گا۔ ہر عبوری داعی اور قائد میں عزم و ہمت اور استقلال و استقامت کی کمی پر مستزاد فکر و فہم کی کوتاہی بھی عین قرین قیاس ہے جس کا نتیجہ لامحالہ وقتی ناکامی ہی کی صورت میں نکلے گا‘ اگرچہ اس طرح تجدید و احیاء کا عمل بحیثیت مجموعی درجہ بدرجہ اور رفتہ رفتہ آگے بڑھتا رہے گا۔ چنانچہ یہی معاملہ ہے جو مولانا آزاد کی طرح مولانا مودودی کے ساتھ بھی پیش آیا۔

اس سلسلے میں داعیٔ اول یعنی مولانا آزاد کا معاملہ تو سادہ بھی تھا اور بسیط بھی۔اس لیے کہ ان کی اصل حیثیت ایک پُر جوش‘ بلند آواز اور خوش الحان ’’مؤذن‘‘ کی تھی جس کی پکار پر نمازی جمع ہوئے ہی تھے کہ منتشر کر دیے گئے۔ پھر ان کی کوئی خاص تصانیف بھی نہیں تھیں‘ صرف کچھ خطبات تھے اور کچھ صحافتی مقالات (واضح رہے کہ ’’ترجمان القرآن‘‘ بہت بعد کی چیز ہے)۔ مزید برآں انہوں نے پسپائی بھی اختیار کی تو علی الاعلان (جس کے ضمن میں انہوں نے تو ’’وقت کی عدم مساعدت اور استعداد‘‘ کو موردِ الزام ٹھہرایا‘ لیکن ان کے بعض ساتھیوں اور بیعت کرنے والوں‘ مثلاً مولانا محمد علی قصوری‘ نے ان پر ’’بزدلی‘‘ تک کا الزام لگایا)۔ چنانچہ حزب اللہ اور

دارالارشاد دونوں کی بساط انہوں نے اس طرح لپیٹی کہ پھر ان کا نام بھی کبھی نہیں لیا اور اپنے آپ کو ہمہ تن حصول آزادی کی جدوجہد (یا زیادہ سے زیادہ قرآن حکیم کے ساتھ ذاتی علمی شغل) کے لیے وقف کر دیا--- لیکن داعیٔ ثانی یعنی مولانا مودودی کا معاملہ بہت مختلف ہے۔ ان کی قائم کردہ جماعت اپنے اصل ابتدائی نام لیکن علیحدہ علیحدہ نظاموں کے ساتھ سابق ہندوستان کے جملہ خطوں یعنی پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور کشمیر میں موجود اور برسر کار ہے۔ پورے عالم اسلام میں اسی کو بر عظیم پاک و ہند کی اصل اور واحد اسلامی تحریک کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے اور غیر مسلم ممالک میں بھی اسے ایک قابل لحاظ بنیاد پرست قوت سمجھا جاتا ہے۔ بایں ہمہ اگر نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ تاحال کہیں کامیابی کی منزل کے آس پاس بھی نظر نہیں آتی تو اس کے اسباب میں جہاں خارجی اور ثانوی عوامل بھی شامل ہیں، وہاں داخلی طور پر خود داعی کے فکر کی چند بنیادی تقصیرات بھی ہیں جن کی وضاحت اس جدوجہد کے آئندہ تسلسل کے لازمی تقاضے کی حیثیت سے ضروری اور لابدی ہے اور اللہ گواہ ہے کہ اس سے نہ ان کی توہین مقصود ہے نہ تنقیص۔

اس فکر کی اہم ترین اور سب سے بنیادی کمی ایمانی حقائق کے ادراک و شعور اور اس ''باطنی تجربے'' کی ضرورت و اہمیت سے خطرناک حد تک بے اعتنائی ہے جسے علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں تو نہایت جوش و خروش اور کیف و سرور کے ساتھ بیان کیا ہی ہے، ''الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل جدید'' کے پہلے تین خطبات کا موضوع بھی بنایا ہے۔ اس بے اعتنائی نے اس تحریک میں روحانیت کا عنصر ابتدا ہی سے خطرناک حد تک کم کر دیا تھا، اور بالآخر اسے ایک خالص سیاسی تحریک بنا کر رکھ دیا۔ اس موضوع پر ایک مفصل بحث راقم الحروف نے اب (۱۹۹۲ء) سے چھبیس برس قبل اپنی ایک تحریر ''اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' میں کی تھی۔

دوسری اہم تقصیر مولانا مودودی کے عمرانی فکر کی ہے کہ جہاں نقدی کے سود کی حرمت کو تو انہوں نے خود بھی خوب سمجھا اور بیان بھی خوب کیا، وہاں زمین کے سود یعنی غیر حاضر زمینداری اور جاگیرداری کی نفی سے وہ یکسر قاصر ہی نہیں رہے، ان کی تائید اور تقویت کے لیے ایک کتاب بھی لکھ دی۔ پاکستان کی قومی سیاست کے اکھاڑے میں اترنے کے بعد تو یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ یہ معاملہ حکمتِ عملی اور مصلحت اندیشی کی بنا پر ہوا ہو، لیکن حیران کن امر یہ ہے کہ فکرِ اقبال کا یہ گوشہ

مولانا کی نگاہ سے ابتداءً کیسے اوجھل رہ گیا۔ شاید اس میں اصل عمل دخل حیدر آباد دکن کے ریاستی اور جاگیردارانہ ماحول کا ہو جس میں مولانا نے نشو ونما پائی تھی' واللہ اعلم۔ بہرحال اس تسامح یا تقصیر نے پاکستان میں اقامت دین کی تحریک کو انقلابی جذبے سے یکسر محروم کر دیا۔

تیسرا معاملہ جس کے ضمن میں مولانا مودودی سے تقصیر ہوئی' جماعت اسلامی کے لیے تنظیمی ڈھانچے کا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ دورِ نبوت سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک امتِ مسلمہ میں 'تنظیم' کی واحد اساس 'بیعت' رہی۔ چنانچہ خود نبی اکرم ﷺ نے متعدد مواقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بیعتیں لیں' جن میں سے بیعت عقبہ ثانیہ تو آپ ﷺ کے پیغمبرانہ مشن کی تکمیل کے ضمن میں فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ پھر خلافت کا نظام قائم ہوا تو وہ بھی بیعت کی اساس پر تھا۔ خلافتِ راشدہ کے خاتمے کے بعد اصلاحِ حکومت کے لیے جتنی کوششیں ہوئیں (جس کی اُس وقت واحد ممکن العمل صورت 'خروج' ہی کی تھی) تو وہ سب بھی بیعت کی اساس پر ہوئیں۔ پھر جب ع ''ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی'' والا معاملہ ہو گیا تو ایک جانب ملوکیت کا نظام بھی بیعت کی اساس پر قائم ہوا اور دوسری جانب سلوک وارشاد کے سلسلے بھی بیعت ہی کی بنیاد پر قائم ہوئے۔ یہاں تک کہ گزشتہ صدی کے دوران جہاد کی جتنی تحریکیں پورے عالم اسلام میں برپا ہوئیں' خواہ وہ ہندوستان کی تحریک مجاہدین تھی' خواہ لیبیا کی سنوسی تحریک' اور خواہ مہدی سوڈانیؒ کی تحریک' سب بیعت ہی کی اساس پر منظم ہوئیں۔ یہ سلسلہ موجودہ صدی کے آغاز تک قائم رہا۔ چنانچہ مولانا مودودی کے حوالے سے تو اہم ترین معاملہ مولانا آزاد کی ''حزب اللہ'' کا ہے جس کی تاسیس بیعت ہی کی بنیاد پر ہوئی تھی۔ (بعد کی ایک اور مثال یہ ہے کہ جب علماء اسلام نے قادیانیت کے سدِباب کے لیے تحریک چلانے کا فیصلہ کیا تو اس کے لیے بھی سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو امیر شریعت مقرر کر کے ان سے بیعت کی گئی اور بیعت کرنے والوں میں مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ ایسے بیہقیٔ وقت بھی شامل تھے' جن سے علامہ اقبال نے متعدد بار درخواست کی تھی کہ لاہور منتقل ہو جائیں تاکہ دونوں مل کر فقہ اسلامی کی تدوین نو کا مشکل مرحلہ طے کر سکیں' اور مولانا احمد علی لاہوریؒ بھی تھے' جو طویل عرصے تک انجمن حمایت اسلام کے قائم کردہ 'اشاعت اسلام کالج' کی مینجنگ کمیٹی کے صدر رہے تھے' جس کے نگران علامہ اقبال اور سید غلام بھیک نیرنگ تھے۔)

چنانچہ خود مولانا مودودی کا اپنا ذہن بھی ان کے مارچ ۱۹۴۱ء کے ایک خط میں کھل کر سامنے آ جاتا ہے جو انہوں نے جماعت اسلامی کے قیام سے صرف پانچ ماہ قبل حیدرآباد (دکن) کے مولانا محمد یونس مرحوم کے نام لکھا تھا' جسے انہوں نے اپنی تالیف ''خطوط کے چراغ'' میں شامل کیا ہے۔ اس میں مولانا نے بیعت کی تین قسمیں بیان کیں' یعنی: ایک وہ جو کسی خاص مرحلے پر کسی معین کام کے لیے لی جائے' جیسے بیعتِ رضوان' دوسری بیعت سلوک وارشاد' اور تیسری وہ بیعت ''جو اسلامی جماعت کے امیر یا امام کے ہاتھ پر کی جاتی ہے'' جس کے ضمن میں وہ مزید وضاحت فرماتے ہیں کہ: ''اس کی نوعیت یہ ہے کہ جب تک امیر یا امام اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا مطیع رہے' اس وقت تک جماعت کے تمام ارکان پر اس کی اطاعت فرض ہے۔ مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ .... الخ (یعنی ''جو مسلمان مرا اس حال میں کہ اس کی گردن میں بیعت کا حلقہ نہ تھا تو وہ جاہلیت کی موت مرا'' صحیح مسلم عن عبداللہ بن عمرؓ) اور دوسری تمام احادیث میں جس بیعت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے ان سب سے مراد یہی تیسری بیعت ہے' کیونکہ اس پر اسلامی جماعت کی زندگی اور اس کے نظام کا قیام منحصر ہے۔ اس سے الگ ہونے یا الگ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ نبی ﷺ جس کام کے لیے تشریف لائے تھے اور جس امرِ عظیم کا بار آپؐ امت پر چھوڑ گئے ہیں اس کو نقصان پہنچایا جائے یا ختم کر دیا جائے۔''

اس کے باوجود اگر مولانا مودودی نے جماعت اسلامی کے لیے بیعت کی اس منصوص' مسنون اور ماثور اساس کو چھوڑ کر مغرب سے درآمد شدہ تنظیمی ڈھانچہ اختیار کیا تو اس کی جو واحد وجہ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ جب ''ایک صالح جماعت کے قیام کی ضرورت'' کے جواب میں کچھ نوجوان اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ ساتھ مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا امین احسن اصلاحی ایسی بھاری بھرکم مذہبی شخصیتیں بھی ''من نیز حاضر می شوم'' کے مصداق حاضر ہو گئیں تو مولانا ان سے ''بیعت'' کا مطالبہ کرنے کی ہمت نہ کر سکے اور ایک نیم جمہوری اور نیم ''امیری'' ڈھانچہ اختیار کر لیا۔ چونکہ جماعت اسلامی کی امارت کے بارے میں مولانا کا اپنا ذہن وہی تھا جو اوپر درج ہوا' لہٰذا ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۶ء تک مسلسل پندرہ برس عملی اعتبار سے جماعت میں امارت یا ''آمریت'' اور جمہوریت یا ''شورائیت'' کے مابین کشاکش جاری رہی جو بالآخر ۵۷-۱۹۵۶ء میں دھماکہ خیز

بحران کا سبب بن گئی، جس سے جماعت کی تحریک کو شدید نقصان پہنچا۔ اس کے برعکس اگر مولانا ۱۹۴۱ء ہی میں اپنے اس ذہن کو بروئے کار لانے کی جرأت کر لیتے جو بالآخر انہوں نے ۱۹۵۸ء میں شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میری تالیف ''تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب'') تو اگرچہ شروع میں ساتھ آنے والوں کی تعداد کسی قدر کم رہتی لیکن بعد میں دوام اور تسلسل برقرار رہتا۔ یوں ۱۹۴۳ء اور ۱۹۵۷ء کے بحران پیدا نہ ہوتے۔ واللہ اعلم!

مولانا مودودی کے تحریکی فکر میں چوتھا ''خلا'' منہجِ انقلاب کے ضمن میں تھا، یعنی یہ کہ دعوت، تنظیم، تربیت اور ''کشاکشِ خس و دریا'' کے ابتدائی مراحل کے بعد جب مناسب قوت فراہم ہو جائے تو آخری ''اقدام'' یا انگریزی لفظ ''پوش'' یا ''پوچ'' (poach) کی عملی صورت کیا ہو گی؟ اس پر مولانا نے یا تو بالکل غور ہی نہیں کیا تھا، یا اس کے بیان کو خلافِ مصلحت سمجھا۔ اس لیے کہ ''اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے؟'' نامی تحریر میں جس کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے، اسلامی انقلاب کے ان جملہ ابتدائی لوازم اور مراحل کو اپنے مخصوص طرز اور اسلوب میں بہ کمالِ حسن و خوبی بیان کرنے کے بعد (جن کا بیان راقم نے بھی اپنی بساط کے مطابق ان کالموں میں کچھ ہی عرصہ قبل ''نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے مراحل'' کے عنوان سے متعدد اقساط میں کیا ہے) مولانا مودودی نے بار بار اس طرح کے الفاظ استعمال کرنے پر اکتفا کی ہے کہ ''تب ایک طبعی نتیجہ کے طور پر وہ خالص نظامِ حکومت ابھر آتا ہے جس کے لیے ان طاقتور اسباب نے جدوجہد کی ہوتی ہے'' اور ''آخر کار ایک لازمی اور طبعی نتیجہ کے طور پر وہی حکومت قائم ہو جائے گی جس کے لیے اس طرز پر زمین تیار کی گئی ہو'' اور اس طرح گویا آخری اقدام اور اس سے پیدا ہونے والے ''تصادم'' کے ذکر سے گریز کیا ہے۔ گویا علامہ اقبال نے منہجِ انقلابِ اسلامی کو اپنے جس معجز نما شعر میں بہ تمام و کمال سمو دیا تھا اس کے مصرعۂ اول یعنی ع ''با نشۂ درویشی درساز و دمادم زن!'' کے جملہ تقاضے تو مولانا مودودی نے خوب سمجھے بھی اور سمجھائے بھی، لیکن مصرعۂ ثانی یعنی ع ''چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن!'' کے تقاضے یا تو خود ان پر بھی پوری طرح واضح نہیں تھے، یا انگریز کی حکومت کے زمانے میں معاملہ ''مصلحت نیست کہ از پردہ بروں آید راز!'' والا تھا۔ راقم کے نزدیک معاملہ پہلا تھا۔ اس لیے کہ اگر یہ ''خلا'' صرف مصلحت کی بنا پر ہوتا تو اس سے وہ مضر ہی نہیں مہلک نتیجہ ہرگز

برآمد نہ ہوسکتا جو حصولِ آزادی اور قیامِ پاکستان کے بعد ظاہر ہوا۔ یعنی میرے نزدیک یہ انقلابی اور تحریکی فکر کی اسی تقصیر کا نتیجہ تھا کہ مولانا نے قیام پاکستان کے فوراً بعد جماعت اسلامی کو پاکستان کی انتخابی سیاست کے میدانِ کارزار میں داخل کر کے کشاکشِ اقتدار میں ایک فریق کی حیثیت دے دی، جس کے نتیجے میں اس کی ''اصولی اسلامی انقلابی جماعت'' کی حیثیت یکسر تبدیل ہوکر ''اسلام پسند قومی سیاسی جماعت'' کی صورت اختیار کرگئی، جس کے جملہ منطقی تقاضے بعد میں ''ناگزیر برائی'' کے طور پر اور ''أَهوَنُ البَلِيَّتَين'' کے قدیم شرعی حیلے کے مطابق پورے کیے جاتے رہے۔ رفتہ رفتہ نوبت بایں جا رسید ؏ ''کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!'' جب اس قلبِ ماہیت کا ناگزیر نتیجہ اس صورت میں برآمد ہوا کہ جماعت کے قدیم کارکنوں کا رہا سہا انقلابی جذبہ بھی بالکل ختم ہوگیا تو انقلاب کے لیے ''راست اقدام'' کے تقاضوں کو فوری طور پر اور کسی قدر وسیع پیمانے پر پورا کرنے کے لیے ایک متبادل تنظیم کی ضرورت محسوس ہوئی، جو ''پاسبان'' کی صورت میں منصۂ شہود پر آچکی ہے!

راقم نے جماعت اسلامی کی اس ''قلب ماہیت'' پر اصولی لیکن مفصل کلام اپنے اس بیان میں کیا تھا جو ۱۹۵۶ء میں بحیثیت رکن جماعت اسلامی مرکزی مجلس شوریٰ کی مقرر کردہ ''جائزہ کمیٹی'' کی خدمت میں پیش کیا تھا (اور بعد میں ''تحریکِ جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے طبع ہوا)۔ اپنے اس بیان کے آخری باب ''نتیجہ کلام'' میں راقم نے یہ لکھا تھا کہ ''میں نے نہ یہ کہا ہے اور نہ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء میں جب طریق کار تبدیل کیا گیا تو دانستہ طور پر اس تبدیلی کا ادراک کرنے کے باوجود کیا گیا جو اس طرح اس پوری تحریک کی بنیادی نوعیت میں برپا ہورہی تھی، لیکن یہ بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ طریق کار کی اس تبدیلی نے جماعت کو سطحی طور پر متاثر نہیں کیا بلکہ اس کو جڑوں سے لے کر شاخوں تک اور سر سے لے کر پیر تک بدل کر رکھ دیا ہے اور اب اس جماعت کی بنیادی نوعیت تک میں فرق واقع ہو چکا ہے۔''

اور پھر ''تبدیلی کیوں؟'' کے ذیل میں ''اس کی وجہ'' یہ معین کی تھی کہ ''میں اگر ایک لفظ میں اس اصل وجہ کو بیان کرنا چاہوں تو وہ ایک لفظ 'عجلت پسندی' ہے......'' مزید برآں سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۷ اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۱ کے حوالے سے عرض کیا تھا کہ یہ کمزوری ''انسان کی

گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اور انسان کا خمیر جس مٹی سے اٹھا ہے اس میں جزو لاینفک کے طور پر شامل ہے‘‘۔ لیکن اس وقت جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کا ایک اہم سبب فکر کا متذکرہ بالا ’’خلا‘‘ بھی تھا۔ چونکہ انقلابی جدوجہد کے آخری ’’اقدام‘‘ کے ضمن میں ذہن میں واضح نقشہ پہلے سے موجود نہیں تھا لہٰذا آزادی کے فوراً بعد پاکستان کی قومی سیاست کے میدان میں طاقت کا جو ظاہری خلا نظر آیا اس نے کشاں کشاں اپنے ’’دامِ ہمرنگِ زمیں‘‘ کی جانب کھینچ لیا! عجلت پسندی کے باعث یہ عظیم حقیقت ذہن سے اوجھل رہ گئی کہ انتخابات کسی نظام کو چلانے کے لیے منعقد کیے جاتے ہیں‘ بدلنے کے لیے نہیں‘ جبکہ نظام کی تبدیلی صرف ’’تصادم‘‘ ہی کے ذریعے ممکن ہے!

الغرض‘ مولانا مودودی علامہ اقبال اور مولانا آزاد دونوں کے فکر و عمل کے جامع ہونے کے اعتبار سے تو بلاشبہ ’’مجمع البحرین‘‘ تھے‘ لیکن بدقسمتی سے تین معاملات میں تو وہ حضرت علامہ کے فکر سے پیچھے رہ گئے‘ یعنی ایک ایمانی کیفیات اور باطنی تجربہ کی اہمیت کے شعور و ادراک کے معاملے میں‘ دوسرے غیر حاضر زمینداری اور جاگیرداری کی حرمت کے بارے میں‘ اور تیسرے انقلابی عمل کے آخری مرحلے یعنی اقدام اور تصادم کے بارے میں —— ایک معاملے میں وہ مولانا آزاد سے بھی پیچھے رہ گئے‘ یعنی اسلامی انقلابی جماعت کے تنظیمی ڈھانچے کو بیعت کی منصوص‘ مسنون اور ماثور اساس پر استوار کرنے کی ہمت نہ کر پائے۔

بہرحال اسلام کے انقلابی فکر کی اس کامل تجدید کے بعد‘ جو اللہ تعالیٰ نے علامہ اقبال کے ذریعے نصف صدی سے زیادہ عرصہ قبل کرا دی تھی‘ جس کے زیر اثر ’’ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے!‘‘ کے مصداق ایران میں انقلاب برپا ہو گیا اور پسر اقبال ڈاکٹر جاوید اقبال کی روایت کے مطابق وسطِ ایشیا کی مسلمان ریاستیں بھی ’’ماڈل‘‘ کی تلاش میں ہیں‘ اگر خود اقبال کے خوابوں کی سر زمین پاکستان میں ’’گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!‘‘ کے مصداق تاحال اسلامی انقلاب کی منزل تک رسائی حاصل نہیں کی جا سکی تو اس کا اصل سبب ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
گر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است!

اور ے خلافِ پیمبرؐ کسے راہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید!

کے بموجب ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' کے صحیح فہم وشعور میں کمی یا موجود الوقت تصورات اور رجحانات کے دباؤ کے باعث اس کو پوری طرح اختیار کرنے سے قاصر رہ جانا ہے۔

تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس عرصے کے دوران جو مساعی ہوئیں وہ بالکل رائیگاں گئیں۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ احیائے اسلام اور تجدید دین کا قافلہ رفتہ رفتہ اور درجہ بدرجہ آگے بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ اب یہ حقیقت بحمد اللہ پوری طرح آشکار اور واشگاف ہو چکی ہے کہ اسلام صرف مذہب نہیں کامل دین ہے جو عدل اجتماعی کا بہترین' جامع ترین اور متوازن ترین نظام پیش کرتا ہے۔ پھر لاکھوں انسانوں کے دلوں میں اس نظام کے برپا کرنے کا ولولہ بھی پیدا ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس پوری صدی کے دوران ع ''چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ!'' والی صورت عملاً برقرار رہی اور امت کے معتد بہ افراد نے ہر داعی کی آواز پر لبیک کہی اور تجدید واحیائے دین کی ''اولمپک ٹارچ'' کو کچھ نہ کچھ آگے ضرور بڑھایا۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ فکر کی صحت کو برقرار رکھتے ہوئے عملی کوتاہیوں اور تقصیروں کی تلافی کی فکر کی جائے۔ اور ع ''چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی!'' اور ع ''اک فصل پکی تو بھر پایا تب تک تو یہی کچھ کرنا ہے!'' اور ''دمادم زن'' کے انداز میں جدوجہد جاری رکھی جائے!

فرمانِ قائداعظم

''GOD HAS GIVEN US A GOLDEN OPPORTUNITY TO PROVE OUR WORTH AS ARCHITECTS OF A NEW NATION AND LET IT NOT BE SAID THAT WE DIDN'T PROVE EQUAL TO THE TASK''

2 فکرِ اسلامی کی تجدید اور علامہ اقبال

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

کی کتاب (مطبوعہ 1994ء) کا ایک باب

علامہ اقبال نے یورپ کی علمی اور سائنسی ترقی کو روحِ قرآن کا ظہور اور بروز' اور عوام کے سیاسی اور معاشی حقوق کے تصور کو نورِ محمدی (ﷺ) سے ماخوذ اور مستعار قرار دینے' اور اسلام کے علمِ کلام کو افلاطونی تصورات کی دلدل اور ارسطو کی منطق کی بھول بھلیوں سے نکال کر جدید تجرباتی علوم کی اساس پر استوار کرنے کے ساتھ ساتھ ایک جانب مغرب کے دو جدید عمرانی نظریات اور بنیادی سیاسی تصورات پر کڑی تنقید کرتے ہوئے مغربی تہذیب کو پوری خود اعتمادی اور جرأتِ رندانہ کے ساتھ چیلنج کیا' اور دوسری جانب نہ صرف یہ کہ اسلام کے اصل انقلابی فکر کی پوری ''مجدّدانہ'' شان کے ساتھ از سرِ نو تدوین کا فریضہ سرانجام دیا اور اللہ اور رسول ﷺ کے عطا کردہ نظامِ عدلِ اجتماعی کو عہدِ حاضر کی اعلیٰ ترین فکری سطح پر اور حقوقِ انسانی کے بلند ترین تصورات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے پیش کیا' بلکہ انقلاب کا زوردار نعرہ لگاتے ہوئے اس کے منہج اور منہاج کو بھی کمال اختصار لیکن حد درجہ جامعیت کے ساتھ پیش کر دیا۔

مغرب کے جن دو جدید عمرانی نظریات پر علامہ نے شدید تنقید کی وہ سیکولرازم اور نیشنلزم یعنی وطنی قومیت ہیں۔ ان کے ضمن میں علامہ کے خیالات اتنے واضح و بیّن اور معروف و مشہور ہیں کہ یہاں ان کی جانب صرف ایک اجمالی اشارہ کافی ہے۔ چنانچہ سیکولرازم علامہ کے نزدیک اس

دور کا سب سے بڑا فتنہ اور دین اور سیاست کی علیحدگی فساد کی اصل جڑ ہے۔ مزید برآں انسانی حاکمیت کا تصور علامہ کے نزدیک کفر اور شرک ہے‘ قطع نظر اس سے کہ وہ شخصی اور انفرادی ہو یا قومی اور عوامی۔ اس موضوع پر علامہ کے مشہور اور عام فہم اشعار میں سے تو یہ دو شعر سب سے زیادہ نمایاں ہیں:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی!

اور

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری‘ ہوس کی وزیری!

لیکن زیادہ لطیف انداز اور گہرے پیرائے میں یہ بات علامہ کی حیاتِ مستعار کے بالکل آخری دور کی نظم ’’ابلیس کی مجلسِ شوریٰ‘‘ کے اس شعر میں بیان ہوئی ہے کہ

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر!

گویا علامہ کے نزدیک یورپ میں ’’احیاء العلوم‘‘ اور ’’اصلاحِ مذہب‘‘ کی تحریکوں کے زیر اثر آدم میں جو ’’خود شناسی‘‘ اور ’’خودنگری‘‘ کا شعور پیدا ہوا‘ وہ اصلاً تو درست تھا لیکن اسے ابلیس اور اس کے کارندوں نے ’’عوامی حاکمیت‘‘ کی صورت دے کر شیطنت کا سب سے بڑا مظہر اور ابلیس کا آلہ کار بنا دیا ہے۔ چنانچہ جو گندگی منوں اور ٹنوں کے حساب سے ماضی میں کسی فرعون اور کسی نمرود یا کسی قیصر اور کسی کسریٰ کے سر پر تاج کی صورت میں رکھی ہوتی تھی وہ آج تولہ تولہ یا ماشہ ماشہ ہر انسان کے سر پر لیپ دی گئی ہے‘ لیکن نجاست بہر حال نجاست ہے‘ خواہ منوں اور ٹنوں کے حساب سے ہو‘ خواہ تولوں اور ماشوں کی مقدار میں!

رہا وطنی قومیت کا جدید تصور تو اس کے ضمن میں تو واقعہ یہ ہے حضرت علامہ نے بارہ اشعار پر مشتمل جو نظم اردو میں کہی اور تین اشعار پر مشتمل جو قطعہ فارسی میں کہا ان کے بارے میں‘ میں پورے وثوق کے ساتھ وہی بات کہنے کو تیار ہوں جو امام شافعیؒ نے سورۃ العصر کے بارے میں کہی ہے ___ اس موضوع پر امام شافعیؒ کا زیادہ مشہور قول تو یہ ہے کہ ’’اگر لوگ صرف اس سورت پر تدبر کر لیں تو یہ ان (کی ہدایت) کے لیے کافی ہے!‘‘ لیکن ان کا ایک دوسرا زیادہ فصیح اور بلیغ

قول وہ ہے جو مفتی محمد عبدہٗ نے اپنی تفسیر پارۂ عم میں نقل کیا ہے' یعنی: ''اگر قرآن میں سوائے اس ایک سورت کے اور کچھ بھی نازل نہ ہوتا تب بھی یہ لوگوں (کی ہدایت) کے لیے کافی ہوتی!'' علیٰ ہٰذا القیاس مجھے یہ کہنے میں ہرگز کوئی باک نہیں ہے کہ اگر علامہ مرحوم نے ساری عمر میں صرف یہی اشعار کہے ہوتے تب بھی وہ خود اپنے ہی شعر ؎

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے اے مصطفویؐ خاک میں اِس بُت کو ملا دے

کے مصداق مغربی تمدن کے لیے سب سے بڑے ''بت شکن'' اور ''قومیتِ اسلام'' کے مجددِ اعظم قرار پانے کے مستحق ہوتے!

اس معاملے میں بھی یہ بات قابل غور ہے کہ حضرت علامہ نے اپنی اردو نظم (مشمولہ ''بانگِ درا'': صفحات ۱۶۰'۱۶۱) میں ایک ''سیاسی تصور'' کی حیثیت سے ''وطن'' کو ایک جانب عہدِ حاضر کے ''تازہ خداؤں'' میں سب سے بڑا خدا اور تہذیب جدید کے آزر کے تراشے ہوئے نئے اصنام میں سب سے بڑا ''صنم'' قرار دیا۔ گویا ''وطنیت'' کو سب سے بڑے شرک سے تعبیر کیا جو از روئے قرآن نا قابل معافی جرم ہے (سورۃ النساء: آیات ۴۸ اور ۱۱۶) اور دوسری جانب نوع انسانی کے لیے نہایت تباہ کن اور مہلک بیماری قرار دیا' جس کے بطن سے ''مخلوقِ خدا'' میں تفرقہ وعداوت اور ''اقوام جہاں'' میں باہمی ''رقابت'' جنم لیتی ہے' جس کے نتیجے میں سیاست اخلاق سے ''خالی'' اور تجارت'' ذریعہ ''تسخیر'' (یعنی امپریلزم کا آلہ) بن جاتی ہے ___ اور ان سب کا نتیجہ یہ کہ ''کمزور'' اقوام تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہیں اور ان کا گھر ''غارت'' ہو جاتا ہے!

رہا فارسی قطعہ تو اس کے ضمن میں اگرچہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کا یہ اعتراض تو بالکل بجا تھا کہ ''میں نے ملت نہیں' قوم کا لفظ استعمال کیا تھا!'' اور اس پر حضرت علامہ نے بھی نہایت وسعتِ قلبی اور عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معذرت کر لی تھی' لیکن مولانا مدنیؒ کے اس قول کے بارے میں کہ ''میرا یہ کہنا کہ آج کل قومیں وطن سے بنتی ہیں محض خبر یہ تھا' انشائیہ نہیں تھا'' ان کی تمام تر جلالتِ قدر' ان کے تقویٰ و تدین اور مجاہدانہ سیرت و کردار کے اعتراف کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ایک بالکل مہمل بات تھی' اس لیے کہ مولانا ایک سیاسی اور مذہبی قائد تھے اور اس اعتبار سے ان کی ہر بات میں ''انشاء'' اور مشورہ کا رنگ ہونا بالکل فطری امر تھا۔ اور علامہ اقبال کی تنقید بھی

اصلاً مغرب کے اس نظریے ہی پر تھی کہ قوم وطن سے بنتی ہے (ملت کا لفظ تو غالباً صرف ضرورتِ شعری کے تحت استعمال ہو گیا تھا)۔ اور کفر اور شرک ایسے امراض ہر دور میں جو نئے لباس پہن کر اور نت نئے بھیس بدل کر اولادِ آدم کی گمراہی کے درپے ہوتے ہیں ان کی ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من اندازِ قدت را می شناسم!

کے انداز میں صحیح پہچان کی صلاحیت اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی فضل ہوتا ہے جو اس دور میں مبدءِ فیض سے علامہ اقبال کو عطا ہوا تھا----- بقول خود ان کے کہ ؎

عذابِ دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ!

قصہ مختصر' ایک جانب سیکولرازم اور عوامی حاکمیت اور دوسری جانب وطنی قومیت کی پر زور نفی کی اساس پر علامہ اقبال نے تہذیبِ جدید اور مغربی تمدن کو نہ صرف چیلنج کیا بلکہ ''خبردار'' بھی کیا کہ

؎ دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے وہ اب زرِ کم عیار ہو گا!

اور

؎ تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکُشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہو گا!

اس مقام پر آگے بڑھنے سے قبل یہ جملۂ معترضہ عرض کیے بغیر نہیں رہا جا رہا کہ ''مسلم قومیت'' کی اساس پر وجود میں آنے والے ملک میں' جس کے لیے ساری سیاسی جنگ ''جداگانہ انتخابات'' کی بنیاد پر لڑی گئی تھی' پینتالیس سالہ تعطل کے نتیجے میں نظریاتی انحراف اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ ملک کی ایک بڑی سیاسی جماعت یعنی پاکستان پیپلز پارٹی تو برملا ''مخلوط انتخابات'' کا نعرہ لگا رہی ہے' زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ مسلم لیگ کے بھی بعض سیکولر مزاج کارکن اور رہنما کم از کم نظریاتی سطح پر اسی کے راگ میں اپنی راگنی شامل کر رہے ہیں' اور نوبت بایں جا رسید کہ ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر   خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

اور ﷽ ان کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری!

کی بنیاد پر وجود میں آنے والے ملک میں شناختی کارڈ میں ''مذہب'' کے خانے کے اندراج پر اس قدر شور اور ہنگامہ برپا ہوا ہے کہ مذہبی جماعتوں کو ایجی ٹیشن کی دھمکی دینی پڑ رہی ہے!____

رہا قائد اعظم مرحوم کا ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء والا جملہ تو اسے ایک وقتی مصلحت کے طور پر قبول کرنا تو بالکل دوسری بات ہے، لیکن اگر مستقل فلسفے اور پاکستان کے دستور اور نظام کی مستقل اساس کے طور پر تسلیم کر لیا جائے تو یہ ''نظریۂ پاکستان'' کی صریح نفی اور مفکر و مصور پاکستان کے افکار ونظریات سے کھلی بغاوت ہے، جو نظریاتی سطح پر پاکستان کے جواز کے خاتمے اور 'خاکم بدہن' بالآخر عملی طور پر سوویت یونین کے مانند پاکستان کے بھی نیست و نابود ہونے پر منتج ہوگی، جبکہ پاکستان کی اس نظریاتی اساس کا استحکام اور اسی کی بنیاد پر ملک کے پورے دستوری اور قانونی نظام کی تشکیل عالم انسانیت میں ایک نئی تہذیب کے رواج، ایک نئے تمدن کے قیام و فروغ، اور اس ''نیو ورلڈ آرڈر'' کی بجائے جو حقیقت کے اعتبار سے ''جیو ورلڈ آرڈر'' یعنی یہود کی بالادستی کا نظام ہے، ایک حقیقی اور واقعی منصفانہ عالمی نظام (Just World Order) کے قیام کا نقطۂ آغاز بن جائے گی۔ اور چونکہ یہی وہ چیز ہے جو ابلیس لعین اور اس کی تمام صلبی اور معنوی ذُرّیت (اولاد) اور یہود اور ان کے آلہ کار ''وہائٹ اینگلو سیکسن پروٹسٹنٹس'' (WASP) کو ناپسند ہے، لہٰذا پاکستان میں اس منزلِ مقصود کی جانب کوئی چھوٹے سے چھوٹا، اور حقیر سے حقیر اقدام بھی ابلیس اور اس کے ملکی اور غیر ملکی کارندوں کو سخت ناگوار ہوتا ہے!

''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' نامی نظم حضرت علامہ نے ۱۹۳۶ء میں اپنے انتقال سے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو سال قبل کہی تھی اور ان کے اردو کلام میں شعریت کے اعتبار سے تو بعض دوسری نظمیں اس کے مقابلے میں بہت بلند مرتبہ و مقام کی حامل ہیں، لیکن ''اُمتِ مسلمہ کے نام پیغام'' کے اعتبار سے، اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اسی کو ان کے 'خاتمہ کلام' اور 'پیامِ آخریں' کی حیثیت حاصل ہے۔ اور اس کا ''حاصل کلام'' یا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ ابلیسیت کو کوئی خطرہ نہ جمہوریت سے ہے، نہ اشتراکیت سے بلکہ صرف اور صرف اسلام سے ہے۔ اس

لیے کہ جہاں تک مغرب کی نام نہاد جمہوریت کا تعلق ہے وہ محض ’’ملوکیت کا اک پردہ‘‘ ہے اور اس کی حقیقت ؏ ’’چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر‘‘ کے سوا اور کچھ نہیں (اس لیے کہ وہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ’’سرمایہ داروں کی آمریت‘‘ ہے)۔ اسی طرح اشتراکیت بھی قدیم ’’مزدکی منطق کی سوزن‘‘ سے نوعِ انسان کے گریبانوں کے چاک کو رفو نہیں کر سکتی۔ بقول ابلیس ؎

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روز گار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو!

لہٰذا ؎
ہے اگر کوئی خطر مجھ کو تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو!

اور ؎
جانتا ہے جس پہ روشن باطن ِایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے!

اسلام سے اس خوف اور خطرے کے مقابلے میں ابلیس کو اگرچہ یہ تسلی اور اطمینان حاصل ہے کہ ایک جانب تو عمل کے اعتبار سے مسلمانوں کی حقیقی اور واقعی صورتِ حال یہ ہے کہ ؎

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں!

اور ؎
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!

اور دوسری جانب نام نہاد ’’اہل ایمان‘‘ کے ایمان کی واقعی کیفیت یہ ہے کہ وہ ’’یقین‘‘ کی بجائے محض ایک ’’عقیدہ‘‘ بن کر رہ گیا ہے‘ یعنی ؏ یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں! اور ؎

زندہ قوت تھی زمانے میں یہ توحید کبھی   اور اب کیا ہے‘ فقط اک مسئلۂ علم کلام!

تاہم چونکہ تاریخ کے بہاؤ کا رخ لامحالہ ’’تلاشِ مصطفیٰ‘‘ کی جانب ہے‘ لہٰذا ابلیس کو یہ اندیشہ بھی لاحق ہے کہ ؎

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

اوراس کے بعد کے چار اشعار تو نہ صرف یہ کہ اس طویل نظم کی اصل جان ہیں‘ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے نظام عدل اجتماعی یا نظام مصطفیٰ ﷺ کا جو فہم علامہ اقبال کو زندگی بھر کے مطالعے اور غور و فکر کے ذریعے حاصل ہوا تھا اس کی تعبیر کے ضمن میں ’’سہل ممتنع‘‘ کی بھی اعلیٰ ترین مثال ہیں اور ’’جوامع الکلم‘‘ کی بھی بہترین نظیر! چنانچہ:

(۱) ؎ الحذر! آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر!
حافظ ناموسِ زن‘ مرد آزما‘ مرد آفریں

کی رو سے حضرت علامہ کے نزدیک اسلام کے سماجی اور معاشرتی نظام کی دو بنیادیں یہ ہیں کہ (i) اس میں عورتوں کی عصمت وعفت اور عزت و ناموس کی حفاظت کو اولین مقصد اور ہدف کی حیثیت حاصل ہے۔ اور (ii) اس میں مشکل اور مشقت طلب فرائض (جیسے طلبِ معاش اور دفاعِ ملک وملت) کا بوجھ مرد پر ڈالا گیا ہے‘ عورت پر نہیں!

(۲) ؎ موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں‘ نے گدائے رہ نشیں!

کے مطابق اسلام کا سیاسی نظام ’’تمیزِ بندہ و آقا‘‘ کے خاتمے کے اصول پر مبنی ہے‘ جس کی ایک ہی صورت ممکن ہے۔ یعنی یہ کہ حاکمیت صرف اللہ کے لیے تسلیم کی جائے‘ بقول اقبال ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری!

اور تمام انسان حدیث نبویؐ میں وارد الفاظ ’’كُونُوا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا‘‘ کے مطابق ایک جانب اللہ کے بندے اور دوسری جانب آپس میں بھائی بھائی بن جائیں ---اور صرف عقیدہ اور نظریہ کے علاوہ کوئی دوسری تمیز وتفریق اور اونچ نیچ انسانوں کے مابین باقی نہ رہے! بفحوائے ؎

كُلُّ مؤمن اِخوةٌ اندر دلش حریت سرمایۂ آب و گلش

اور ؎ ناشکیب امتیازات آمدہ در نہادِ اُو مساوات آمدہ!

جس کا منطقی نتیجہ ہے کہ اسلام روئے ارضی پر اللہ کی حاکمیت اور مسلمانوں کی خلافت کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے‘ گویا ؎

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر اُستوار　　　لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر!

(۳،۴) اقبال کی جامعیت کا نمایاں مظہر یہ بھی ہے کہ جہاں مابعدالطبیعیات ان کا اصل موضوع تھا وہاں انہیں اقتصادیات سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ ان سے بڑھ کر کون اس حقیقت سے واقف ہوسکتا تھا کہ آج کی دنیا میں سب سے زیادہ اہمیت معاشیات کو حاصل ہے اور آج کا انسان بالفعل ''معاشی حیوان'' بن چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن چار اشعار پر اس وقت گفتگو ہو رہی ہے' ان میں سے دو کا تعلق اسلام کے اقتصادی تصورات سے ہے۔ چنانچہ ایک جانب ''سرمایہ'' کے بارے میں فرمایا: ؎　　　کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف

منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں!

اور دوسری جانب ''زمینداری'' کی جڑ یہ کہہ کر کاٹ دی کہ ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب

پادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمیں!

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ اسلام کے سماجی انصاف کے نظام کے ضمن میں علامہ اقبال نے توحیدِ الٰہی کے تینوں منطقی نتائج کو خود بھی کماحقہ' سمجھا اور اللہ کے فضل وکرم سے انہیں اپنے اشعار کے ذریعے سمجھانے اور عام کرنے کا حق بھی پوری طرح ادا کر دیا۔ یعنی (i) چونکہ تمام انسان ایک ہی خالق کے پیدا کردہ (مزید برآں ایک ہی انسانی جوڑے کی نسل سے) ہیں لہٰذا ان کے مابین پیدائشی طور پر نسل' رنگ یا صنف کی بنا پر کوئی اونچ نیچ نہیں ہے' (ii) ''حاکمیتِ مطلقہ'' صرف اللہ کے لیے ہے اور انسانوں کے لیے محض ''خلافت'' ہے۔ (iii) ''ملکیتِ تامہ'' بھی صرف اللہ ہی کے لیے ہے اور انسان کے لیے زمین سمیت کل مال و دولت صرف ''امانت'' کے حکم میں ہے۔ بقول شیخ سعدیؒ ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست　　　در حقیقت مالک ہر شے خداست!

اور بقول اقبال　ع　بندۂ مؤمن امیں' حق مالک است!

ان میں سے جہاں تک ''سیاستِ خلافت'' کا تعلق ہے' اس پر کچھ ہی دنوں قبل ان کالموں میں بھی مفصل گفتگو ہو چکی ہے' مزید برآں متعدد سیمینار بھی منعقد کیے جا چکے ہیں' لہٰذا اس کے بارے میں

کسی مزید وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ البتہ جہاں تک معاشی عدل وانصاف کے ضمن میں اسلام کی تعلیمات کا تعلق ہے' اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ان کی حقیقت اور اہمیت جس شدت وحدت اور گہرائی وگیرائی کے ساتھ علامہ اقبال پر منکشف ہوئی اس کی کوئی مثال کم از کم انیسویں اور بیسویں صدی کے مفکرینِ اسلام اور داعیانِ دین میں سے کسی کے یہاں نہیں ملتی۔

چنانچہ یہ شعور وادراک تو بحمدِ اللہ عام ہے کہ اسلام نے اپنے معاشی نظام میں ذاتی منفعت کے جبلی تقاضوں کو مناسب حد تک ملحوظ رکھ کر ''سرمایہ کاری'' کے لیے تو پوری فضا برقرار رکھی' لیکن ''سرمایہ داری'' کی لعنت کی جڑ سود کی حرمت کے ذریعے کاٹ کر رکھ دی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ''ربا'' کی خباثت وشناعت کے احساس وادراک کے ضمن میں جس ''جوہر اندیشہ کی گرمی'' اقبال کے یہاں نظر آتی ہے وہ کم از کم راقم کی محدود معلومات کی حد تک کسی دوسرے مفکر یا عالم کے یہاں موجود نہیں ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں:

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن! کس نہ داند لذتِ قرضِ حسن
از ربا جاں تیرہ' دل چوں خشت وسنگ آدمی درّندہ بے دندان و چنگ!

(اس ضمن میں احساس کی شدت اور حدت کے اعتبار سے اگر کوئی دوسرا شخص اقبال کے آس پاس نظر آیا تو وہ بھی حسن اتفاق سے ایک کشمیری شیخ ہی تھا' یعنی شیخ محمود احمد مرحوم جن کی مختصر کتاب ''سود کی متبادل اساس'' تو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور سے شائع ہو چکی ہے' لیکن اصل معرکۃ الآراء تصنیف ''انسان اور سرمایہ'' (Man and Money) ابھی زیر طباعت ہے' لیکن صرف انگریزی میں!)

تاہم سود کی حرمت کے مسئلے پر تو پھر بھی غنیمت ہے کہ علماءِ دین کا اجماع ہے (اگرچہ دورِ ملوکیت میں پروان چڑھنے والی فقہ نے ''بیع مؤجل'' اور ''بیع مرابحہ'' کی اساس پر شرعی حیلوں کے ذریعے سود خوروں کے اطمینان وتسکین کا سامان فراہم کر رکھا ہے) لیکن ''زمین کے سود'' یعنی غیر حاضر زمینداری اور مزارعت کو تو امامِ اعظم حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام دار الہجرت حضرت مالک رحمۃ اللہ علیہ کے فتووں کے علی الرغم تمام علمائے دین نے شیرِ مادر کی طرح حلال وطیب قرار دے رکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ علامہ اقبال کے ہاتھوں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید کا نہایت اہم اور

نمایاں مظہر ہے کہ اس مسئلے پر بھی انہوں نے نہایت واضح اور دوٹوک بات کی۔ چنانچہ ایک جانب فلسفہ اور نظریہ کی سطح پر انہوں نے زمین کی ملکیت کی کلی نفی کی کہ ع

پادشاہوں کی نہیں‘ اللہ کی ہے یہ زمیں!

اور ؎ دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں‘ تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں‘ تیری نہیں‘ میری نہیں!

اور ؎ رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و مِلک خداست!

اور دوسری جانب عملی سطح پر امام اعظم اور امام دارالہجرت رحمۃ اللہ علیہ کی آراء سے ہم آہنگی اختیار کرتے ہوئے حضرت علامہ نے زراعت میں مزارعت یعنی بٹائی کے نظام کو اللہ کی رحمت اور برکت سے محرومی کا سبب قرار دیا۔ بقوائے: ؎

خدا آں ملتے را سروری داد	کہ تقدیرش بدست ِخویش بنوشت!
بہ آں قومے سروکارے نہ دارد	کہ دہقانش برائے دیگراں کشت!

چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں تو ان کی شان بالکل ’منفرد‘ ہے!

بہر حال‘ اسلام کے اس انقلابی فکر کی تجدید کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ علامہ اقبال نے ’’انقلاب‘‘ کا نعرہ بلند کیا اور اس کے لیے خاص طور پر سرمایہ داری‘ زمینداری اور جاگیرداری ہی کے خلاف اعلان جہاد کیا---یعنی: ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعل ِناب
از جفائے دہ خدایاں کشت ِدہقاناں خراب
انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!!!

لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ حضرت علامہ نے اسلامی انقلاب کا ہدف معین کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو برپا کرنے کے منہج اور منہاج کو بھی کمال جامعیت اور غایت اختصار کے ساتھ واضح کر دیا۔ چنانچہ اس موضوع پر ان کا ایک شعر تو الہامی ہی نہیں ’’معجزانہ‘‘ ہے! تاہم اس کا ذکر بعد میں ہوگا۔ پہلے یہ بات واضح ہو جائے کہ علامہ کے نزدیک اسلامی انقلاب کی جدو

جہد کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کو لوگوں کے ''اندر'' اُتارا جائے' جس سے ان کے ذہن وفکر' نظریات وخیالات' اہداف ومقاصد اور اقدار وترجیحات میں ''انقلاب'' برپا ہو جائے۔ وہ ''اندر سے'' بالکل تبدیل ہو کر رہ جائیں۔ اس لیے کہ عالم انسانیت میں یہ باطنی اور نفسیاتی تبدیلی اور شخصی وانفرادی انقلاب ہی عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ چنانچہ عظمتِ قرآن کے بیان میں فرماتے ہیں:

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

واضح رہے کہ اسی کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان کی آیت ۵۲ میں ''جہاد بالقرآن'' یعنی قرآن کے ذریعے جہاد سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے:

﴿فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝۵۲﴾

''تو (اے نبی ﷺ!) آپ ان کافروں کا کہنا نہ مانیں اور ان کے ساتھ جہاد جاری رکھیں اس (قرآن) کے ذریعے' پوری شدت اور قوت والا جہاد!''

اس لیے کہ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے مرحلۂ اول یعنی دعوت وتبلیغ کا کل مبنیٰ و مدار اور مرکز ومحور صرف اور صرف قرآن حکیم ہے۔ چنانچہ اسی کے ذریعے وعظ ونصیحت' انذار وتبشیر اور تذکیر وتلقین' گویا فی الجملہ اسی کی تبلیغ وتعلیم اسلامی انقلابی جدوجہد کا پہلا مرحلہ ہے' لیکن یہ حقیقت کہ تزکیہ وتربیت کا آلہ اور ذریعہ بھی قرآن حکیم ہی ہے اور شیطانِ لعین اور اس کی صلبی اور معنوی اولاد کے مقابلے کے لیے بھی واحد تلوار اور ہتھیار اللہ کی کتاب ہی ہے' جس شدت کے ساتھ اقبال پر منکشف ہوئی اور جس قدر وضاحت کے ساتھ انہوں نے اسے بیان کیا اس کی بھی کوئی دوسری مثال کم از کم راقم کے علم میں موجود نہیں ہے! (اس موضوع پر بھی چونکہ ان کالموں میں مفصل گفتگو ہو چکی ہے' لہٰذا تفصیل کی ضرورت نہیں ہے!) ــــــ ان کے ساتھ دو مراحل کا مزید اضافہ کر لیا جائے یعنی ایک تنظیم جس پر گفتگو ہو چکی ہے' اور دوسرے صبرِ محض یا عدمِ تشدد یا صحیح تر الفاظ میں ''عدمِ انتقام'' جس پر گفتگو ابھی باقی ہے' تو علامہ اقبال کے متذکرۂ صدر ''معجزانہ'' شعر کا مصرعہ اول مکمل ہو جاتا ہے' یعنی: ؏ ''بانشۂ درویشی درساز و دمادم زن!''

اس لیے کہ ان چار مراحل کے دوران اسلامی انقلاب کے لیے کوشاں کارکنوں اور مجاہدوں کا نقشہ

واقعی طور پر اور لامحالہ بدھ مت کے بھکشوؤں' اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں ہی سے مشابہ ہوتا ہے۔ یعنی گالیاں سنو اور دعائیں دو' پتھر کھاؤ اور پھول پیش کرو' سائلوں کی طرح دعوت دو' بھکاریوں کی طرح دردر کی ٹھوکریں کھاؤ' اور اُف تک نہ کرو' بلکہ صبر کرو اور اپنی جدوجہد کو ''دمادم زن'' کے انداز میں جاری رکھو! چنانچہ مکی دور کے بارہ سالوں کے دوران مسلسل یہی ہدایات اللہ تعالیٰ کی جانب سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو' اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ملتی رہیں کہ:

﴿وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝٧﴾ (المدثر)

''اور اپنے رب (کی خوشنودگی) کے لیے صبر کرو!''

اور ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۝﴾ (الحجر)

''ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس سے آپ کا سینہ بھنچتا ہے۔''

لیکن اس کے باوجود

﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝١٠﴾ (المزمل)

''صبر کرو اس پر جو یہ کہہ رہے ہیں اور ان سے کنارہ کشی بھی کرو تو خوبصورتی کے ساتھ۔''

اور ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ﴾ (القلم: ٤٨)

''صبر کے ساتھ انتظار کرو اپنے رب کے حکم کا اور مت ہو جاؤ اس مچھلی والے (حضرت یونسؑ) کی مانند (جنہوں نے عجلت سے کام لیا تھا)۔''

اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ شریعت کے مستقل اور ابدی قانون سے حکمِ قصاص ساقط ہو گیا تھا یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طبع بشری بدل گئی تھی اور اس میں جوشِ انتقام پیدا ہی نہیں ہوتا تھا' بلکہ یہ صرف انقلابی جدوجہد کے ابتدائی مراحل کا وقتی تقاضا تھا۔ چنانچہ خود سورۃ الشوریٰ میں جو مکی دور کے بھی وسط میں نازل ہوئی تھی' اہل ایمان کا یہ وصف مقامِ مدح میں مذکور ہے کہ:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝٣٩ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾

''اور وہ کہ جن پر زیادتی کی جائے تو وہ بدلہ لیتے ہیں! اور برائی کا بدلہ تو یقیناً ویسی ہی برائی ہے!''

تاہم یہ ﴿كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ﴾ ''اپنے ہاتھ روکے رکھو'' (سورۃ النساء:۷۷) کا وقتی حکم کچھ ایسی کیفیت کے ساتھ تھا کہ ؎

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی — اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی!

اس لیے کہ جیسے ہی یثرب کی جانب ہجرت ہوئی اور فضل خداوندی سے آنحضورﷺ کی انقلابی جدو جہد کو ''اقدام اور چیلنج'' کے لیے مرکز اور قاعدہ (مورچہ) میسر آ گیا' اہل ایمان کے ہاتھ کھول دیے گئے اور اذنِ قتال نازل ہو گیا۔ یعنی:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا﴾ (الحج: ۳۹)

''اجازت دے دی گئی انہیں جو جنگ کر رہے ہیں (یا اختلافِ قراءت کی بنا پر: جن پر جنگ مسلط کر دی گئی ہے!) اس لیے کہ ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے!''

پھر جب اس کے نتیجے میں کچھ ہی دنوں بعد مسلح تصادم اور قتال فی سبیل اللہ کا آخری مرحلہ شروع ہو گیا تو اولاً سورۃ البقرہ کی آیت ۱۹۳ میں اور پھر مزید وضاحت اور صراحت کے ساتھ سورۃ الانفال کی آیت ۳۹ میں حکم دے دیا گیا کہ ''ان (کافروں) سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین کُل کا کل اللہ ہی کے لیے ہو جائے!'' ____ یعنی اللہ کی زمین سے باطل کی حکمرانی کا قلع قمع ہو جائے اور اس کے باغیوں اور سرکشوں کی حکومتوں کے تختے الٹ دیے جائیں اور ''حق بحقدار رسید'' کے مصداق اللہ کی زمین پر اللہ ہی کی حکومت (یا انجیل کی اصطلاح میں ''آسمانی بادشاہت'') قائم ہو جائے۔

چنانچہ اقدام اور چیلنج اور مسلح یا غیر مسلح تصادم کے ان مراحل کو اقبال نے کمالِ جامعیت واختصار اور معجزانہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ سمو دیا اپنے متذکرہ بالا شعر کے دوسرے مصرعے میں۔ یعنی: ع ''چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!''

اور اسی کے لیے وہ مسلسل پکارتے' ابھارتے اور للکارتے رہے امت مسلمہ بالخصوص اس کی ''مذہبی قیادت'' کو' جو مدرسہ اور خانقاہ یا علماء اور صوفیاء میں منقسم تھی اور جس کے بارے میں ان کے مشاہدات اور تاثرات کا اظہار ان کے ان الفاظ کے ذریعے بخوبی ہو جاتا ہے کہ ع ''اُٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے غمناک!''۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ انہوں نے ایک جانب اس وجودی تصوف کی

شدت کے ساتھ مخالفت کی جس کے زیر اثر خام طبائع میں عمل' اقدام اور جہاد کی بجائے تعطل' گریز اور جمود کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں' اور نہ صرف یہ کہ اہل تصوف کو زوردار دعوت دی کہ ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیریؓ
کہ رسم خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری!

بلکہ یہ بھی بتایا کہ یہ تو مسلمانوں کے بارے میں ابلیس لعین کی اپنے کارندوں کو اہم ہدایت ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکر ِصبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

اور دوسری طرف علماء دین کو بھی جھنجوڑنے کی بھرپور کوشش کی۔ چنانچہ ان کے جو شاہکار اشعار ان کے مرقد کی زینت بنے ہوئے ہیں ان میں یہ قطعہ بھی شامل ہے کہ ؎

بیا تا کارِ ایں امت بسازیم قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجد شہر دلے در سینۂ مُلاّ گدازیم!

تاہم ان کا اصل خطاب مسلمانانِ ہند کی جدید تعلیم یافتہ نوجوان نسل سے تھا' جس کے دلوں کو انہوں نے کبھی تو عظمتِ رفتہ اور سطوتِ گزشتہ کی یاد سے گرمانے کی کوشش بھی کی کہ ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا!

اور کبھی ان کے جوشِ عمل کو مستقبل کے بارے میں امید افزا پیشین گوئیوں اور مغرب کے زوال اور اسلام کے عروج کی ع ''قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید!'' کے سے انداز کی خبروں کے ذریعے ابھارا۔

جیسے ؎ کتابِ ملت ِبیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اور ؎ سبق پھر پڑھ صداقت کا' شجاعت کا' عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا!

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کی اس ملی شاعری نے مسلمانانِ ہند کے نوجوان طبقے کے دلوں سے اس یاس اور ناامیدی کے اندھیاروں کو کافور کر دیا جس کا نمایاں ترین مظہر قومی شاعر

ہونے کے اعتبار سے علامہ کے پیشرو مولانا حالی کی شہرۂ آفاق مسدس کی ابتدا اور اختتام کے یہ دلدوز اشعار ہیں۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے!
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

اور ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسلؐ وقتِ دعا ہے امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے!
وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

بایں ہمہ یہ واقعہ اپنی جگہ نا قابل انکار ہے کہ علامہ اقبال نے اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید کے اس عظیم الشان کارنامے‘ انقلاب کے منہج اور منہاج کی واضح نشاندہی کی عظیم خدمت اور مسلمانانِ ہند کے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے طبقے میں ایک جذبۂ عمل پیدا کرنے کی بھرپور سعی کے باوجود خود نہ کسی احیائی تحریک کا آغاز کیا‘ نہ ہی کسی جماعت کی تاسیس کی۔ اسی بنا پر ہم نے اس سے قبل انہیں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے مشابہ قرار دیا تھا‘ جو اگرچہ خود تو آخر وقت تک صرف ایک گوشہ نشین درویش اور معلم و مصنف ہی رہے لیکن انہوں نے ایک جانب مسلمانانِ ہند کی ڈوبتی کشتی کو بچانے کے لیے افغانستان سے احمد شاہ ابدالی کو بلایا‘ اور دوسری جانب صحیح علم و عمل کی وہ فضا پیدا کر دی جس کے نتیجے میں دوسری ہی نسل میں سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت و امارت اور شاہ ولی اللہؒ کے پوتے شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ کی معاونت و متابعت سے تحریکِ مجاہدین ایسی عظیم تحریک برپا ہوگئی۔ عجیب حسن اتفاق ہے کہ بالکل اسی طرح علامہ مرحوم نے بھی مسلمانانِ ہند کی قومی جدو جہد کی کشتی کی ناخدائی کے لیے بلایا قائداعظم محمد علی جناح کو انگلستان سے‘ اور خود اپنی بھی عملی سرگرمی کو اسی قومی دائرے میں محدود رکھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ ان ہی کی ''تجدید فکر اسلامی'' تھی جس کے نتیجے میں اولاً مولانا ابوالکلام آزاد نے ''حکومتِ الٰہیہ'' کا نعرہ لگایا اور ''حزب اللہ'' قائم کی اور بعد ازاں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی میدان میں اترے‘ جنہیں حضرت علامہ ہی نے پنجاب نقل مکانی کی دعوت دی‘ جہاں کی فضا علامہ کی ملی شاعری کے ذریعے بہت ہموار اور سازگار ہو چکی تھی۔

3 تازہ حکمتِ عملی

پروفیسر محمد عارف خان

کی کتاب ''پاکستان سے اقبالستان تک'' (مطبوعہ 2009ء) کا ایک باب

برعظیم پاک و ہند کے اجتماعی فکری تناظر میں تازہ حکمت عملی درکار ہے جو اس بات کے تجزیے سے وابستہ ہے کہ کیا مسلمانوں کو ان کے عظیم ماضی یعنی ہندوستان سے الگ ہو کر ہندوستان کی تقسیمِ انتظامی کو ناگزیر قرار دے کر اور مسلمانوں کو اس کے عظیم ہندوستان سے ہٹ کر ایک کونے میں مختصر سے علاقے میں ایک آزاد یونٹ پاکستان کا قیام ہی آخری منتہائے مقصود تھا؟ اس سوال کے تجزیے اور تاریخی فکر کی روشنی میں اس کے جواب سے جدوجہد کشمیر اور پورے برعظیم کے مسلمانوں کے تحفظ و بقاء کے تازہ چیلنج سے نبٹنے کا گہرا تعلق ہے۔ شمالی علاقوں میں سمٹ جانے کا تصور دراصل ہندوستان میں سیاسی تبدیلی کے نتیجے میں مسلمانوں کے تحفظ کو لاحق خطرات سے نکلنے کے لیے واحد امکانی راستے کے طور پر تھا۔ پورے ہندوستان کو چھوڑ کر صرف شمالی علاقوں میں ایک مختصر سے علاقے میں ہمیشہ کے لیے سمٹ کر بیٹھ جانا تصورِ پاکستان نہ تھا۔ بلکہ علامہ محمد اقبال کی فکر کی بنیادی روح یہ تھی کہ مسلمان ہوئے سیاسی حالات میں ایک اقلیت میں تبدیل رہے ہیں جو آنے والے جمہوری فلسفے میں اپنی تہذیب وتمدن سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور بالآخر مٹ جائیں گے۔ اس لیے فوری حکمت عملی کے طور پر شمالی علاقوں میں سمٹ کر نئے سرے سے اپنی بقاء اور عروج کے لیے صف بندی کا تصور دیا۔ گذشتہ 58 سالوں میں اپنی بقا کے کئی نازک لمحوں میں سرخرو نکلا ہے بنگلہ دیش کا واقعہ تصورِ پاکستان کو نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ اقبال جس قومی شعور کی بات کرتا

ہے، یہ تصور پاکستان کا اگلہ مرحلہ ہے۔ غالبًا بنگلہ دیش کے قیام اوراس کی تلخیوں کا ہم نے احتیاط سے تجزیہ نہیں کیا بلکہ یہ کہوں گا کہ اس سارے تلخ عمل کو عمل ہم نے ہندوستان میں جاری مسلم تاریخی ورثے کے بطن سے اُبھرنے والی فکری زنجیر کے تناظر میں دیکھنے کے بجائے اسے وقتی مفادات کے تناظر میں دیکھا ہے۔ ہندوستان میں آزاد یونٹ مزید بنیں گے۔ یہ تاریخ کا عمل ہے۔ کشمیری مسلمانوں کے علاوہ سکھوں کی بھی ایک جدوجہد زوروشور سے جاری ہے۔ یہ جدوجہد بالآخر کامیاب ہوگی جبکہ باقی کئی ریاستیں بھی آزاد ہوں گی۔ دراصل اقبال نے اپنی فکر میں آئندہ کے آزاد یونٹوں کی بھرپور نشاندہی کی تھی۔ یہ آزاد یونٹ اپنے وقت کے دھاروں کے مطابق آپس میں تعلق کو آئینی اور قانونی صورت دے لیں گے۔ یہی تصور جدوجہد پر آمادہ کرتا ہےاور تصورت اقبالستان کوتقویت پہنچاتا ہے۔

اس ضمن میں ہماری حکمت عملی واضح ہونی چاہیے۔ مزید آزاد ریاستوں کا ہندوستان کے اندر قیام عوامی شعور کی مزید ترقی کا باعث ہوگا۔ بنیادی بات انسان کی بہتر افزائش اور بہبود ہے۔ عوامی شعور کی جتنی سطح تیزی سے بلند ہورہی ہے، سیاسی ومعاشی حق اور ضرورتوں کی سطح اور درجے بھی تبدیل ہورہے ہیں۔ استحصال کے خلاف بیسویں صدی ایک جدوجہد کی صدی شمار ہوتی ہے۔ استحصال مذہب کی بنیاد پر ہورہا ہو یا علاقہ، زبان، نسل اور رنگ کی بنیاد پر، دن بدن عوامی سمجھ میں آرہا ہے۔ بنیادی مقصد انسان کو خوف وغم سے پاک افزائش اور بہبود کا ماحول ومعاشرہ فراہم کرنا ہے۔

چیلنج کے اُبھرنے اوراس کا شعور حاصل ہوجانے کے بعد ایک تاریخی تسلسل وتواتر کے حاصل فکر کا تعین اوراس کی بنیاد پر سماجی قوت کا حصول لازمی عناصر کے طور پر ایک حکمت عملی کا تقاضا کرتے ہیں۔ حکمت عملی کے دو حصے ہوتے ہیں: ’’ایک جو عوامی ہوتا ہے جسے عوام کے شعور کا حصہ بنایا جاتا ہےاور تمام ممکنہ ذرائع استعمال میں لائے جاتے ہیں‘‘ جبکہ دوسرے حصے کا تعلق کسی منتظم گروہ کی اندرونِ خانہ حصول مقاصد کے لیے ممکنہ ذرائع اور طریق کار کے تعین سے ہوتا ہے۔ حکمت عملی کی بنیاد جس قدر انسانیت نواز ہوگی اتنی کامیاب ہوگی۔ اسلام کی خوبصورتی ہی یہ ہے کہ وہ خفیہ مقاصد اور حکمت عملی پر زور دیتا ہے نہ یقین رکھتا ہے۔ مسلمان دنیا کی واحد

سادہ قوم ہے جو اپنے مقاصد اور حکمت عملی خفیہ نہیں رکھتے۔ کیونکہ اسلام کا منشا انسانوں کو مسائل میں پھنسانا نہیں بلکہ حل کرنا ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد انسان اور کائنات اور تعلق باللہ ہوتی ہے۔ یہ علی الاعلان ہے۔ اس لیے بھارت کی سطح پر ایک ارب سے اوپر انسانوں کو ذات کا شعور بذریعہ ایک خدا کے عقیدے کے ساتھ دینا انسانیت کی خدمت کے مترادف ہے۔ یہ پہلے بھی ہوا ہے اور مسلمان اس کا نتیجہ ہیں مگر ایک خاص موقع پر مقاصد انسانی کا عقیدہ قدرے کمزور ہو تو دوسرے مقاصد از قسم علاقائی، مذہبی، لسانی، نسلی یا معاشی و سیاسی کے اسلامی حرکت کو کمزور کر دیا اور بالآخر ایک خدا کے عقیدے کی تحریک رک گئی اور انسان دوسری عصبیتوں میں کھو کر رہ گیا۔ اب ہم مسلمان ہیں، ہندو ہیں، عیسائی و بدھ اور سکھ اور دوسرے ہیں مگر ''انسان'' کتنے ہیں یہ سوالیہ نشان ہے؟

اسلام جب ہمیں صرف یہ سکھاتا ہے کہ آپ صرف انسانوں کو ایک خدا کی پہچان کرائیں، ایک خدا ہر مذہب کے اندر موجود ہے لیکن ابتدائے زمانہ سے بعض مذاہب میں یہ تصور قدرے دھندلا کر پیش کیا جاتا رہا۔ اسلام، مذاہب کا آخری ایڈیشن ہونے کی بنا پر زیادہ واضح صورت میں ایک تصور خدا پر زور دیتا ہے۔ بھارت کے منظر پر ''اقبالستان'' کے مقاصد قطعاً دشمنانہ نہیں ہیں کیونکہ ان مقاصد میں انسان کو دوسرے انسانوں کی گردن پر سوار ہو کر استحصالی رویے کو ختم کرنا ہے۔ سیاسی وسماجی، معاشی و تہذیبی طور پر ایک دوسرے پر غلبے کے تصور کو ختم کرنا ہے۔ بھارت کے اندر مزید خود مختار ریاستیں ہی انسان کو انسان کی گردن پر سوار ہونے اور استحصال سے محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ ہمارا خیالوں اور خوابوں میں رہنا بے عملی کی نشانی تو ہوسکتی ہے، حقائق کی نہیں۔ من موہن سنگھ بھارت کے وزیر اعظم بنے تو انھوں نے ہی سکھوں کے قتل عام کی معافی مانگی۔ یہ BJP اور کسی ہندو نمائندہ کو توفیق نہ ہوئی۔ کل گجرات سے مسلمانوں کے قتل عام کی معافی بھی مانگی جائے گی مگر سکھوں اور مسلمانوں کے قتل عام سے جو اقلیتوں کو پیغام دینا مقصود تھا، وہ تو دیا جا چکا ہے۔

''اقبالستان'' ایک حکمت عملی کے طور پر بھارت کے وسیع خطے میں مزید آزاد ریاستوں کی تشکیل کا نام ہے جو اپنے معاشی وسائل خود پیدا کریں اور ان وسائل کو اپنی حدود میں

اور اپنے سیاسی اقتدار کے تحت وہاں بسنے والے خط غربت سے نیچے رہنے والے انسانوں پر صرف کریں۔

دوسرے لفظوں میں عمرانی نقطہ نگاہ سے جس کسی عصبیت کی بنا پر انسان اکٹھے رہنے پر عار محسوس نہیں کرتے انہیں بطور انسان موقع ملنا چاہیے کہ وہ انسانی زندگی کو معاشی و سیاسی لحاظ سے بہتر بنا سکیں۔ اس سے ہندوستان یا بھارت کو نقصان نہیں ہوگا۔ انسانوں کا آپس میں دست و گریبان رہنا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ جیسے ایک دور میں انگریز نے اس کا فائدہ اٹھایا۔

بھارت میں آبادی مذہبی لحاظ سے بھی تقسیم ضرور ہے لیکن مذہب کی استحصال کے لیے استعمال میں لائے جانے کا سلسلہ تاریخی ہے۔ یورپ نے مذہبی استحصال کے خلاف بغاوت کی اور ترقی کی۔ روس اور اس کے حلقے نے بغاوت کی اور دنیا کی دوسری بڑی طاقت کی منزل تک پہنچ گیا۔ یہ غلط فہمی ہے کہ مذہب کو ان قوموں نے چھوڑ دیا تھا۔ مذہب کو نہیں چھوڑا تھا۔ مذہبی استحصالی طبقے کو چھوڑا تھا۔

بھارت میں ایک چوتھائی آبادی ایسی ہے جو محض اور محض اکیسویں صدی میں ذات پات کی تقسیم کے تحت مگر پوری مذہبی تائید سے مسلسل استحصال کا شکار ہے۔ اس طرح کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ ''اقبالستان'' فکر کے تحت ہم زور دیں گے کہ مذہبی عقیدے کو چھیڑے بغیر چھوٹی ذات کے ہندو کہلانے والوں کو ان کے انسانی حقوق حاصل ہوں۔ ان کی الگ ریاستیں قائم ہوں، مذہبی عقیدے اپنی جگہ رہیں۔ انسانی عقیدے کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔ جبکہ قریب قریب ایک چوتھائی آبادی مسلم اقلیت ہے جنھیں خوف و غم اور استحصال سے محفوظ رکھنے کے لیے ''اقبالستان'' کے تصور کو عملی شکل دینے کی ضرورت ہے جبکہ ایک اچھی خاصی تعداد عیسائیوں، بدھوں، سکھوں کی بھارت میں موجود ہے جو بہر حال مٹنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ انہیں بھی مناسب بندوبست کی ضرورت ہے۔

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے!
صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیلؑ
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لَآ اِلٰہ میں ہے!
وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں، جو تری نگاہ میں ہے!
مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے!
خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے!
تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہانِ تازہ مری آہِ صبحگاہ میں ہے!
مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے!

کلامِ اقبال (اردو) بالِ جبریل

4 قانونِ اسلامی کے مستقل مآخذ

ڈاکٹر اسرار احمد

کا قانونِ اسلام پر معلومات افزا لیکچر (1995ء)

خطبہ مسنونہ اور تلاوت آیات کے بعد......۔

یہ آپ کے سامنے اِس وقت ایک قرطاس ★ موجود ہے، اس کا پس منظر یہ ہے کہ کسی زمانے میں، میں نے خود اپنے ذہن کو واضح کرنے کے لیے ایک ڈایاگرام (DIAGRAM) بنائی تھی کہ ہمارے ہاں قانونِ اسلامی کے جو مآخذ ہیں کسی کے نزدیک کون کون سے مآخذ ابدی اہمیت کے حامل ہیں، کون کون سے ایسے ہیں کہ جن کی حیثیت صرف اپنے وقتی زمانے کے طور پر تھی وہ ابدی نوعیت کے نہیں ہیں۔ تو اس کے اعتبار سے جو مختلف مکتبہ ہائے فکر ہمارے ہاں موجود ہیں (اور اس مراد یہ ہے کہ مسلمانوں میں موجود ہیں، ہمارے ہاں نام کے مسلمان موجود ہیں ان میں وہ متجدّ دین بھی ہیں جو بہت ہی زیادہ آسانی یا آزادی چاہتے ہیں اور بہت کم قیود اور حدود اور پابندیوں کو گوارا کرنا چاہتے ہیں، تو ہر طرح کے جو بھی مسلمانوں کے اندر اس وقت مختلف مکتبہ ہائے فکر موجود ہیں) ان کی صحیح صحیح تشخیص ہو جائے اور اصل میں ان کے مابین فرق کیا ہے وہ ذرا ایک MATHEMATICAL انداز میں سامنے آجائے، تو میں نے خود اپنے لیے یہ ڈایاگرام بنائی تھی۔ اور یہ غالباً آج سے کوئی دس سال قبل کی بات ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ یہاں سٹاف کالج میں مجھے اجتہاد کے موضوع پر تقریر کے لیے بلایا گیا تو میں نے وہاں جو تقریر کی، مجھے

★ یہ قرطاس رنگین صفحہ ضمیمہ جات میں ملاحظہ فرمائیں۔

اپنی اُس تقریر کے لیے اِس ڈرائنگ سے بڑی آسانی حاصل ہوگئی اور مدد مل گئی میں نے جو محنت اس وقت کی ہوئی تھی اس سے میں نے اُس وقت استفادہ کیا اور بڑی سہولت کے ساتھ بات واضح کر سکا۔ پھر جب جمعے کے خطبہ کا معاملہ آیا تو (یہ بھی میں آپ سے عرض کر دوں کہ خاص طور پر لاہور میں جب کبھی مجھے جمعہ کا خطبہ دینا ہوتا ہے تو وہ خاصا مشکل مسئلہ بن گیا ہے اس لیے کہ اس کے لیے کسی موضوع کا تعین کرنا ہوتا ہے۔ اب ہمارے ہاں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو نہ معلوم کتنے عرصے سے جمعے میں آ رہے ہیں میری تقریریں سن چکے ہیں بہت مرتبہ تقریباً ہر موضوع پر گفتگوئیں ہو چکی ہیں۔ تو یہاں پر مجھے خاصی دقت ہوتی ہے) مجھے سہولت یہ محسوس ہوئی کہ میں نے جو تقریر سٹاف کالج میں کی تھی اس کو دو جمعوں میں میں نے بیان کیا۔ وہ بات پھر لوگوں نے پسند کی اور محسوس کیا کہ اس سے ہمارے اپنے بہت سے عقدے حل ہوئے ہیں اور ہمارا ذہن اس پر واضح ہوا ہے۔ اس کے بعد پھر یہ مشورہ بھی آیا کہ اس کو باقاعدہ تحریر میں لے آنا چاہیے اس لیے کہ واقعتاً لوگوں کے ذہنوں میں اس کا کوئی نقشہ واضح موجود نہیں ہے۔ وہ تحریر میں کب تک آئے گا، کب تک نہیں آ سکے گا اس کو ایک طرف رکھتے ہوئے، میں نے سوچا کہ اس مرتبہ جب یہ موقع مل رہا ہے تو یہ میں نے پھر چھپوا بھی لیا کہ آپ حضرات کے سامنے بھی موجود ہو اور اس کے حوالے سے کچھ باتیں بھی میں مزید EXPLAIN کر دوں اور خاص طور پر حال ہی میں جو میرا ذہن ایک خاص ISSUE پر معین ہو گیا ہے، اسے میں امانتاً آپ تک منتقل کر دینا چاہتا ہوں۔ اس کے ضمن میں چونکہ میری کچھ مختلف آرا بھی لوگوں کے سامنے آتی رہی ہیں اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں کنفیوژن بھی موجود ہے۔ یہ مجھے پہلے سے احساس تھا لیکن اس اجتماع کے دوران بھی مجھے ایک رفیق کا خط ملا ہے اور وہ بہت ہی مخلص اور بہت ہی جذبہ رکھنے والے اور دھن کے پکے ہمارے رفیق ہیں لیکن انھوں نے بھی اس ISSUE پر ایسا سخت موقف اختیار کیا ہے کہ اگر آپ یہ شکل کرتے ہیں تو پھر میرا تنظیم سے استعفاء ہے اور اگر آپ یہ کرتے ہیں تب میں تنظیم کے ساتھ چل سکتا ہوں۔ تو میں نے محسوس کیا کہ بروقت یہ معاملہ میرے ذہن میں آیا ہے کہ میں آپ کو اس چیز پر اپنا جو آخری ذہن ہے وہ بتا دوں۔

دیکھیں! عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسلامی قانون کے مستقل مآخذ چار ہیں:

قرآن، سنت، اِجماع اور قیاس۔ لیکن ان کے اعتبار سے ہمارے ہاں جو مختلف مکاتب فکر ہیں ان کو سمجھنے کے لیے پہلے اس ڈایاگرام کو آپ دیکھئے کہ اس کے درمیان میں جو سرخ لائن ہے یہ قرآن کو REPRESENT کر رہی ہے، لیکن ایک حد تک تو پوری ہے اور اوپر ڈاٹڈ (DOTED) ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں یہ پوری ہے وہ لوگ تو وہ ہیں جو قرآن کے کل کے کل کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ابدی ہے، اِلا یہ کہ خود قرآن مجید ہی کی کسی آیت نے کسی دوسری آیت کو جزوی طور پر یا کلی طور پر منسوخ کر دیا ہو۔ یہ معاملہ EXCEPTION میں رہے گا ورنہ یہ کہ وہ قرآن مجید کو واقعتاً جیسا وہ ہے، اس کی INTERPRETATION کا معاملہ علیحدہ ہو جائے گا لیکن جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے وہ اُن الفاظ کو قبول کرتے ہیں کہ یہ دائمی ہیں ہمیشہ کے لیے BINDING ہیں۔ اس میں ذرا سی میں آپ کو وضاحت بھی کر دوں کہ دنیا کے اندر جو مختلف مذاہب ہیں ان کے تصورات میں ایک تصور یہ بھی ہے مثلاً بائبل کے بارے میں تصور ہے کہ یہ VERBAL REVALATION نہیں ہے یعنی اس کی لفظی وحی نہیں ہوئی ہے بلکہ ایک مفہوم ہے کہ جو نازل ہوا ہے اور جس پر نازل ہوا اُس نے اس کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ لیکن ہمارا ایمان قرآن کے بارے میں یہ ہے کہ یہ لفظاً، اپنے انہی الفاظ کے ساتھ REVEAL ہوا ہے اور وحی کیا گیا ہے لہٰذا یہ وحی باللفظ ہے، صرف وحی بالمعنیٰ نہیں ہے بلکہ وحی ہے لفظ کے ساتھ۔ تو ایک ہے قرآن کے الفاظ کو، اس کے TEXT کو، اس کے کل کے کل کو ہمیشہ کے لیے ابدای ماننا اور ایک یہ ہے کہ نہیں، اس میں سے بھی کچھ حصے چھوڑے جا سکتے ہیں۔ وہ کیا ہیں؟ اس کو بعد میں ہم دیکھیں گے ابھی صرف اس لائن کو سمجھ لیں کہ یہ سرخ لائن قرآن کو REPRESENT کر رہی ہے۔ نیلی لائن سنت رسول ﷺ کو REPRESENT کر رہی ہے۔ اس میں بھی نیچے پوری ہے اور اوپر ڈاٹڈ شکل میں ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک سنت دائمی نہیں ہے بلکہ ایک خاص وقت تک کے لیے BINDING تھی، ہمیشہ ہمیش کے لیے نہیں ہے تو ان کا موقف اس ڈاٹڈ لائن سے سامنے آئے گا۔ تیسری چیز ہے اِجماع۔ اور یہاں اِجماع سے مراد ہے خلافت راشدہ کا اِجماع۔ اس لیے کہ خلافت راشدہ تک مسلمانوں کے اندر نہ تو ابھی کوئی سیاسی تقسیم موجود تھی کہ ملک علیحدہ علیحدہ ہوئے۔ اور خاص طور پر جو تین خلفاء ہیں خلفائے ثلاثہ یعنی حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین،

کہ ان کے دور میں جو اجماع ہو گیا گویا کہ وہ پوری اُمت کا اجماع سمجھا جائے گا۔ اس لیے کہ امت متحد تھی، ایک وحدت کی حیثیت سے تھی اور اس کو گویا کہ امت نے قبول کر لیا۔ یہ بھی ایک مستقل SOURSE ہو گیا ہے اسلامی قانون کا۔ اجماع سے مراد، اجماعِ دورِ خلافتِ راشدہ ہے۔ اس گرین لائن میں بھی آپ کو نظر آ رہا ہے کہ وہ FULL بھی ہے BOLD بھی ہے اور اس کے اندر DOTED PORTION بھی ہے۔ پھر اس کے بعد یہ جو پیلے رنگ والی لائن ہے یہ قیاس کے لیے ہے۔ تو عام طور پر ہمارے ہاں مشہور یہ چار اسلامی قانون کے مآخذ (SOURSES OF ISLAMIC LAW) ہیں۔

اب آپ بائیں ہاتھ کی طرف دیکھئے۔ ایک ہمارے ہاں متجدّ دین کا مکتب فکر ہے جس کے خیال میں قرآن بھی پورا کا پورا ابدی طور پر BINDING نہیں ہے، قرآن سے بھی ہمیں صرف اصول لینے ہیں SPECIFICS اور تفاصیل اور معین چیزیں صرف اُس معاشرے کے لیے تھیں جس معاشرے میں قرآن نازل ہوا، اصول لیجیے اور بنیادی اخلاقی تعلیمات لیجیے باقی یہ کہ جو بھی SPECIFICS کسی معاملہ میں خاص فیصلہ کر لیا گیا۔ چوری بری چیز ہے لیکن چوری پر ہاتھ کاٹا جائے یہ SPECIFICS بات ہو گئی۔ یہ تو معلوم ہو گیا کہ چوری بری شے ہے چوری نہیں ہونی چاہیے لیکن اس لیے ایک معین حد آ گئی ہے وہ ابدی نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے۔ تو یہاں پہلا نمبر یہ ہے کہ ہمارے ہاں کچھ لوگ ہیں جو قرآن کو بھی کل کے کل کو ابدی طور پر BINDING نہیں مانتے۔ اس کے بعد دوسرا مسئلہ آتا ہے کہ کچھ لوگ قرآن کو تو وہ کل کے کل کو BINDING مانتے ہیں لیکن سنت رسول ﷺ کو وہ صرف حضور کے اپنے زمانے میں واجب الاتباع اور واجب الاطاعت مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کی حیثیت اپنے زمانے میں مرکز ملت کی تھی مسلمانوں کے صاحب اقتدار اور صاحب امر کی تھی لہٰذا ان کا حکم اس وقت واجب التعمیل تھا بحیثیت رسول خدا ان کے احکام وہی سمجھے جائیں گے جو قرآن میں آ گئے ہیں باقی اس کی جو APPLICATION انہوں نے اپنے زمانے میں کی ہے جس شکل میں کی ہے اس میں انہوں نے اپنے زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھا ہے، یہ چیز ہمیشہ کے لیے BINDING نہیں ہے۔ یہ موقف ان لوگوں کا ہے جو ہمارے ہاں اہل قرآن کہلاتے ہیں یا منکرین سنت کہلاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو سنت کا

معاملہ ہے یہ درحقیقت مرکزِ ملت، محمد رسول اللہ ﷺ اپنے وقت میں اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ، اصل میں مستقل اطاعت اللہ کی ہے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت صاحب امر کی حیثیت سے ہے، اور یہ ان کا معاملہ ان کی زندگی کے ساتھ ختم ہوگیا ہے، اب یہ چیز ہمیشہ ہمیش کے لیے اسلامی قانون کا SOURSE نہیں ہے۔ یہ ہیں منکرین سنت یا اہل قرآن۔ آپ کو یاد ہوگا کہ غلام احمد پرویز صاحب جو ایک رسالہ چھاپتے تھے اس کے ٹائٹل پر ایک حدیث ضرورت دیتے تھے یعنی حدیثیں وہ جو اخلاقی نوعیت کی ہیں، جو عام قسم کی چیزیں ہیں، جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں وہ تو ظاہر بات ہے کہ مابہ النزاع نہیں ہیں۔ اصل میں تو یہاں قانون کی بات ہو رہی ہے۔ وہ احادیث جن کا تعلق قانون سے ہے جن کے نتیجے میں کوئی شے فرض قرار پاتی ہے یا واجب قرار پاتی ہے یا جن کے نتیجے میں کوئی شے حرام قرار پاتی ہے یا مکروہ تحریمی قرار پاتی ہے، تو قانون کے اعتبار سے اہمیت رکھنے والی احادیث ان کے نزدیک وہ صرف حضور کے اپنے زمانے میں تھیں آپ ﷺ کے بعد جو بھی مرکز ملت ہو اور جو بھی اسلامی ریاست قائم ہوگی اس میں جو اولوا الامر ہوگا اسے پورا اختیار ہوگا کہ قرآن مجید کی INTERPETATION وہ کرے قرآن کے الفاظ تو اسے اپنے سامنے رکھنے ہوں گے لیکن INTERPETATION کرنے کا اسے حق ہوگا وہ قرآن کی عملی تعبیر کے لیے سنت رسول کا پابند نہیں ہے۔ یہ موقف ہے منکرین سنت یا اہل قرآن کا۔ ان دونوں موقفوں کے بارے میں وہ الفاظ لکھ لیجیے ضَلُّوۡا ضَلٰلًا بَعِیۡدًا ۔ یہ تو راہِ حق سے صراط مستقیم سے بہت دور نکل گئے اس زیادہ اس کی مذمّت میں یا اس کے اوپر تنقید کرنے میں وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب آیئے جو ہمارے لیے اہم اور سمجھنے کے لیے جو ضروری بات ہے۔

تیسرا مسلک ان حضرات کا ہے جن کو ہم اہل حدیث یا سلفی حضرات کہیں گے۔ اب دیکھئے کہ ان کے لیے قرآن بھی BINDING، وہ تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن ابدی ہے، سنت رسول ﷺ بھی BINDING لیکن خلافت راشدہ کے دوران ہونے والا اجماع، یہ ابدی نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک بڑا ہی خوبصورت لفظ ایک دفعہ مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے استعمال کیا تھا جب میری ان سے گفتگو ہو رہی تھی کہ یہ EXECTIVE ORDERS کی حیثیت ہے۔ ایک وقت

میں اُس صاحب امر نے جو بات صحیح سمجھی اُس نے حکم دے دیا وہ اس وقت تو اس کے TENURE کے دوران اس کے عہد میں تو واجب الاطاعت تھا لیکن وہ ہمیشہ کے لیے BINDING نہیں ہے یعنی یوں سمجھئے کہ جو موقف سنت رسول ﷺ کے بارے میں منکرین سنت کا ہے وہی موقف اجماع کے بارے میں اہل حدیث حضرات کا ہے کہ منکرین سنت کے نزدیک وہ سنت رسول صرف اپنے وقت کے لیے تھی اس وقت آپ مطاع تھے بحیثیت مرکز ملت اور بحیثیت اولوالامر، اس وقت وہ واجب الاطاعت تھی لیکن مستقل نہیں ہے۔ ان حضرات کے نزدیک بھی اصول کے طور پر سنت رسول ﷺ تو ہمیشہ کے لیے BINDING ہے لیکن جو خلفائے راشدین کے اجتہادات ہوں یا خلفائے راشدین کے دور میں بھی کسی نے کوئی اجتہاد کیا جب وہ نافذ ہو گیا تو گویا کہ امت نے اسے قبول کرلیا اب ریفرنڈم تو وہاں کبھی ہوئے نہیں ہیں لیکن جب اس کو تسلیم کرلیا گیا اور اس کو قبولِ عام حاصل ہو گیا تو وہ اب اجماع کی شکل بن گی۔ لیکن ان کے نزدیک وہ اجماع ان کے اپنے دور میں تو واجب الاطاعت تھا وہ واجب التنفیذ تھا لیکن وہ ابدی نہیں ہے۔ اب اسی میں آپ جوڑ لیجیے شیعہ حضرات کو بھی۔ خلافت راشدہ سے تو انہیں ویسے ہی بیر ہے لہٰذا وہ اس اعتبار سے ان کو ویسے ہی صحیح نہیں سمجھتے، وہ تو سمجھتے ہیں کہ یہ غاصب خلافت تھی لہٰذا اس معاملے میں آ کر ان کا اور اہل حدیث کا عملی اعتبار سے موقف ایک ہی ہے یعنی خلافت راشدہ کو تسلیم کرنا اور اس کو سمجھنا کہ وہ برحق تھی وہ تو اپنی جگہ ٹھیک ہے اس کا تعلق عقیدے سے ہے لیکن عملی اعتبار سے اہل تشیع اور اہل حدیث یا سلفی حضرات گویا کہ ایک جگہ کھڑے ہیں کہ خلفائے راشدین کے اجتہادات کی حیثیت EXECTIVE ORDERS کی تھی اپنے وقت میں الوالامر کے احکام کی سی تھی وہ BINDING نہیں ہے وہ قانون اسلامی کا مستقل SOURSE نہیں ہے۔ البتہ جہاں فرق ہو جائے گا اہل حدیث حضرات میں اور اہل تشیع میں وہ یہ ہے کہ اہل تشیع صرف ان احادیث کو تسلیم کرتے ہیں کہ جو ائمہ اہل بیت سے ان کو ملی ہیں باقی صحابہ کرام کی مرویات کو وہ تسلیم نہیں کرتے جبکہ اہل حدیث کا معاملہ یہ نہیں ہے البتہ وہ اصولی اور عملی طور پر ان کا اتحاد ہو گیا۔ اسی سے آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا طلاقِ ثلاثہ مسئلہ کہ ایک مجلس کی اگر تین طلاقیں ہیں تو ان تینوں کا BINDING ہو جانا چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی سختی کے ساتھ تنفیذ کی تھی۔ اس کو نہ شیعہ مانتے ہیں نہ اہل حدیث مانتے ہیں۔

اسی طریقے سے تراویح کا معاملہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے جو اس کا نظام بنایا تھا، اہل حدیث حضرات اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ کے طرز عمل میں نہیں ہے۔ ویسے تو اس طریقے سے باجماعت جو تراویح ادا کرنا ہے وہ بھی صرف تین دفعہ کے لیے ثابت ہے، پورے مہینے کے لیے نہیں ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے، میں اس مسئلے کو واضح نہیں کرنا چاہتا کہ مجھے ان سے اس معاملے میں کس کس پہلو سے اختلاف ہے لیکن یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں آپ کی سمجھ میں آجائیں گی اس بنیاد پر۔ یہ فرق کیوں ہے؟ فرق یہ ہے کہ ان کے نزدیک قرآن ابدی، سنت رسول ﷺ ابدی، یہ تو ہے BINDING ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لیکن خلفائے راشدین برحق تھے صحیح تھے خلافت راشدہ تھی اس میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں لیکن خلفائے راشدین کے اجتہادات چاہے اس پر اُس وقت اُمت کا اجماع بھی ہوگیا وہ وقتی EXECTIVE ORDERS اور انتظامی احکام تصور کیے جائیں گے وہ قانونِ اسلامی کا مستقل SOURSE نہیں ہے۔

یہ اس وجہ سے 'اہل السنّت والجماعت' کہلاتے ہیں۔ اہل سنت میں تو اہل حدیث بھی آگئے اور اس کے بعد جو بقیہ ہم لوگ ہیں حنفی ہو، مالکی ہو، شافعی اور حنبلی ہو وہ بھی اس میں آگئے۔ لیکن اسی لیے لفظ 'الجماعت' کا اضافہ ہوتا ہے کہ وہ جو دورِ خلافت راشدہ کا اجماع تھا، اس کو بھی وہ BINDING مانتے ہیں کہ دور خلافت راشدہ کا اجماع اب ہمیشہ کے لیے ہے۔ جو بات کسی خلیفہ راشد کے اجتہاد سے سامنے آئی اور اس کو امت نے قبول کرلیا یہ گویا کہ تیسری مستقل SOURSE ہے قانون اسلامی کی۔ وہ BINDING ہوگئی اسی طریقہ سے جیسے قرآن BINDING ہے، وہ BINDING ہوگئی ابدی طور پر اسی طرح جیسے سنت رسول ﷺ BINDING ہے۔ یہ ہے اہل السنّت والجماعت۔ اس میں قرآن + سنت + اجماعِ خلافت راشدہ۔ اجماع کا لفظ جَمَعَ سے ہے کہ جو بھی مسلمانوں کی اُمت کا ایک مجموعی فیصلہ اُس وقت ہوا ہے وہ اس کو مستقل BINDING مانتے ہیں۔ اور پھر دلیل ہے وہ حدیث نبوی جس کو تمام محدثین صحیح مانتے ہیں عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْن۔ یہ حدیث بھی موجود ہے مَا اَنَا عَلَیْهِ وَ اَصْحَابِیْ میرا عمل اور میرے صحابہ کا عمل۔ تو یہ معلوم ہوا کہ اس اعتبار سے یہ بھی ایک مستقل SOURSE ہے۔ یہ فرق ہوگیا اہل حدیث اور جو بھی چار ہماری فقہیں ہیں اُن کے مقلدین یا متبعین میں۔

چوتھی چیز ہے اب اجتہاد کہ جو معاملات بعد میں اٹھے جس کا کوئی حکم قرآن وسنت میں واضح نہیں۔ جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا تھا وہاں عامل (گورنر) بنا کر تو سوال کیا کہ وہاں جو معاملات تمہارے سامنے آئیں گے کیسے طے کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا: اللہ کی کتاب سے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر قرآن میں تمھیں اس کا معاملہ نہ ملے؟ تو عرض کیا فَبِسُنَّۃِ رَسُوْلِہٖ پھر میں اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو دیکھوں گا۔ فرمایا کہ اگر وہ بھی نہ ملے تو پھر؟ اس کے بعد انہوں نے عرض کیا ثُمَّ اَجْتَھِدُ۔ ابھی اجماع کا دور تو آیا ہی نہیں تھا وہ تیسری شق تو بیچ میں سے کٹ گئی اب تو براہِ راست اجتہاد کا دور ہے۔ تو انہوں نے عرض کیا: ثُمَّ اَجْتَھِدُ۔ پھر میں خود کوشش کروں گا۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو شاباش دی اُن کا کاندھا تھپکا، اور فرمایا کہ اُس اللہ کا شکر ہے جس نے اللہ کے رسول کے رسول کو صحیح بات تک ہدایت دے دی، کہ سب سے پہلے قرآن ہے پھر سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور اس کے بعد اجتہاد ہے۔ یہ اجتہاد جب خلفائے راشدین نے کیا تو ہے تو وہ بھی اجتہاد لیکن وہ اجتہاد اس دور کا ہے جب امت ایک وحدت تھی اور نظام صحیح صحیح علیٰ منہاج النبوۃ قائم تھا لہٰذا اس اجتہاد کے بارے میں دو رائیں ہوگئیں کہ یہ اجتہاد صرف اپنے وقت کے لیے نہیں ہے بلکہ BINDING ہوگیا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یا یہ اپنے وقت کے لیے ہے۔ اب اس کے بعد ظاہر ہے کہ جب نئے نئے مسائل پیدا ہوئے، پوری مملکت قائم ہوگئی، نئے معاملات جو سامنے آئے اب اجتہاد بڑے پیمانے پر ہوا۔ مجتہدین میں سے جو مجتہدین مطلق ہیں امام ابوحنیفہ ہیں، ان کا ایک مکتبہ فکر قائم ہوگیا، امام مالک ہیں ان کا ایک مکتبہ فکر قائم ہوگیا انہوں نے اپنے اپنے اصول بنائے کہ قرآن سے استنباط کریں گے تو کیسے کریں گے اور اسی طریقے سے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے استنباط کریں گے تو کیسے کریں گے۔ اگر حدیثوں میں کوئی تعارض ہوجائے تو کیسے طے کریں گے کہ کونسی حدیث پر عمل ہوگا۔ فرض کریں کہ دونوں حدیثیں سند کے لحاظ سے برابر ہورہی ہوں۔ مثال کے طور ایک حدیث یہ کہہ رہی ہے کہ فجر کے بعد سورج کے طلوع ہوجانے تک کوئی نماز نہیں اور عصر کے بعد سورج کے پوری طرح غروب ہوجانے تک کوئی نماز نہیں۔ ایک دوسری حدیث یہ ہے کہ جب بھی مسجد میں جاؤ تو مسجد کا حق ہے کہ دو رکعتیں پڑھو، تحیۃ المسجد پڑھو، اس کے بعد بیٹھو۔ اب کیا کیا جائے؟ یہ حدیثیں فرض کیجیے،

میں پورے تیقّن کے ساتھ نہیں کہہ رہا لیکن یہ کہ فرض کیجیے کہ یہ دونوں حدیثیں سند کے لحاظ سے بالکل مساوی ہیں دونوں ہی متواتر ہیں یا دونوں ہی حسن ہیں یا دونوں ہی صحیح ہیں، دونوں قابل قبول حدیثیں ہیں اور ایک درجہ میں ہیں اب اس میں کیا کریں گے؟ تعارض آ گیا۔ مثلاً ایک شخص فجر کی نماز پڑھ چکا تھا......اب اگر وہ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے پہلے مسجد میں آیا ہے تو کیا وہ تحیۃ المسجد پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟، یا عصر کے بعد مغرب سے 15 منٹ پہلے کوئی شخص مسجد میں پہنچ گیا ہے مغرب کی اذان ابھی نہیں ہوئی ہے تو وہ وہاں نماز پڑھ کر بیٹھے یا یہ کہ وہ دو رکعت نہ پڑھے۔ اب اس میں مختلف رائیں ہو جائیں گی کہ کس کو کس حوالے سے ترجیح دینی چاہیے۔ یہ اصول سے متعلق معاملہ ہے کہ یہ اصول احناف کے ہیں یہ اصول شوافع کے ہیں۔ اصول پر سب سے پہلی تصنیف امام شافعی کی ہی ہے ’کتاب الاُمّ‘، اور بہت ہی ضخیم اور بہت عمدہ کتاب ہے۔ لیکن یہ کہ ہر مکتبہ فکر نے اپنے اصول بنا لیے ہیں کہ قرآن سے استنباط اور سنت سے استنباط کے لیے کیا اصول ہوں گے۔ اس کے اعتبار سے پھر ہمارے ہاں یہ چار اہل سنت کے مکاتب فکر بن گئے یعنی قرآن کی سرخ لکیر بھی آ رہی ہے، سنت کی نیلی لکیر بھی آ گئی پھر یہ اجماعِ صحابہ یا اجماعِ خلافت راشدہ کی ہری لائن بھی آ گئی اور پھر پیلی لکیر آئی ہے۔ یہاں آپ سمجھئے کہ یہ جو پیلی لکیر اس پہلے دائرے میں آئی ہے یہ امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کے اجتہادات ہیں۔ اسی طریقے سے قرآن، سنت، اِجماع اور پھر امام شافعی کے اجتہادات ہیں، امام مالک کے اجتہادات اسی طریقے سے امام احمد ابن حنبل کے اجتہادات۔ اس سے یہ چار مسلک ہمارے ہاں ہیں۔ یہ ہے ایک INSIGHT کہ ان کے مابین جو بنیادی فرق ہے ان کی APPROACH کے درمیان جو فرق ہے۔ ایک تو ہے مسائل کے درمیان اختلاف، وہ تو معلوم ہے لیکن مسائل میں اختلاف کس بنیاد پر ہے اس کے فہم کے لیے یہ ڈایا گرام ان شاءاللہ آپ کو بہت مفید رہے گی، اسے اپنے پاس رکھیے، فریم کرائیے، شیشے کے نیچے رکھ لیجیے ان شاءاللہ اس کے حوالے سے ایک INSIGHT حاصل ہو جائے گی کہ ہمارے ہاں مختلف جو مکاتب فکر ہیں اُن میں اختلاف کس درجے کا ہے۔

ان میں سے دو اوپر کے مکاتب کے بارے میں میں آپ سے ایک بات عرض کر دوں کہ علامہ اقبال کی بھی بعض عبارتوں سے پہلے دو قسم کے خیالات کا ترشّح بھی ہوتا ہے۔ اگر غلام احمد

پرویز نے اپنے آپ کو علامہ اقبال کی طرف منسوب کیا ہے تو بالکل بے بنیاد نہیں ہے۔اسی لیے 1967ء میں، میں نے جو مضمون لکھا تھا ''اسلام کی نشأۃ ثانیہ، کرنے کا اصل کام'' اُس میں جہاں میں نے ایمانی حقائق کے اثبات کے لیے جدید علم کلام جو اقبال نے شروع کیا ہے اس کی پوری تائید کی ہے اس کی میں نے مدح کی ہے کہ اس رخ پر آج کے دور کے لیے جو جدید علم کلام درکار ہے اس کا پہلا PRIMER (قاعدہ) جسے کہا جائے گا وہ علامہ اقبال کے SIX LECTURES ہیں (اس کے بعد اس کام کو آگے بڑھایا ہے ڈاکٹر رفیع الدین نے) لیکن یہ ہے کہ اسی وقت میں نے نوٹ کروا دیا تھا کہ جہاں تک اجماع، قانون اسلامی اور اجتہاد وغیرہ کے معاملے میں جو ان کے تصورات ہیں وہ محل نظر ہیں اور میں ان کی تائید نہیں کرتا۔ان کے اندر کچھ عبارتیں ایسی ہیں جن سے وہ لوگ استنباط کر سکتے ہیں استشہاد کر سکتے ہیں استدلال کر سکتے ہیں۔لیکن میرے نزدیک یہ ہے کہ علامہ اقبال کی وہ باتیں میرے لیے کوئی سند نہیں ہیں کسی درجہ میں قابل قبول نہیں ہیں اور اسی لیے میں سن 1967ء میں بھی اس بات کو ریکارڈ پر لے آیا تھا کہ یہ نہ ہو کہ بعد میں یہ کہا جائے کہ یہ ساری چیزیں جو ہیں 'مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید......' والی باتیں ہیں۔اللہ شکر ہے کہ بروقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی ملتی رہی ہے کہ میں ان تمام چیزیں کو بھی ریکارڈ پر لے کر آتا رہا ہوں۔ انجمن جب بنائی تھی تب انجمن کے تجویزی خاکے کے ساتھ یہ لکھ دیا تھا کہ یہ اس کا صرف پہلا قدم ہے، میرے پیش نظر اصلاً بیعت کی بنیاد پر ایک جماعت قائم کرنا ہے۔میں نے یہ اسی وقت لکھ دیا تھا کہ مبادا انجمن کے لوگ بعد میں یہ کہیں کہ تم نے ہمیں گندم دکھا کر ہمارے ہاتھ جو فروخت کر دی ہے، تمہارے ارادے کچھ اور تھے دل میں چھپائے بیٹھے تھے۔چونکہ یہ مسئلہ بعد میں پیدا ہوا اور بہت سے حضرات نے اعتراض کیا کہ انجمن کے بعد تنظیم کی ضرورت کیا ہے؟ اس کے سلسلے میں بھی کچھ بات آج اِن شاء اللہ آپ کے سامنے آجائے گی۔لیکن اسی طریقے سے اسی میں میں نے لکھ دیا تھا کہ میرا تو یہاں پر VETO ہوگا، میں جمہوریت کا قائل نہیں ہوں اور پھر جب بھی دستور چھپا ہے میں نے ہمیشہ ان دو تحریروں کو لازماً اس میں شامل رکھا ہے تاکہ یہ معلوم رہے کہ بالکل آغاز ہی میں یہ تمام بات کلیئر کر دی گئیں تھی۔لہٰذا علامہ اقبال کے بھی بنیادی اصول، ایمانیات کے اثبات کے لیے ان کا اسلوب وہ طریقہ جو انہوں نے بیان کیا وہ بہت صحیح ہے اس میں بھی کہیں کہیں ہمیں

ان سے اختلاف ہے لیکن یہ ہے کہ جہاں تک تعلق ہے ان کا اجتہاد THE PRINCIPLE OF MOVEMENT IN THE STRUCTURE OF ISLAM اسلام کی جو عمارت ہے یہ وہ قانونی ڈھانچہ ہے، اس اندر حرکت کا جو ان کے نزدیک تصور ہے، ان کی بات ذاتی رائے ہے۔ حالانکہ ان کے جو اشعار اور شاعری ہے اس میں پوری تقلید بھی ہے اور سنت رسول ﷺ کی پوری پابندی بھی ہے اگر آپ رموز بے خودی پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شاید بڑا سے بڑا عالم دین بھی اتباعِ سنت کے لیے اتنی زوردار باتیں نہیں کہہ سکتا جو علامہ اقبال نے کہیں ہیں لیکن یہ ہے کہ ان 6 لیکچرز چونکہ نثر کی ایک کتاب ہے وہ ان کے ایک فلسفے کی کتاب ہے اس میں کچھ چیزیں ایسی موجود ہیں کہ جن سے یہ پہلے دونوں مکتبہ ہائے فکر کسی نہ کسی درجہ میں استشہاد کر سکتے ہیں لیکن ہم اس سے اعلانِ براءت کرتے ہیں۔

دوسری بات جو مجھے آپ کے سامنے واضح کرنی تھی وہ یہ کہ میرے جو تین موقف آتے رہے ہیں جس میں کہ کچھ اُلجھن رہی ہے ایک تو یہ کہ ہمیشہ میرا اپنا طرز عمل بھی رفقا نے دیکھا کہ میں رفع یدین بھی کرتا ہوں میں کہتا بھی ہوں کہ میں عملاً خاص طور پر عبادات کے معاملے میں فقہ سے کم اور نبی اکرم ﷺ کی جو احادیث سامنے آجائیں ان سے زیادہ یعنی اس کی پیروی کرتا ہوں یا WEIGHTAGE کا لفظ استعمال کرلیں کہ میں ان کو زیادہ WEIGHTAGE دیتا ہوں وغیرہ وغیرہ لیکن کبھی میں نے یہ بھی کہا ہے کہ چونکہ یہاں پر مسلمانوں کی، پاکستان کے باشندوں کی عظیم اکثریت، وہ فقہ حنفی کی قائل ہے تو یہاں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے تو مجھے قابل قبول ہوگی۔

ایک تیسری بات جو میں نے کبھی نہیں کہی ہے وہ آج میں واضح کرنا چاہتا ہوں وہ سمجھ لیجیے۔ پہلی بات تو وہ، جو اسی ڈایاگرام میں نیچے ہے، یہ جو ایک درمیان میں (ذرا سا حصہ سکرین کے ساتھ آیا ہے) مستطیل۔ موجودہ وقت میں سنی مسلمان کے لیے میرے نزدیک مناسب ترین طرز عمل یہ ہے۔ وہ طرز عمل کیا ہے؟ یہ جو چاروں فقہیں ہیں اس مستطیل میں ان چاروں کا آغاز شامل ہے، یہ چاروں چونکہ اہل سنت کے ہاں تسلیم کی جاتی ہیں کہ یہ صحیح ہیں حنفی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ فقہ مالکی بھی صحیح ہے اور فقہ حنبلی بھی صحیح ہے اور فقہ شافعی بھی صحیح ہے۔ اعتراض وہ اس پر یہ کرتے ہیں کہ تم حنفی ہو تم استشہاد نہیں کر سکتے امام مالک کے قول سے، تم حنفی ہو تو تم کوئی دلیل نہیں لا سکتے

امام شافعی کے قول سے۔ میرے نزدیک اور جو میرا طرزِ عمل رہا ہے جس کو میں نے برملا بھی بیان کیا ہے اور اس پر بعض علماء کرام کی طرف سے مخالفانہ مضامین بھی آئے، وہ سب چیزیں چھپی ہوئی ہیں ''جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی'' نامی کتاب کے اندر۔ وہ یہ ہے کہ میرا موقف یہ رہا ہے کہ جہاں یہ چاروں ایک ہو جائیں وہ تو گویا اس مستطیل کا اوپر کا حصہ ہے۔ اس مستطیل میں وہ حصے بھی شامل ہیں جن میں ابھی BRANCHING نہیں ہوئی اور کچھ تھوڑا سا حصہ وہ شامل ہے جس میں BRANCHING ہو گئی ہے تو میرے نزدیک جس مسئلے میں یہ چاروں مکاتب فقہ متفق ہوں میں نے اپنے اوپر پابندی لگائی ہوئی ہے کہ میں اس سے باہر نہیں جاؤں گا اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں یہ نہیں سمجھتا کہ اجتہاد مطلق کا دروازہ بند ہو گیا وہ اجتہاد مطلق کہلاتا ہے۔ یہ لفظ بھی سمجھ لیجیے اجتہاد فی المذہب اور اجتہاد مطلق۔ اجتہاد فی المذہب کا مطلب کیا ہے کہ یہ جو ایک فقہ حنفی بن گئی ہے BRANCHING کے بعد جو چاروں چیزیں جڑ کر آ گئیں قرآن، سنت، اجماع اور قیاسات حضرت امام ابوحنیفہ کے یا قاضی ابو یوسف کے یا امام محمد کے یا امام زفر کے بہرحال جو بھی فقہ حنفی بن گئی اس کے جو اصول معین ہو چکے ہیں ان اصولوں کے تحت آگے اجتہاد کرنا یہ اجتہاد فی المذہب کہلاتا ہے، ان اصولوں کے دائرے کو CROSS نہیں کریں گے آپ۔ اور ایک یہ ہے کہ کوئی شخص ان اصولوں کے دائرے سے آگے جا کر اجتہاد کرنا چاہے تو پھر وہ مجتہد مطلق شمار ہو گا۔ ہمارے ہاں مقلدین علماء جو احناف کے موجود ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم اجتہادِ مطلق کا دروازہ بند نہیں سمجھتے، ممکن ہے کہ کوئی مجتہد مطلق پیدا ہو جائے، لیکن اس وقت جو علم کی صورت حال ہے اور اس وقت جو لوگوں کے کردار کا، ان کی للّٰہیت کا، ان کے ایمان کی جو سطح ہے اس میں مناسب ہے کہ اس کا دروازہ بند رکھا جائے ورنہ بڑے فتنے شروع ہو جائیں گے۔ وہ درحقیقت اس اعتبار سے یہ سمجھتے ہیں کہ مناسب یہی ہے ورنہ فتنے کے دروازے کھل جائیں گے ورنہ اجتہاد مطلق ہو سکتا ہے نظری اعتبار سے وہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ بہرحال میں چونکہ نہ تو مجتہد فی المذہب ہوں نہ مجتہد مطلق ہوں لہٰذا میں نے جو طے کیا وہ یہ ہے کہ جن چیزوں پر تو یہ چاروں متفق ہیں چاہے میری عقل اسے مانے یا نہ مانے، میری اپنی رائے اس سے اِباء کرتی ہو۔ ظاہر بات ہے کہ قرآن مجید کی بھی کوئی بات میرے عقل کے سانچے میں اگر نہیں آئے گی تو اسے ردّ تو نہیں کر سکتا وہ قرآن مجید ہے

مجھے ماننا ہے ہمیں عقل کو قرآن پر حاکم نہیں بنانا قرآن کو اپنی عقل پر حاکم بنانا ہے۔ تو اگر میری عقل میں بات نہیں آ رہی تو نہ آئے، میری مجبوری ہے، میرا قصور فہم ہے، میری تقصیر ہے، قرآن برحق ہے۔ اسی طرح سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات ہو سکتی ہے کہ جو میری عقل کے معیارات یا تقاضوں پر پوری نہ اترتی ہو۔...... یہ ساری باتیں قانون اور شریعت اسلامی کے ضمن میں ہو رہی ہیں۔ باقی جو چیزیں سائنٹفک، phenomenal ہوتی ہیں وہ بالکل علیحدہ ہیں۔ قانون سے تعلق رکھنے والی جو چیزیں ہیں ان کے بارے میں بات ہو رہی ہے۔ فرض کیجیے کوئی چیز میری سمجھ میں نہیں آتی نہ آئے، میں اپنی سمجھ سے استعفا دوں گا اور اگر سنت ثابتہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو میں اسے اختیار کروں گا۔ اسی طرح جن چیزوں پر یہ چاروں متفق ہو گئے، چاہے وہ میری عقل میں نہ آئے۔ اور اس میں میں آپ کے سامنے کھول کر بات کر دیتا ہوں کہ یہ طلاقِ ثلاثہ والا مسئلہ میری عقل میں نہیں آیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بہت ہی اپنے آپ کو کھینچ تان کر کے، کچھ اور شرطیں لگا کر ایک ہی مجلس کی تین طلاقوں کو اگر آپ مغلظ مان لیں تو لازم ہے کہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعزیر بھی رکھیں، طے کر دیں کہ اگر کوئی شخص ایک دفعہ میں تین طلاق دے گا تو اسے دو سال کی سزا ہو جائے گی، پھر غصہ نہیں آئے گا جو لوگ غصہ میں آ کر ایک دم تین طلاقیں دے دیتے ہیں انہیں معلوم ہو کہ بیس کوڑے لگیں گے جیسا کہ حضرت عمرؓ لگواتے تھے۔ اس میں فساد یہ ہوا کہ کوڑے والی بات رہ گئی اور دوسری چل پڑی۔ بہر حال یہ چیز میں عقل کے اعتبار سے صحیح نہیں سمجھتا لیکن چونکہ چاروں ائمہ کا اور چاروں ہمارے مکاتب فقہ کا اس پر اتفاق ہے تو میں نے اپنی عقل کو علیحدہ رکھا ہے۔ میں نہ اس کا اظہار کرتا ہوں نہ اس کی رائے دیتا ہوں۔ یہ بھی میں نے آپ کو اپنی بات بتا دی ہے ورنہ کوئی شخص میرے پاس آ کر اگر کہتا ہے کہ مسئلہ پوچھنا ہے تو میں کہتا ہوں کہ طلاق کا مسئلہ ہے تو کہیں اور جاؤ، میں اس میں کوئی رائے نہیں دوں گا۔ تو یہ میرا طرز عمل ہے کہ جن چیزوں پر یہ چاروں متفق ہوں اُن پر تو میں اس دائرے سے تو باہر نہیں نکلتا لیکن یہ میرا ایک احتیاطی معاملہ ہے البتہ جہاں چاروں کا اختلاف ہو، میں تو چاروں کو برحق مانتا ہوں اس حوالے سے میں ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دے کر اختیار کر لیتا ہوں، اسی لیے میں نے اپنے آپ کو کہا تھا کہ میں نیم مقلد ہوں۔ ایک مقلد وہ ہیں جو امام ابو حنیفہ یا فقہ حنفی ہی کے صد فیصد ہر وقت ہر معاملے میں پابند رہیں گے، ایک وہ ہیں کہ جیسا

کہ میں نے عرض کیا ہے کہ نیم مقلد۔ چونکہ میں اجتہاد نہیں کر رہا، اجتہاد کی چھلنی سے تو گذر کر وہ فقہ حنفی آئی ہے، جب آپ بھی مانتے ہیں کہ فقہ حنفی بھی صحیح، فقہ شافعی بھی صحیح، فقہ حنبلی بھی صحیح تو ان معیارات کی چھلنیوں میں سے تو چھن کر آئی ہوئی ہے صرف یہ کہ چار آراء میں سے میں کسی کو CHOSE کر رہا ہوں۔ یہ ہے جو میں نے اپنے لیے آزادی رکھی ہے۔ مثلاً فاتحہ خلف امام کا معاملہ ہے میں اس مسلک کو جو کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کہ جو سری رکعت ہے اس میں میں فاتحہ پڑھتا ہوں جو جہری رکعت ہے اس میں نہیں پڑھتا۔ جبکہ حنفی مسلک ہے کہ کسی میں بھی نہ پڑھی جائے اور شافعی مسلک یہ ہے کہ ہر ایک میں پڑھی جائے چاہے جہری ہو چاہے سری ہو۔ میرا موقف جو میں مناسب ترین سمجھتا ہوں وہی میں نے اختیار کیا ہے۔ یہ مستطیل ہے جو میرے اس موقف کو واضح کرتی ہے کہ جن چیزوں پر ان چاروں کا اتفاق ہو جائے وہ چاروں ایک ہی ہیں اس کو میں نے اپنے لیے BINDING بنا لیا ہے اس سے میں تجاوز نہیں کرتا۔ البتہ جہاں ان کا اختلاف ہے وہاں میں PICK & CHOOSE کا اپنا اختیار استعمال کرتا ہوں۔

اس میں بھی ایک بات اور سمجھ لیجیے کہ اس میں بھی جو سب سے بڑی دلیل دی جاتی ہے کہ اس سے تو آدمی آسانی تلاش کرے گا۔ میں ڈٹ کر کہتا ہوں کہ یہی شریعت کا منشا ہے یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا آسانی کرو، شریعت کے دائرے کے اندر اندر جتنی آسانی مل سکتی ہو اسے ضرور WAIL کرو لیکن یہ کہ اس باہر نہیں، NOTHING DOING آگے نہیں جانا، یہی شریعت ہے۔ میں اس کو نہ صرف یہ ہے کہ کوئی خطرے والی بات نہیں سمجھتا، بلکہ ایک دفعہ تو اس پر بڑی بحث ہو گئی تھی جب ہمارا یہ 1956-57ء کا اختلافی دور چل رہا تھا۔ صادق آباد کا مجھے واقعہ یاد آ رہا ہے کہ مولانا عبدالغفار حسن صاحب تھے اور کچھ جماعت اسلامی کے چوٹی کے لوگ بیٹھے تھے گفتگو ہو رہی تھی۔ اس میں مولانا عبدالغفار حسن صاحب نے یہی بات پیش کی پھر کسی ایک فقہ کا پابند ہو جانا چاہیے۔ میں نے کہا کیوں؟ کہنے لگے کہ اس میں آدمی تو پھر آسانی تلاش کرے گا۔ میں نے کہا کہ آسانی دین کے اندر مقصود ہے۔ یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ۔ یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا۔ شریعت کے اندر اندر اگر آسانی ملتی ہو۔ تو مولانا صاحب کو خاموش ہونا پڑا تھا کوئی جواب ان کے پاس نہیں تھا۔ آپ حضرات اس میں اب ایک بہت بڑی دلیل دے سکتے ہیں

(چونکہ علماء سے اس مسئلے کے اندر الجھاؤ ہو ہی جاتا ہے) کہ یہ کام ایک مسئلے میں مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو کرنا پڑ گیا تھا۔ تلفیق جو ہے کہ مختلف فقہوں کو جمع کر لینا، اس کو یہ تقریباً کفر کے درجے میں سمجھتے تھے کہ حنفی نے اگر شافعی مسئلے پر عمل کر لیا اگر کوئی شافعی اپنے طور پر نماز پڑھے تو انہیں کوئی اعتراض نہیں لیکن اگر حنفی نے شافعی کے طور پر نماز پڑھی لی تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ یہ جو سختی تھی یہ اس درجے پر تھی کہ تلفیق کا لفظ وہ استعمال کرتے تھے شرعی گالی کے طور پر۔ یہ تلفیق کرتا ہے یعنی یہ مختلف فقہوں کو جوڑتا ہے۔ اس بارے میں مولانا احمد سعید اکبر آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ تلفیق کے بغیر تو آئندہ قانون چل ہی نہیں سکے گا، یہ تو لازم ہے، (بھائی جمیل صاحب بھی اُس محفل میں موجود تھے اسی لیے ذرا گردن کو جنبش دے رہے ہیں)......اور انھوں نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں کے جو عام TRADITIONAL علماء ہیں ان کی یہ بات نہیں ہے۔ لیکن ایک مسئلہ میں چونکہ تلفیق کر لی ہے لہٰذا پھر خاموش ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ کہیں گے کہ ٹھیک ہے مولانا تھانوی کو حق ہے تلفیق کا تمھیں حق نہیں ہے۔ اصولی طور پر ایک بات ٹھیک ہے تو اب اس کو تو ماننا پڑے گا۔ اور وہ معاملہ ہے ایک ایسی عورت کا جس کا شوہر مفقود الخبر ہو جائے، پتہ ہی نہیں۔ تو کتنے عرصے انتظار کرے وہ اسی کے نکاح میں رہے گی۔ طلاق اس نے نہیں دی، اس کے انتقال کی اطلاع نہیں آئی، تو وہ کس طریقے سے کوئی اور شادی کر سکتی ہے؟ تو فقہ حنفی میں نوے برس ہیں یا 60 ہیں؟ مجھے تو 90 یاد ہیں یعنی وہ عورت 90 برس تک انتظار کرے۔ یہاں آ کر انھوں نے فقہ مالکی سے 6 سال کی مدت لے لی ہے یعنی چھ سال تک اگر کسی عورت کے شوہر کی خبر نہ آئے مفقود الخبر رہے تو پھر گویا کہ اس کا نکاح ختم ہو گیا وہ کسی اور کے ساتھ نکاح کرنے کی مجاز ہے۔ ایک تو یہ میرا موقف سامنے آ گیا۔ اب میں جو بات بیان کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ میں جو کہتا رہا ہوں اور اب بھی اس پر قائم ہوں کہ موجودہ حالات میں اگر کوئی کہہ دے کہ اس ملک میں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے تو میں کہوں گا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں، فقہ حنفی کو میں اسلامی قانون سے خارج نہیں سمجھتا۔ اگر ALTERNATIVE یہ ہے یا سیکولر رہے گا یا فقہ حنفی آتی ہے تو میں فقہ حنفی کو پسند کروں گا۔ فقہ حنفی تو کیا، اگر فقہ مالکی آ جائے تو بھی میں حاضر ہوں، فقہ شافعی نافذ کر دے میں حاضر ہوں۔ یہ میں موجودہ حالات کی بات کر رہا ہوں......اس لیے کہ وہ اسلام سے باہر تو نہیں ہے۔

……یہی میں کہہ رہا ہوں اہل تشیع سے کہ وہ میری بات ابھی تک مان نہیں رہے چپ ہو جاتے ہیں کوئی جواب ان کے پاس نہیں ہے لیکن مانیں تو ظاہر بات ہے کہ پیچھے جوان کے پیروں کار ہیں وہ تالی پیٹ دیں گے ان کی قیادت ختم ہو جائے گی۔ میں نے کہا تھا کہ آپ مان لیں کہ جو کچھ ایران میں کیا گیا ہے وہی آپ یہاں پر قبول کرنے کو تیار ہیں کہ PUBLIC LAW وہی ہو گا جو اکثریت کی فقہ ہے یا اکثریت کا نقطہ نظر ہے۔ اب میں نے یہ دو الفاظ علیحدہ استعمال کیے ہیں اکثریت کی فقہ یا اکثریت کا نقطہ نظر۔ بہر حال اکثریت کی جو چیز ہے فقہ یا نقطۂ نظر اس کو تسلیم کیجیے PUBLIC LAW میں، اور اپنے لیے آپ PERSONAL LAW میں پوری آزادی لیجیے، بلکہ سب کو آزادی ہونی چاہیے۔ حنفی کو، مالکی کو، شافعی کو، سب کو PERSONAL LAW کے اندر کھلی آزادی ہے۔ اگر شادی ہو رہی ہو دو فقہوں سے تعلق رکھنے والوں کی، فرض کریں مرد شیعہ ہے لڑکی سنی ہے۔ یا لڑکی شیعہ ہے اور لڑکا سنی ہے، تو اب کیا کریں گے؟ اب اس کا فارم کے اندر طے کر دینا چاہیے کہ کس نکاح کو کونسی فقہ GOVERN کرے گی۔ کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے رضاعت کا مسئلہ ہے طلاق کا مسئلہ ہے جو بھی کچھ ہو بے شمار مسائل ہوتے ہیں۔ عائلی قوانین میں وہ عائلہ یا خاندان جو اس نکاح سے وجود میں آ رہا ہے اس کے مسائل فلاں فقہ سے طے ہوں گے یا فقہ جعفریہ لکھ دیجیے یا سنی کو قربانی دینی پڑے گی اگر وہیں پر شادی کرنا چاہتا ہے یا چاہتی ہے، یا فقہ حنفی لکھ دیجیۓ اگر اس کو زیادہ چاہت ہے جو فقہ جعفری والا ہے یا والی ہے۔ بہر حال قربانی دینے پڑے گی۔

یہ میرا موقف اب بھی ہے اور میں اس پر جازم ہوں کہ یہ موقف اگر ہم اختیار نہیں کریں گے تو حالاتِ موجودہ میں جو بات کہنے کی ہے لوگوں تک پہنچانے کی ہے ہمارے پاس اس کا ذریعہ نہیں رہے گا اور فی الواقع بھی مالکی ہو، حنفی ہو، شافعی ہو، کوئی سی فقہ ہو وہ دائرۂ اسلام سے خارج نہیں، وہ دائرہ اسلام کے اندر ہے۔

البتہ یہ ہے آخری بات جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں مستقبل کی اسلامی ریاست میں قانون سازی کے لیے مستقل حد بندی۔ اصل میں اس کو سمجھ لیجیے کہ آئندہ جب اسلامی ریاست حقیقی اسلامی انقلاب کے بعد بنے گی اُس وقت سارا معاملہ ازسرنو LEGISLATION (قانون سازی) کا ہو گا۔ ہم ہمیشہ اس کو کہتے رہے ہیں کہ دستور میں یہ طے ہو کہ

NO LEGISLATION CAN BE DONE REPUGNANT TO THE QURAN AND THE SUNNAH

وہاں حد بندی صرف دو چیزوں کی ہوگی: قرآن کے خلاف کوئی قانون نہیں بن سکتا اور سنت رسول ﷺ کے خلاف کوئی قانون نہیں بن سکتا۔ باقی اس کے بعد کی ہر شے نظائر کے درجے میں ہوگی، PRECEDENCE ہے۔ یہ معاملہ خلافت راشد میں ہوا تو یوں ہوگیا تھا یہ ہمارے نزدیک ظاہر بات ہے کہ وہ WEIGHTAGE والی بات آجائے گی۔ اگر اس کے اندر آپ کی RANGE ہے ایک سے سو تک، تو ہم خلافت راشدہ والی نظائر کو 75% نمبر دیں گے، اس سے کم تر نمبر دیں بعد میں ہمارے جو مجتہدین مطلق تھے، اس کے بعد نمبر 2 کے مجتہدین آئے، ان کی رائے کیا تھی۔ لیکن یہ سارا کا سارا معاملہ بشمول خلافت راشدہ یہ PRECEDENCE کے دائرے میں آئے گا کہ یہ نظائر ہیں جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ عدالتوں میں مقدمات میں نظائر کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، HIGHER JUDICIARY میں جا کر بہت چھوٹے چھوٹے نقطوں کے اوپر مقدمات کا فیصلہ ہوجا تا ہے۔ فلاں ہائی کورٹ نے اس مسئلے کے اندر یہ رائے دی تھی اور فلاں سپریم کورٹ آف انڈیا کے سامنے یہ مقدمہ آیا تھا اس نے یہ رائے دی تھی اور جو برطانیہ کی پریوی کونسل تھی اُس نے یہ رائے دی تھی۔ تو PRECEDENCE کی تو دنیا کے اندر ہمیشہ ایک حیثیت ہوتی ہے۔ تو ہمارے لیے یہ سارے PRECEDENCE ہیں۔ امام ابوحنیفہ نے یہ سمجھا تھا، امام مالک نے یہ سمجھا تھا، امام شافعی نے یہ سمجھا تھا، امام احمد بن حنبل نے یہ سمجھا تھا، قاضی ابویوسف نے یہ سمجھا تھا امام محمد نے یہ سمجھا تھا اور بھی ان کے بعد کے فقہاء جو بھی ہوں گے۔ لیکن یہ کہ ان PRECEDENCE میں WEIGHTAGE کے اعتبار سے MAXIMUM WEIGHTAGE ہوگا خلافت راشدہ کے PRECEDENCE کو۔ لیکن حد بندی درحقیقت صرف دو چیزوں سے ہوگی: کتاب اللہ و سنت رسولہ ﷺ۔ کہ کوئی شے جس کو ہم دستور میں کہیں گے وہ یہی ہوگی۔ کہتا تو میں یہ رہا ہوں ہمیشہ POSITIVE انداز میں میں نے یہ بات کہی کہ جس جمہوری ملک کے اندر تین چیزیں طے کر دی گئیں وہ اسلامی ریاست اور خلافت بن گئی۔ نمبر 1 حاکمیت اللہ کی ہے۔ نمبر 2 LEGISLATIVE AUTHORITY OF THE LEGISLATIVE BODIES چاہے اُسے آپ اسے پارلیمنٹ

کہیں، مجلس شوریٰ کہیں، سینٹ کہیں یا جو چاہیں کہیں اور AT EVERY LEVEL اگر COUNTY LEVEL پر ہو رہا ہے تب بھی اور اگر STATE LEVEL پر ہو رہا ہے تب بھی اور اگر FEDERAL LEVEL پر ہو رہا ہے ہر لیول پر LIMITIATIONS ہوں گی

NO LEGISLATION CAN BE DONE REPUGNANT TO THE QURAN AND THE SUNNAH

اس میں کسی اور شے کی اس دستوری سطح پر صراحت نہیں ہوگی۔ البتہ یہ ہے کہ اس کے نظائر کی حیثیت سے خلافت راشدہ کے نظائر نمبر 1 پر آئیں گے، مجتہدین مطلق کی آراء نمبر دو پر آئیں گی اور بعد کے مجتہدین کو ہم اپنے اپنے درجہ کے مطابق ہم آراء دیں گے۔ لیکن اس میں یہ ہے کہ اجتہادِ مطلق بھی ہو سکے گا۔ کیوں؟ اس لیے ہو سکے گا کہ قانون یہ نہیں ہے کہ جب تک آپ کسی چیز کے لیے قرآن وسنت میں بنیاد نہ بتائیں قانون نہیں بنا سکتے۔ اگر یہ ہوتا تو LEGISLATION کا دائرہ بہت محدود ہو جاتا۔ اصل شکل کیا ہے کہ کوئی قانون نہیں بنایا جا سکے گا جو قرآن وسنت کے منافی ہو، اب دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اس کو میں ایک مثال سے بیان کرتا ہوں کہ ایک دائرہ ہے اس کے درمیان میں ایک نقطہ ہے مثلاً آپ نے ایک گھوڑا 100 گز کی رسی سے باندھ دیا ہے سو گز نصف قطر کا ایک دائرہ وجود میں آ گیا ہے اس میں گھوڑا آزاد ہے۔ اس میں آپ اکثریت سے فیصلہ کر لیجیے۔ کتاب وسنت کی حدود امر اللہ ہے، یہ امر اللہ وہ دائرہ ہے آپ اس کے اندر آزاد ہیں آپ اکثریت سے معاملہ طے کر لیجیے اکثریت میں ہو سکتا ہے کہ کوئی اجتہادِ مطلق کی شکل بن جائے۔ اگر یہ ثابت نہ کیا جا سکا کہ یہ اجتہاد CONTROVERSIAL ہے کسی قرآن مجید کے حکم کو یا محمد رسول اللہ ﷺ کے فرمان کو تو وہ بھی قانون کا درجہ حاصل کر لے گا۔

یہ میرا موقف ہے اس وقت مستقبل کی ریاست کے لیے۔ کہ ہماری اہل سنت کی جو چار فقہ ہیں جہاں پر ان چاروں کا اتفاق ہو وہاں تو سرِ تسلیم خم، آگے نکلنا میں اپنے لیے خطرناک بات سمجھتا ہوں لیکن جہاں کہیں اختلاف ہے اس کے اندر PICK & CHOOSE کرنا یہ میں اپنا حق سمجھتا ہوں اور یہ مدلل حق ہے جب کہ لوگ ان چاروں کو برحق مانتے ہیں۔

5 امالی غلام محمد اور تصورِ اقبال کا تقابلی مطالعہ

پروفیسر ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان
کی کتاب ''اجتماعی اجتہاد: تصورِ اقبال اور امالی غلام محمدؒ''
(مطبوعہ 2020ء) کا ایک باب

علامہ اقبال کے خطبات بالعموم اور اجتہاد سے متعلق اُن کی آراء پر مشتمل چھٹا خطبہ بالخصوص کوئی حرفِ آخر نہیں تھا، پھر اہل علم میں علمی معاملات پر اختلاف رائے معمول کی بات ہے تاکہ باہمی محاورہ اور ردّ و کدح سے مقصود نکھر کر سامنے آجائے اور اس مقصود کے سارے علمی وعملی پہلو عوام کے سامنے آجائیں اور آخر میں 'خُذْ مَا صَفَا وَ دَعْ مَا كَدَر' میں آسانی ہوجائے۔ علامہ اقبال کے اجتہاد سے متعلق خطبے پر 'امالی غلام محمدؒ' کے نام سے کسی تحریر (جو ہماری نظر سے پہلے نہیں گزری) پر پروفیسر محمد شاکر اعوان صاحب نے اپنی تازہ کتاب میں گفتگو فرمائی ہے۔ انداز کو نظر انداز فرما کر نفس مضمون پر غور فرمائیں۔ (ادارہ)

خطباتِ اقبال کے یہ وہ اندراجات ہیں جو امالی غلام محمد کی تنقید کا نشانہ بنے یعنی انسانی برابری، جمہوریت، اور قانون سازی [اجتہاد] بذریعہ پارلیمنٹ۔

ملاحظہ ہوں امالی غلام محمد کے کچھ اقتباسات:

اسمبلیاں کیسے اجتہاد کرسکتی ہیں۔ اسمبلی کے انتخابات کی بنیاد مساوات کے نظریے پر ہے۔ تمام انسان برابر ہیں ... اب علامہ اقبال مرحوم اور ایک بقال کا ووٹ برابر ہے اور دونوں یکساں طور پر جمہوری عمل کے ذریعے اسمبلی کے ممبر بن

سکتے ہیں۔اب بقال، حمال، حجام اور موچی اجتہاد کریں گے۔[سہ ماہی اجتہاد، ص ۵۵، جون ۲۰۰۷، اسلام آباد]

ہمیں تو اسلام میں کہیں مغربی جمہوریت نہیں نظر آئی اور اسلامی جمہوریت تو کوئی چیز نہیں ہے۔ معلوم نہیں اقبال مرحوم کو اسلام کی روح میں جمہوریت کہاں نظر آئی۔[اجتہاد، ایضاً، ص ۶۰]

اقبال مرحوم کی شاعری اور نثر میں بڑا فرق ہے، ایک دل کا معاملہ اور دوسرا عقل کا... جب وہ دل کے مقام سے خطاب کرتے ہیں تو ان کے دل سے نکلی ہوئی آواز (شاعری) تو ملتِ اسلامیہ کے دل کی آواز بن جاتی ہے لیکن یہی آواز جب مغرب سے متاثر ہوکر عقل کے ذریعے نثر میں آتی ہے تو ملت اُسے مسترد کر دیتی ہے۔[اجتہاد، ایضاً، ص ۵۴۔۵۳]

ہم پہلے اس آخری بات سے بحث کا آغاز کرتے ہیں جس کے حوالے سے امالی کے مرتب نے لکھا ہے:

علماء نے خطباتِ اقبال مرحوم کی شدید مخالفت کی، کفر کے فتوے بھی دیے گئے، لیکن ہم اقبال مرحوم کی اہمیت وافادیت سے واقف تھے۔ علماء نے کہا کہ خطبات پر نقد معارف میں آنا چاہیے۔ اس ہیچ مدان نے صرف اتنا زبانی کہا کہ یہ لیکچر شائع نہ ہوتے تو اچھا ہوتا اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔[اجتہاد، ایضاً، ص ۵۳]

ذرا ملاحظہ ہو اسلامی تفکر کا عمق، اقبال مرحوم کی شاعری ملت کے دل کی آواز تھی، اُسی کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر خطبات پر علماء کے اصرار کے باوجود نقد و جرح نہ کی۔ یعنی وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ (۲۶:۲۲۴) فرمانِ الٰہی کو پس پشت ڈالنے میں 'باک' محسوس نہ فرمائی اور ہیچ مدان صرف یہ کہہ کر چپ ہو رہا ''یہ لیکچر شائع نہ ہوتے تو اچھا تھا''۔ شعر اقبال قوم کے دلوں کی آواز بنا، یا نہیں، آپ کے لیے مرغوبِ جاں رہا، کیونکہ تاویلات سے اسے بھی قرآن کی طرح پاژند بنا سکتے ہیں لیکن یہ بات کسی طرح درست نہیں کہ ''نثر اقبال کو ملت نے مغرب سے متاثر عقل کی ترجمان ہونے کے سبب مسترد کر دیا''۔

کیا ایک الگ آزاد اسلامی ریاست کے تصور کا حامل خطبہ الٰہ آباد (۱۹۳۰ء) نظم میں تھا؟ کیا حسین احمد مدنی دیوبند کے شیخ العرب والعجم کے بیان ''قومیں اوطان سے بنتی ہیں'' کے ردّ میں طویل مضمون، نظم میں تھا؟ کیا عقیدہ ختم نبوت کی ثقافتی اہمیت کے دفاع میں قادیانیوں کا تعاقب نظم میں تھا؟ تحریک پاکستان کی تو یہی تین بنیادیں ہیں، جنھیں ملت اسلامیۂ ہند نے بہ دل وجان تسلیم کیا اور مسلم لیگ کی وہ قرارداد لاہور بھی جسے دیکھ کر بعض کی روح بے اختیار ماتم کرنے لگتی تھی، نثر ہی میں تھی، جس کے حق میں مسلمانانِ ہند نے ووٹ دے کر ہندو، انگریز اور ان کے مرغانِ دست آموز کو شکست فاش دی۔ شاید اسی لیے مسلمانانِ پاکستان کے ووٹ کا یہ جمہوری حق اسلام میں کہیں نظر نہیں آ رہا؟

اَلسُّلْطَانُ ظِلُّ اللّٰہِ کے خطبہ خوانوں کو اسلام کی روح میں جمہوریت (مساواتِ بشریت) نظر آنی بھی نہ چاہیے؛ کیونکہ ان کے عقلِ اوّل افلاطون نے اشرافی کمیونزم کے اصول، برادری میں برابری کی سفارش کی تھی۔ مگر اقبال مرحوم تو اس اسوۂ حسنہ کا سچا پیروکار تھا، جس نے اخوت (برادری اور برابری) کی تعلیم دیتے ہوئے اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ (۱۸:۱۱۰) (میں تم جیسا بشر ہوں) کے الٰہی فرمان کی اطاعت میں کھلے دل سے اعلان کیا اور عملاً کر کے دکھایا۔ وَاِذَا أَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ مِنْ رَأْیِی، فَاِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ (صحیح مسلم)۔ آیئے ہم ذیل کے زیر بحث موضوعات اللہ اور الرسول کے اسی فرمان اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ سے شروع کریں۔ جمہوریت بحیثیت نظامِ اجتماعی تین اصولوں پر قائم ہے (۱) مساواتِ بشریت، (۲) تمام اہل وطن کا استحقاقِ امامت، (۳) قانون سازی بذریعہ پارلیمنٹ۔

6 اقبال کا خطبہ ''الاجتہاد فی الاسلام'' ـــــ ایک مطالعہ

امتیاز حسین

(سہ ماہی علمی و تحقیقی مجلّہ اقبال، جنوری تا دسمبر 2009ء)

اسلامی قانون سازی میں اجتہاد کی اہمیت کو کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اجتہاد کے بغیر دورِ جدید کے تقاضوں کو پورا کرنا ناممکن ہے۔ مسلم معاشرے میں اجتہاد کا کردار بڑا جاندار رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال نے اجتہاد کے موضوع کو نظر انداز کرنا گوارا نہ کیا۔ انھوں نے اجتہاد کے موضوع پر جس خطبے میں بحث کی اس کا عنوان حسب ذیل ہے:

"THE PRINCIPLE OF MOVEMENT IN THE STRUCTURE OF ISLAM"

اقبال نے یہ گراں قدر خطبہ پہلی مرتبہ 1924ء میں لاہور میں اور دوسری بار جنوبی ہندوستان میں 1930ء میں دیا تھا۔ یہ خطبہ ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے چھٹے باب کے طور پر شائع ہوا تھا۔

اقبال کی اجتہاد کے موضوع پر بحث کرنے کی اس کوشش کو تحسین کی نگاہوں سے نہ دیکھنا ناانصافی اور زیادتی کے مترادف ہے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

''اس کی داد دینی چاہیے کہ ایک ایسے دورِ جمود و تعطل ذہنی میں جبکہ لوگ اجتہاد کا لفظ زبان سے نکالتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں ان پر آزاد خیالی کا لیبل نہ لگ جائے علامہ نے اپنی چشم بصیرت سے آنے والے زمانے کو دیکھ لیا....''

اقبال کے اس خطبے کا مرکزی خیال اجتہاد کی ضرورت ہے۔ سید نذیر نیازی نے اقبال کے اس خطبے کا عنوان ''الاجتہاد فی الاسلام'' قرار دیا ہے۔

لفظ ''اجتہاد'' جہد سے اخذ کیا گیا ہے جس کے معنی کاوش اور مشقت کے ہیں۔ لغوی اعتبار سے اجتہاد کے معنی کسی ایسے کام کی تحقیق اور جستجو کرنا ہیں جو محنت اور مشقت کا متقاضی ہو۔ جہد سے دو لفظ ماخوذ ہیں یعنی 'اجتہاد' اور 'جہاد'۔ دین اسلام کے داخلی نظام کو اس کی اصلی صورت میں قائم رکھنے کے لیے کی گئی جد و جہد کو اجتہاد کہتے ہیں جبکہ اسلام کے خارجی نظام یعنی اسلامی نظام کو بیرونی حملوں سے بچانے کی تگ ودَو کو جہاد کا نام دیا جاتا ہے۔

فقہ کے باب میں جلوہ گر ہونے والے عملی ارتقا کو اجتہاد کہتے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری اجتہاد کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> ''قرآن وسنت اور اجماع کی روشنی میں مقررہ شرائط کے مطابق استنباط واستخراج کے طریقے پر شرعی احکام اور قوانین کی تشکیل، تجدید، تفصیل، توسیع اور تنقید کے لیے ماہرانہ علمی کاوش کو اجتہاد کہتے ہیں۔''

پروفیسر محمد منور مرزا رقم طراز ہیں:

> ''فقہ کو معاصر احوال پر منطبق ہونے کے لائق بنانا اجتہاد ہے۔''

مولانا مناظر احسن گیلانی اپنی کتاب 'تدوین فقہ' میں فقہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''فقہ کے یہ معنی نہیں کہ شریعت میں اپنی طرف سے کسی چیز کا اضافہ عقل کرتی ہے بلکہ وہی بات یعنی نتائج، احکام کا جو روغن وحی ونبوت کے ان معلومات میں چھپا ہوا تھا، عقل کی مشین ان ہی کو اپنی طاقت کی حد تک ان سے نچوڑنے کی کوشش کرتی ہے۔''

بس کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی زبان مقدس سے جس قانون کی آگاہی دی اُسے اہل اصول فقہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور پس قانون کا عملی نفاذ و اظہار شریعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی پاکیزگی فقہ اور شریعت کی جان ہے۔

چونکہ اقبال کے تصورِ اجتہاد پر بات کرنا مقصود ہے اس لیے اقبال نے اجتہاد کی خود جو تعریف کی ہے اس کو دیکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اقبال لکھتے ہیں:

''لغوی اعتبار سے تو اجتہاد کے معنی کوشش کرنا لیکن فقہ اسلامی کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے وہ کوشش جو کسی قانونی مسئلے میں آزادانہ رائے قائم کرنے کے لیے کی جائے اور جس کی جیسا کہ میں سمجھتا ہوں شاید قرآن مجید کی اسی آیت: ''اور وہ جو کوشش کرتے ہیں ہم انہیں اپنا راستہ دکھا دیتے ہیں'' پر ہے پھر حضور رسالت مآب ﷺ کی ایک حدیث سے اس کا مطلب اور زیادہ وضاحت کے ساتھ متعین ہو جاتا ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا عامل مقرر کیا تو فرمایا: ''معاملات کا فیصلہ کیسے کرو گے؟'' انھوں نے کہا: ''کتاب اللہ کے مطابق۔'' لیکن اگر کتابُ اللہ نے ان میں تمھاری رہنمائی نہیں کی تو پھر؟ ''اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کے مطابق۔'' لیکن اگر سنت بھی ناکافی ٹھہری تو؟ اس پر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تو پھر خود کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔''

اقبال کے اجتہاد کے بارے میں خیالات کا جائزہ لینے کے بعد نتیجتاً یہ کہا سکتا ہے کہ وہ اجتہاد کی روایتی تعریف کو مکمل طور پر تسلیم نہیں کرتے بلکہ وہ اجتہاد کی تعریف اسلام میں حرکت کے اصول کے طور پر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد خالد مسعود اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

"Iqbal does not completely accept the conventional definition of Ijtihad in his lecture. He rather defines Ijtihad as a principle of movement in Islam."

اقبال کے نزدیک مجتہد کی تین اَقسام ہیں: اوّلاً مجتہد مطلق۔ ایسا مجتہد جو کسی مکتب فقہ کے دائرے میں قید رہ کر اجتہاد کرنا بالکل پسند نہیں کرتا۔ وہ اجتہاد کرتے ہوئے ہر قسم کی فقہی حد بندیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے یعنی امام ابو حنیفہ اور دوسرے فقہا کی طرح اجتہاد کرتا ہے۔ ثانیاً مجتہد منتسب۔ ایسا مجتہد کسی خاص مکتب فقہ کے دائرے میں رہ کر اجتہاد کرتا ہے۔ ثالثاً ایسا مجتہد ہوتا ہے جو مقلد بھی ہوتا ہے اور نہیں بھی، یعنی وہ ائمہ مذہب کے فیصلے کا پابند ہوتا ہے لیکن جس مسئلے کے متعلق ائمہ مذہب خاموش ہیں وہ صرف ان کے بارے میں اجتہاد کے ذریعے کوئی فیصلہ کرتا ہے۔

اقبال کے اس خطبے یعنی ''الاجتہاد فی الاسلام'' میں موضوعِ گفتگو اجتہاد مطلق ہے۔

ڈاکٹر یوسف گورایہ اپنی کتاب ''اقبال اور اجتہاد'' میں تحریر کرتے ہیں:

''علامہ اقبال اجتہاد کے درجہ اوّل "FIRST DEGREE OF IJTIHAD" اجتہادِ مطلق "COMPLETE AUTHORITY IN LEGISLATION" کے داعی ہیں۔ وہ خود مجتہد مطلق ہیں۔ ان دونوں اصطلاحوں کا استعمال وہ اپنے قلم سے خود کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے اجتہاد کے اصول خود وضع کیے ہیں اور بڑی تفصیل سے انھوں نے مآخذ شریعت: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس، سے جو بحث کی ہے وہ نہایت بصیرت افروز ہے جس سے ان کے اجتہاد کے وضع کردہ قواعد وضوبط واضح ہوتے ہیں۔ وہ انفرادی اجتہاد کے بھی قائل ہیں...... ان کے نزدیک عہد حاضر میں ملکی قوانین کی تقنین اور تشکیل کے لیے اجتماعی اجتہاد و تعبیر تو قانون ساز اسمبلی کا اختیار ہے، لہٰذا ان کے رہنما اُصولوں اور قواعد وضوابط کے مطابق معرض وجود میں آنے والا قانون ساز ادارہ اجتہادِ مطلق کا اختیار رکھتا ہے۔''

اقبال کے خیال میں جوں جوں اسلامی سلطنت کی حدود میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو اس کے ساتھ ساتھ نئے نئے مسائل بھی پیدا ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ متعدد فقہا نے اس طرف توجہ دی اور سخت محنت اور عرق ریزی کے نتیجے میں ضابطے اور قاعدے مرتب کیے۔ انھوں نے متعدد مسائل کا حل تجویز کیا جس کے نتیجے میں آہستہ آہستہ چند فقہی مکاتب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سامنے آ گئے۔

اقبال کے نزدیک فقہی مکاتب کے افکار کافی اور متحرک نہیں ہیں، اس لیے ان کی بغیر سوچے سمجھے پیروی قطعاً مناسب نہیں ہے۔ وہ کتاب مقدس قرآن مجید اور حدیث مبارکہ پر بلا واسطہ غور وخوض کی تلقین وتاکید کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تصنیفات میں جہاں اجماع وقیاس کی حدود متعین کرنے کی بے نظیر کوشش کی ہے وہاں فقہ جدید کی تدوین میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اقبال کی یہ خدمات یقینی طور پر قابل داد ہیں۔

اقبال کا یہ عقیدہ ہے کہ فقہ جدید کی تدوین میں پرانے زمانے کے تمام اختلافات کو پس پشت ڈال کر دورِ جدید کے حالات کی روشنی میں مسئلوں کا جو بھی حل نکالا جائے گا وہ ملت اسلامیہ کی وحدت کا موجب بنے گا۔ ڈاکٹر وحید قریشی اپنے تحقیقی مقالے ''مسندِ خلافت یا مجلس قانون ساز

__ فکرِ اقبال کی روشنی میں‘‘ میں اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

’’اسلام کا دعویٰ تو یہ ہے کہ ہر زمانے اور ہر دور کے مسائل کا حل مسلمانوں کے ہاں موجود ہے۔ حل مشکلات کی تدبیر کو تعبیر وتشریح کے عمل میں جاری وساری نہ رکھا گیا اور مقلدین نے حالات وواقعات کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ اصولوں کے میکانکی انطباق پر نظر رکھی گئی اور تعبیر کے عمل کو سست بلکہ بعض حالتوں میں منقطع کر کے رکھ دیا گیا۔ مختلف مذاہب فقہ میں سختی اور قطعیت آ گئی۔ حقائق کی نئی تعبیر کے راستے مسدود ہوئے۔ فقہی فرقے پیدا ہو گئے۔ یہ صورت اسلام کے ملت واحد بن جانے میں خارج ہوئی۔ شیعہ فقہ، سنی فقہ اور پھر ان میں بھی گونا گوں مذاہب فقہ: حنفی، مالکی، شافعی یہ سب اگرچہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں آزادیٔ رائے کی اہمیت بحال ہے لیکن اس کا ایک برا اثر یہ بھی ہوا کہ نسلی امتیازات کی طرح ان اختلافات نے بھی مسلمانوں کی تنظیمی حیثیت کو بری طرح مجروح کیا۔ ان کے خیال میں فقہ جدید کی تدوین کے لیے ماضی کے اختلاف سے صرف نظر کر کے موجودہ حالات کی روشنی میں مسائل کا جو بھی حل تلاش کیا جائے گا وہ فرقہ بندیوں سے آزاد اور وحدت کی طرف لے جانے والا ہوگا۔‘‘

اقبال اپنے خطبے ’’الاجتہاد فی الاسلام‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ اس وقت دُنیا میں جو نئی قوتیں اُبھر رہی ہیں کچھ ان کے اور کچھ مغربی اقوام کے سیاسی تجربات کے پیشِ نظر مسلمانوں کے ذہن میں بھی اجماع کی قدر و قیمت اور اس کے قطعی امکانات کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔ بلادِ اسلامیہ میں جمہوری روح کا نشوونما اور قانون ساز مجالس کا بتدریج قیام ایک بڑا ترقی افزا قدم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مذہب اربعہ کے نمائندے جو سر دست فرداً فرداً اجتہاد کا حق رکھتے ہیں۔ اپنا یہ حق مجالس تشریعی (LEGISLATIVE ASSEMBLY) کو منتقل کر دیں گے۔ یوں بھی مسلمان چونکہ متعدد فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اس لیے ممکن بھی ہے تو اس وقت اجماع کی یہی شکل۔ مزید برآں

غیر علماء بھی جو اِن امور میں بڑی گہری نظر رکھتے ہیں، اس میں حصہ لے سکیں گے۔
میرے نزدیک یہی ایک طریقہ ہے جس سے کام لے کر ہم زندگی کی اس روح کو جو
ہمارے نظاماتِ فقہ میں خوابیدہ ہے از سرِ نو بیدار کر سکتے ہیں۔ یوں ہی اس کے اندر
ایک ارتقائی مطمحِ نظر پیدا ہو گا''۔

اقبال نے اپنے خطبے ''الاجتہاد فی الاسلام'' میں قانون سازی کے مکمل اختیار کو اپنی بحث کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے اجتہاد کے فقدان کی وجوہات بھی بیان کی ہیں۔ یورپ کے بعض محققین نے اسلامی قانون کے جمود کی سب سے بڑی وجہ ترکوں کے اثر کو قرار دیا ہے۔ اقبال یورپی محققین کے ساتھ اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں اسلامی قانون کے جمود کی وجوہات درج ذیل ہیں:

(ا) بنو عباس کے ابتدائی دور میں عقلیت پرستی کا رُجحان عروج پر تھا۔ اس سے ایسے مسائل پیدا ہو گئے جن کے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھمبیر ہو جانے کا بہت اندیشہ تھا جیسے خلقِ قرآن کا مسئلہ۔ اس بات سے ڈرتے ہوئے کہ کہیں یہ متکلمین کی طویل بحثیں امت کے فکری انتشار کو جنم دینے کا باعث نہ بن جائیں۔ انھوں نے فقہ و اصول میں اور بھی زیادہ تشدد پیدا کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے اسلامی معاشرے کا ڈھانچہ (STRUCTURE) ویسے کا ویسے رہے گا۔

(ب) فقہا اور متکلمین کی عقلی اور فقہی بحثوں سے کچھ لوگ بیزار ہو کر الگ ہو گئے۔ وہ گروہ غیر اسلامی موثرات سے متاثر تھا۔ یہ صوفیا کا گروہ تھا۔ صوفیا کے اس گروہ نے ایک نئی راہ اختیار کی۔ اس لیے فقہ و اصول کا ڈیپارٹمنٹ درمیانے درجے کے عقل مند لوگوں کے قبضے میں چلا گیا۔

(ج) اجتہاد کی کمی کی تیسری وجہ بغداد کا تباہ و برباد ہو جانا تھا۔ تیرھویں صدی کے وسط میں بغداد کی تباہی و بربادی کے دور نے انتشار کو پیدا کیا۔ قدامت پسند فقہائے ملت اسلامیہ کو مزید ذہنی و فکری انتشار سے محفوظ رکھنے کی نیت سے معاشرتی زندگی کی یکسانیت کو برقرار رکھنے کی غرض سے تقلید کا مشورہ دیا۔ قدامت پسند فقہا کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے معاشرتی نظام تباہ و برباد ہونے سے بچ جائے گا۔

اسلامی قانون کے جمود کے خلاف ابن تیمیہؒ اور امام السیوطیؒ نے آواز بلند کی۔ اقبال اسی لیے ان آئمہ حضرات کو بڑی عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ علامہ موصوف نے اپنے اس خطبے میں ابن تیمیہ کو ان کے جوش وولولے کی داد دیتے ہیں۔ وہابی تحریک درحقیقت امام تیمیہ کی تحریک کا نتیجہ تھی۔ اقبال وہابی تحریک کی بھی اس ضمن میں کہ اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے، حمایت وتائید کرتے ہیں۔

اقبال کے خیال میں احیا کا مطلب جمود اور فرسودگی کا احیا ہرگز نہیں ہے۔ وہ ترکوں کے اجتہاد پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''پھر اگر اسلام کی نشاۃ ثانیہ ناگزیر ہے جیسا کہ میرے نزدیک قطعی ہے تو پھر ہمیں بھی ترکوں کی طرح ایک نہ ایک دن اپنے عقلی اور ذہنی ورثے کی قدر و قیمت کا از سر نو جائزہ لینا ہوگا۔''

اقبال کے عہد میں ''حزبِ قومی'' اور ''حزبِ اصلاحِ مذہب'' دو بڑی ترک سیاسی پارٹیاں تھیں۔ ''حزبِ قومی'' مذہب اور سیاست میں دوئی کی علمبردار تھی۔ چونکہ اسلام میں مذہب اور سیاست میں کوئی تفریق نہیں پائی جاتی بلکہ مذہب اور سیاست دونوں کا اکٹھا رکھنا نہایت ضروری ہے اور ''حزبِ قومی'' خالصتاً مغربی تصورِ قومیت کی قائل تھی لہٰذا اقبال اس سیاسی پارٹی سے ہمیشہ نالاں رہے۔

''حزبِ اصلاحِ مذہب'' اسلامی نظریۂ قومیت کی قائل تھی یعنی وہ مذہب اور سیاست میں جدائی کو روح و بدن میں جدائی کے مترادف تصور کرتی تھی اس لیے اقبال اس سیاسی پارٹی کو بہت پسند کرتے تھے۔

سعید حلیم پاشا کا تعلق حزبِ اصلاحِ مذہب سے تھا۔ وہ نہایت زیرک انسان ہونے کے ساتھ ساتھ مقبول ترک سیاست دان تھے۔ انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ترک شہنشاہی کا احیا شریعت کی بحالی اور اجتہاد کے بغیر ناممکن ہے۔

اقبال، سعید حلیم پاشا کے ملّی افکار کو تحسین کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے ''جاوید نامہ'' میں ''زیارت ارواح جمال الدین افغانی وسعید حلیم پاشا'' کے عنوان کے تحت

تینتیس اشعار تحریر کر کے جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اقبال اپنے خطبے ''الاجتہاد فی الاسلام'' میں اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ سعید حلیم پاشا نے اس اساسی حقیقت کو عیاں کیا ہے کہ اسلام عینیت اور اثباتیت کے حسین امتزاج کا حامل ہے۔ اقبال کے بقول سعید حلیم پاشا نے اسلامی تصور قومیت کا پرچار کیا ہے۔

اقبال نے خطبہ ''الاجتہاد فی الاسلام'' میں مسئلہ خلافت پر بھی بحث کی ہے۔ سنی فقہ کے مطابق مسند خلافت پر زیادہ افراد نہیں بیٹھ سکتے بلکہ یہ صرف فرد واحد کا حق ہے۔ سنی فقہ کے بالکل برعکس ترکوں کا یہ موقف ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روح کے مطابق خلافت منتخب اسمبلی یا بہت سے افراد کو منتقل کر دینی چاہیے۔ اقبال ترکوں کے اس موقف کی تائید کرتے ہیں وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''جہاں تک مسئلہ خلافت کا تعلق ہے مجلس ملیہ (ترکی) نے اپنا حق اجتہاد کس طرح استعمال کیا۔ سنی نقطۂ نظر سے خلیفہ یا امام کا منصب چونکہ ایک امر واجب ہے لہٰذا اس سلسلے میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ منصب خلافت کیا کسی فردِ واحد کا حق ہے؟ ترکوں کا اجتہاد یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے تو اس منصب کو افراد کی ایک جماعت بلکہ منتخب شدہ جماعت کے ذمے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اب جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ہندوستان اور مصر کے علما نے اس سلسلے میں ابھی تک کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ اپنی ذاتی حیثیت سے البتہ میرا خیال ہے کہ ترکوں کا یہ نقطۂ نظر سراسر درست ہے۔ اتنا درست کہ اس کی تائید میں کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہی اس لیے کہ ایک تو جمہوری طرز حکومت اسلام کی روح کے عین مطابق ہے ثانیاً اگر ان قوتوں کا بھی لحاظ رکھا جائے جو اس وقت عالم اسلام میں کام کر رہی ہیں تو یہ طرزِ حکومت اور بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔''

ڈاکٹر وحید قریشی اپنی کتاب ''اقبال اور پاکستانی قومیت'' میں اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''اقبال نے خلافت کے مسئلے کے عہد بہ عہد مطالعے کو خطبات کے علاوہ دیگر نگارشات میں کئی جگہ بیان کیا ہے، لیکن اسے فلسفیانہ موشگافیوں اور خلفا کے

اختیارات و احکامات یا منصب کی فضلیت یا خلفائے سابق کے کارناموں کی داد تک محدود نہیں کیا بلکہ اس ادارے کے قیام کی غایت اور مختلف ادوار تاریخی میں تصور خلافت اور اس سے متعلق دیگر سیاسی، عمرانی اور مذہبی عوامل کی نشاندہی کی ہے۔ حقائق کی دنیا میں اس تصور سے جو ٹھوس نتائج برآمد ہوئے ہیں اور ان کا اطلاق جس طرح دورِ حاضر کے حقیقی مسائل پر ہوتا ہے اُن کی چھان بین اقبال کا موضوع ہے۔ خلافت کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے عصر حاضر میں اس منصب کی عملی صورت کی وضاحت میں انھوں نے ایک اہم بات کہی ہے۔''

اب یہاں ذہن میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسمبلی میں جو لوگ منتخب ہو کر آئیں گے۔ کیا وہ تمام دینی امور کے ماہر ہوں گے؟ یہ سوال اقبال کے ذہن میں بھی اُبھرا تھا اسی لیے انھوں نے اس پر یوں اظہار خیال کیا:

''لیکن ابھی ایک سوال ہے جو اس سلسلے میں کوئی کرسکتا ہے اور وہ یہ کہ موجودہ زمانے میں تو جہاں کہیں مسلمانوں کی کوئی مجلس قانون ساز قائم ہوگی، اس کے ارکان زیادہ تر وہی ہوں گے جو فقہ اسلامی کی نزاکتوں سے ناواقف ہیں۔''

اس سلسلے میں ایرانی اسمبلی کی مثال اقبال کے سامنے تھی۔ ایران میں علماء کی ایک ایسی کونسل نامزد کی گئی تھی جو قانون ساز اسمبلی کی سرگرمیوں کی نگرانی کرتی تھی۔ اقبال کے خیال میں ایسا کرنا ہر لحاظ سے نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس طرح علما اور عوام کے دو گروپ بن جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ رقابت پر تلے رہتے ہیں۔ اقبال لکھتے ہیں:

''بہر حال ایرانی نظریہ دستور کچھ بھی ہو یہ انتظام بڑا خطرناک ہے اور سنی ممالک اسے اختیار بھی کریں تو عارضی طور پر۔ انھیں چاہیے وہ مجالس قانون ساز میں علماء کو بطور ایک مؤثر جزو شامل کرلیں لیکن علما بھی ہر اَمر قانونی میں آزادانہ بحث و تمحیص اور اظہار رائے کی اجازت دیتے ہوئے اس کی رہنمائی کریں۔ بایں ہمہ شریعت اسلامی کی غلط تعبیرات کا سد باب ہوسکتا تو صرف اس طرح کہ بحالت موجودہ بلادِ اسلامی میں فقہ کی تعلیم جس نہج پر ہو رہی ہے، اس طرح کی اصلاح کی جائے۔ فقہ کا

نصاب مزید توسیع کا محتاج ہے لہٰذا ضرورت اس اَمر کی ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ جدید فقہ کا مطالعہ بھی با احتیاط اور سوچ سمجھ کر کیا جائے۔''

اقبال کے نزدیک قانون ساز اسمبلی کی ہر لحاظ سے بالا دستی اشد ضروری ہے۔ ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

علامہ ہر حالت میں قانون ساز اسمبلی کی بالا دستی کے قائل ہیں وہ علما کی کسی نامزد کونسل کو اسمبلی کی نگرانی پر برداشت نہیں کرتے۔ انھوں نے 1906ء کے ایرانی دستور میں علما کی نگران کونسل کی شق پر سخت تنقید کے بعد اسے خطرناک انتظام "DANGERUOUS ARRANGEMENT" قرار دیا۔ ان کی رائے میں علماء بھی اسمبلی کا حصہ بنیں۔ اس کی آزادانہ قومی بحثوں میں مدد اور رہنمائی کی خدمات انجام دیں۔ مگر وہ علما کو نامزدگی کے ذریعے اسمبلی کی نگرانی پر مسلط کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتے۔''

مختصراً ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اقبال نے عارضی انتظام کے طور پر علما کی کونسل کی سفارش کی ہے ان کے خیال میں دوسرا متبادل طریقہ یہ ہے کہ خود اسمبلی، پارلیمنٹ یا سینٹ میں علما کی ایک موثر تعداد نمائندوں کے طور پر شامل ہو۔

جہاں تک اسلامی جمہوریہ پاکستان کی اسمبلی کا تعلق ہے اس کو اجتہاد کا اختیار دیا جا سکتا ہے۔ آج کل پاکستان میں کئی نامور علما انتخاب میں باقاعدہ حصہ لے کر منتخب ہوئے ہیں۔ مزید برآں ہمارے ملک میں عارضی انتظام کے طور پر علما کی ایک کونسل بھی قائم ہے۔ اس طرح وطن عزیز میں ہر دو طریقوں پر عمل ہو رہا ہے حالانکہ ان دونوں طریقوں کے پیچھے علما کے خدا کے نامزد کردہ حکمران بن جانے کا امکان ہے۔ اسی خدشے کو محسوس کرتے ہوئے اقبال نے اسے خطرناک قرار دیتے ہوئے اسے عارضی طور پر اختیار کرنے کے لیے کہا تھا۔ چونکہ داناؤں کا کہنا ہے کہ دو کشتیوں کا سوار کبھی بھی اپنی منزل پر نہیں پہنچتا۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ علامہ اقبال کی ہدایت پر عمل کریں اور اس طریقہ کار کو اپنائیں جو اس مسئلے کو مستقل حل ہو۔ دوسرے الفاظ میں ہمیں پاکستان میں عارضی انتظام کے طور پر علما کی قائم کونسل کو فوراً ختم کر دینا چاہیے اور آئندہ بھی اسمبلی میں علما کی

ایک موثر تعداد کو نمائندوں کے طور پر شامل رکھیں۔

ملت اسلامیہ کے لیے آئین قرآن مجید کی صورت میں موجود ہے اور اس کی صراحت کے لیے احادیث موجود ہیں۔ علاوہ ازیں فقہ کی متعدد کتب بھی دستیاب ہیں لیکن یہ بات نہایت افسوسناک ہے کہ ہم اجتہاد کا زبانی تذکرہ تو کرتے ہیں مگر یہ نہیں کہتے کہ اسمبلی کو ایسا کرنا ہے۔ وہ موجودہ اسمبلی کی طرح مطلق اختیار نہیں رکھتی اسے تو قرآن اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی متعین کردہ حدود سے باہر نہیں جانا ہے۔ اسی لیے اقبال نے اسلامی سلطنت کے قانون کے مسئلے پر بحث کرنا مناسب اور ضرور سمجھا۔ انھوں نے اپنی نگارشات میں بڑے واضح انداز میں تحریر کیا کہ حکومت الٰہی کا قانون قرآن مجید ہے۔ اقبال ''رموز بے خودی'' میں فرماتے ہیں:

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست
زیر گردوں سِرّ تمکین تو چیست؟
آں کتابِ زندہ ، قرآنِ حکیم
حکمت اُو لایزال است و قدیم

اسی طرح اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں حکومت الٰہی کے تحت جو اشعار کہے ہیں ان میں قرآن حکیم کو آئین کی حیثیت سے اپنا لینے کے فائدے بیان کیے ہیں۔

اس سے قبل ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ اقبال اسمبلی کو اجتہاد کا اختیار رکھنے کے حامی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ عملاً حکومت اس کو دینا پسند کرتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف مغربی جمہوریت کو ہدف تنقید بھی بناتے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاعر اقبال اور نثر نگار اقبال کے درمیان تضاد پایا جاتا ہے۔ ممتاز حسین اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''کم ازکم شعر وشاعری کی حد تک یہ کہنا مشکل ہے کہ اقبال کسی دوسری شخصیت کے مالک تھے مگر ان کے خطبات کے مطالعہ سے، جو انھوں نے 1929ء میں مدراس، حیدرآباد اور علی گڑھ میں دیے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب وہ کسی موضوع پر فلسفیانہ گفتگو کرتے تو اپنی شعری شخصیت کو معطل رکھا کرتے ہیں۔ کیا یہ عمل باعث استعجاب نہیں ہے کہ پہلے چھ خطبات میں انھوں نے اپنا کوئی ایک شعر بھی کسی خیال کی

تشریح وتوضیح کے لیے استعمال نہیں کیا ہے اور ان خطبات کی فہرست میں کوئی خطبہ بھی
براہ راست یا بالواسطہ عشق پر نہیں ہے، جس کی حیثیت ان کی شاعری میں ایک رہنما
جذبے یا امام کی ہے۔ اس کے برعکس یہ خطبات جو ان کی اسلامی فکر کا نچوڑ پیش کرتے
ہیں اپنی سپرٹ میں معلوماتی ہیں، منطقی استدلال کے خطوط پر استوار ہیں اور ان کے
اس اجتہادی بیان کی سپرٹ کے حامل ہیں کہ اسلام عقل استرائی کا ظہور ہے۔''

حالانکہ حقیقت کچھ یوں ہے کہ اقبال نے اپنے انگریزی خطبات میں عرفی، مولانا رومی اور ناصر علی سرہندی وغیرہ کے اشعار درج کیے ہیں۔ مزید برآں اقبال کے خطبات اور شاعری کے موضوعات مختلف ہیں۔ ملک حسن اختر اپنی کتاب ''اقبال اور نئی نسل'' میں اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''علامہ اقبال نے پہلے چھ خطبات میں اپنے شعر استعمال نہیں کیے مگر ناصر علی سرہندی، عرفی اور رومی کے اشعار نقل کیے ہیں۔ شعر، شعر ہوتا ہے۔ وہ علامہ کا اپنا ہو یا رومی کا۔ ساتویں خطبے میں علامہ نے جاوید نامہ سے اپنے اشعار کا ترجمہ انگریزی میں دیا...... اسی طرح انھوں نے اس بات کی نشاندہی بڑے فخر سے کی ہے کہ علامہ اقبال نے عشق پر کوئی خطبہ نہیں لکھا۔ ممتاز حسین صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ عشق خودی کو مستحکم کرنے والے عناصر میں سے ایک ہے۔ چنانچہ ''اسرارِ خودی'' میں یہ عنوان ملتا ہے: ''در بیان اینکہ خودی اَز عشق و محبت استحکام می پزیرد'' اور چوتھا خطبہ خودی کے موضوع پر ہے...... نامعلوم کہاں سے ممتاز حسین صاحب نے یہ غلط خیال اَخذ کر لیا ہے کہ شاعر اقبال عقل کا دشمن ہے۔''

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ اقبال کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کو بطور آئین اپنا لینا چاہیے لیکن بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قرآن کو بطور آئین اپنانا چودہ سو سال پیچھے کے زمانے میں لوٹ جانے کے مترادف ہے۔ اقبال اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

''اس سلسلے میں غور طلب امر قرآن مجید کا وہ مطمحِ نظر ہے جو اس نے زندگی کے
بارے میں قائم کیا اور جس میں اس کی نگاہیں جمود کی بجائے حرکت پر رہیں۔ لہٰذا
ظاہر ہے کہ جس میں کتاب کا مطمحِ نظر ایسا ہوگا، اس کی روش ارتقا کے خلاف کیسے ہو
سکتی ہے؟ البتہ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ زندگی محض تغیر ہی نہیں ہے اس میں حفظ و

ثبات کا عنصر بھی موجود ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ انسان جب اپنی تخلیقی فعالیت سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے نئے نئے جلوؤں کا مشاہدہ کرتا ہے تو اپنے انکشافات سے آپ ہی بے چین ہو جاتا ہے لہٰذا اس ہر لحظہ آگے ہی آگے بڑھنے والی حرکات میں وہ اپنے ماضی کو نظر انداز نہیں کر سکتا...... زندگی چونکہ ماضی کو بوجھ اُٹھانے آگے بڑھتی ہے، اس لیے ہمیں چاہیے کہ جماعت میں تغیر و تبدیل کا جو نقشہ ہم نے قائم کیا ہے، اس میں قدامت پسندانہ قوتوں کی قدر و قیمت اور وظائف کو فراموش نہ کریں۔ تعلیمات قرآنی کی یہی وہ جامعیت ہے جس کا لحاظ رکھتے ہوئے جدید عقلیت کو اپنے ادارات کا جائزہ لینا ہوگا۔''

اقبال کے خیال میں قرآن حکیم کو بطور آئین اپنانے سے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید سماج کو آگے بڑھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ انسان کی ہر طرح سے راہنمائی کرتا ہے۔ قرآن مذہب اور سیاست میں تفریق مٹانے کی پرزور تلقین و تاکید کرتا ہے۔ کسی بھی اسلامی مملکت کی آئین ساز اسمبلی قرآن حکیم میں بیان کردہ اصولوں کو نہ تو تبدیل کر سکتی ہے اور نہ ہی انھیں منسوخ کر سکتی ہے۔ اقبال نے اسمبلی کے اختیارات پر بھی بحث کی ہے۔ وہ اس سوال پر کہ کیا اسمبلی قرآن مجید میں بیان کردہ قوانین میں تبدیلی کا اختیار رکھتی ہے یا نہیں؟ اسی طرح بحث کرتے ہیں:

''اجماع کیا قرآن مجید کا بھی ناسخ ہے؟ ایک اسلامی مجلس میں تو یہ سوال اٹھانا ہی غیر ضروری ہے۔ لیکن ہم یہ سوال اُٹھا رہے ہیں تو محض اس غلط بیانی کے پیش نظر جو ایک مغربی نقاد نے اپنی تصنیف ''اسلامی نظریہ ہائے مالیات'' میں کی ہے۔ جسے جامعہ کولمبیا نے شائع کیا۔ اس کتاب کے مصنف نے بغیر کوئی سند پیش کیے ہوئے یہ لکھ دیا ہے کہ احناف اور معتزلہ کے نزدیک اجماع قرآن کا بھی ناسخ ہے۔ حالانکہ اسلامی فقہ میں اس قسم کی غلط بیانی میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی، نہ حدیث میں اس طرح کا کوئی اشارہ ملتا ہے۔''

پس اس بحث کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کا یہ عقیدہ ہے کہ اسمبلی قانون

ساز کا اختیار تو رکھتی ہے مگر آئین سازی کا اختیار نہیں رکھتی۔ اقبال کے نظریے کو اسلامی نظریہ کہنا کسی بھی لحاظ سے غلط نہیں ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اقبال نے اپنے خطبے ''الاجتہاد فی الاسلام'' میں عدلیہ کے کردار کے حوالے سے بالکل بحث نہ کی۔ ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ نے اقبال کے حوالے سے اس بحث کو چھیڑا ہے:

> ''علامہ اقبال کی تعلیمات کے پیش نظر وفاقی شرعی عدالت کو یہ اختیار نہیں دیا جانا چاہیے کہ وہ کسی قانون کے متعلق فیصلہ دے کہ وہ اسلام کے مطابق ہے یا مخالف ہے۔ یہ اختیار سپریم کورٹ کو دیا جا سکتا ہے جو ایک باقاعدہ عدالت ہے۔ قوم کے نمائندہ ادارے کو خود مختار ہونا چاہیے اس پر کسی نامزد ادارے کی بالادستی درست نہیں''

ملک حسن اختر محولہ بالا بیان پر یوں تنقید کرتے ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان بڑا الجھا ہوا ہے انھوں نے قانون سازی اور قانون کے بارے میں فیصلے کو ایک ہی چیز قرار دے دیا ہے''

مسلم فقہا کے نزدیک قرآن حکیم کے بعد آئین کا دوسرا ماخذ حدیث ہے۔ اقبال نے اپنے اس خطبے میں مغربی مفکر گولڈتسہیر کی رائے کا حوالہ دیا ہے کہ مجموعہ ہائے احادیث مجموعی طور پر قابل بھروسہ نہیں ہیں۔ اقبال نے ایک اور مفکر کا بھی ذکر کیا ہے جس کے نزدیک مجموعہ ہائے احادیث معتبر ہیں۔ اقبال کے خیال میں امام ابوحنیفہ نے قیاس کے مقابلہ میں حدیث کی پروا نہیں کی:

> ''چونکہ احکام مقصود بالذات نہیں اس لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کو آئندہ نسلوں کے لیے بھی واجب ٹھہرایا جائے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ امام ابوحنیفہ نے جو اسلام کی عالمگیر نوعیت کو خوب سمجھ گئے تھے، احادیث سے اعتنا نہیں کیا۔''

دراصل امام ابوحنیفہ نے احادیث کے استعمال میں بہت احتیاط برتی۔ اس سے بعض اصحاب اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ امام صاحب حدیث سے واقف نہیں تھے حالانکہ امام ذہبی کے نزدیک ان کا شمار حفاظ حدیث میں ہوتا ہے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''علامہ کا یہ لکھنا کہ امام ابوحنیفہ نے احادیث سے اعتنا نہیں کیا۔ امام صاحب پر بڑا

ستم اور ناانصافی کی بات اس درجے کی ہے کہ سید نذیر نیازی کو اس جملے پر اپنے نوٹ میں یہ لکھنا پڑا کہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ امام ابوحنیفہ نے احتیاط سے کام لیا اور واقعہ یہ ہے کہ صحیح بات یہی ہے، کیونکہ امام ابوحنیفہ کے زمانے میں لوگ کثرت سے روایات نقل کرتے تھے اور یہ روایت صحیح، ضعیف اور موضوع ہر قسم کی ہوتی تھیں۔ اس بناء پر امام صاحب اس بارے میں بڑے محتاط تھے۔ جب تک اصولِ جرح وتعدیل اور اصولِ روایت و درایت کی روشنی میں ان کو کسی روایت کی صحت کا یقین نہ ہو جاتا وہ اسے قبول نہیں کرتے تھے۔''

اقبال، امام ابوحنیفہ کے اس قدر محتاط رویے سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ احادیث کو جرح اور تنقید کیے بغیر قانون کا ماخذ تسلیم کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اقبال فرماتے ہیں:

''رہا یہ کہنا کہ امام موصوف نے احادیث سے اس لیے اعتنا نہیں کیا کہ ان کے زمانے میں کوئی مجموعہ حدیث موجود نہ تھا۔ سو اس سلسلے میں اوّل تو یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اس زمانے میں احادیث کی تدوین نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ عبدالمالک اور زہری کے مجموعے امام صاحب کی وفات سے کم از کم تیس برس پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ ثانیاً اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ امام موصوف ان مجموعوں سے فائدہ نہیں اُٹھا سکے یا یہ کہ ان میں فقہی احادیث موجود نہیں تھیں۔ جب بھی وہ اگر ضروری سمجھتے تو امام مالک اور امام احمد بن حنبل کی طرح خود اپنا مجموعہ احادیث تیار کر سکتے تھے۔ لہٰذا بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو میری رائے میں امام موصوف نے فقہی احادیث کے بارے میں جو روش اختیار کی سرتاسر جائز اور درست تھی۔ اندریں صورت اگر آزادی اجتہاد کی وہ تحریک جو اس وقت دنیائے اسلام میں پھیل رہی ہے۔ احادیث کو بلا جرح وتنقید، قانون کا ماخذ تسلیم کرنے پر تیار نہیں تو اس سے اہل سنت والجماعت سے ایک امام الائمہ ہی کی پیروی مقصود ہے۔''

اقبال نے قرآن وحدیث کے بعد قیاس واجماع کا بھی مختصر ذکر کیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ بھی آئین کے مآخذ ہیں۔ اقبال کے نزدیک قرآن، حدیث اور قیاس واجماع اجتہاد

کے اصولِ اربعہ ہیں۔

اقبال نے اپنے خطبے ''الاجتہاد فی الاسلام'' میں جدید معاشی مسائل کے حل کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اقبال کے خیال میں جب تک سماج میں عورتوں کی قدر و قیمت میں اضافہ نہیں ہوتا اس وقت تک مسلمانوں کی ملی حیات بھی مکمل نہیں ہو سکتی۔

اقبال کا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام کا قانونِ وراثت ہی درحقیقت بہت سے مسائل کا حل ہے اور یہ بڑی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ ان کے نزدیک مساواتِ مرد و زن کے پیشِ نظر وراثت میں برابری کا مطالبہ کرنا اسلام کے قانون عائلہ سے عدم واقفیت کے مترادف ہے۔ اقبال وراثت کے معاملے میں ضیا (ترکی شاعر جس نے طلاق، خلع اور وراثت میں مساواتِ مرد و زن کا مطالبہ کیا) کے خیال کی پرزور مذمت کرتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''رہا ترکی شاعر کا یہ مطالبہ کہ مساواتِ مرد و زن کے پیشِ نظر وراثت میں بھی برابر ہونی چاہیے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ ترکی شاعر اسلام کے قانون عائلہ سے کچھ زیادہ واقف نہیں۔ وہ نہیں سمجھتا کہ قرآن مجید نے وراثت کے بارے میں جو قاعدہ نافذ کیا ہے اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔ شریعت اسلامی میں نکاح کی حیثیت ایک عقد اجتماعی کی ہے اور بیوی کو یہ حق حاصل ہے کہ بوقت نکاح شوہر کا حق طلاق بعض شرائط کی بنا پر خود اپنے ہاتھ میں (بصورت تفویض) لے لے، یوں طلاق کے معاملے میں تو مرد و زن میں مساوات قائم ہو جاتی ہے۔ رہی وہ اصلاح جو شاعر نے قانون وارثت میں تجویز کی ہے تو اس کی بنیاد غلط فہمی پر ہے۔ اگر قانوناً مرد اور عورت کے حقوق میں مساوات مقرر نہیں کی گئی تو اس سے یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت اور برتری حاصل ہے۔ یہ خیال تعلیماتِ قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں صاف ارشاد ہے: ''وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ'' (یعنی جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں، اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔) اس بنا پر قرآن میں لڑکی کا جو حصہ وارثت میں متعین کیا گیا ہے وہ لڑکی کی کمتری کی بنا پر نہیں بلکہ ان فوائد کی بنا پر ہے جو معاشی اعتبار سے لڑکی کو

حاصل ہیں......شریعت اسلامیہ کی رُو سے لڑکی اس سارے جہیز کی خود ہی مالک ہے جو اسے والدین سے ملتا ہے اور وہ مہر کی بھی مالک ہے اور اگر مہر معجّل ہو، تو اس کی ادائیگی تک وہ قانوناً کوئی چیز گروی رکھ سکتی ہے اور پھر جب تک وہ زندہ ہے اس کے نان ونفقہ کی پوری ذمہ داری شوہر ہی کی ہے۔ اب اگر اس نقطۂ نظر سے اسلام کے قانونِ وراثت کا جائزہ لیجیے تو صاف ظاہر ہوگا کہ اسلام نے لڑکوں اور لڑکیوں کی معاشی حیثیت میں کوئی فرق نہیں کیا۔ اس کے برعکس لڑکوں اور لڑکیوں کے سہام میں جو عدم مساوات نظر آتی ہے۔ وہی اس مساوات کا ذریعہ بن جاتی ہے جس کا مطالبہ شاعر کر رہا ہے۔''

الغرض ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کی نگاہ میں تمام جدید معاشی مسائل کا حل اسلامی آئین میں مضمر ہے، لہٰذا اس کا نفاذ ضروری ہے البتہ اس سلسلے میں راہِ اجتہاد کو اپنانا ناگریز ہے۔

اس بحث کی روشنی میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کے خطبے ''الاجتہاد فی الاسلام'' کی رُو سے پاکستان میں نظامِ اسلام کی نفاذ کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اقبال کے خیال میں پاکستان کے حصول کا مقصد محض معاشی وسیاسی فائدہ حاصل کرنا نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی تصنیفات میں جا بجا اس مقصد کی نشاندہی کی ہے جیسے:

''اگر ہندوستان (برصغیر) میں مسلمانوں کا مقصد سیاسیات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبود ہے اور حفاظت اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں ہے جیسا کہ آج کل کے قوم پرستوں کے رویے سے معلوم ہوتا ہے تو مسلمان اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوں گے۔''

آج جب کہ ہم آئین سازی کے کٹھن مراحل طے کر رہے ہیں تو ہم اقبال کے افکار کو نشان راہ کے طور پر پاتے ہیں اور بلاشبہ ان کی ہستی ہمارے لیے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔

7 خطبہ الٰہ آباد، اقبالؔ کی سیاسی بصیرت

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم
کی کتاب ''نویدِ اقبال'' (مطبوعہ 2020ء) سے ایک باب

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلم اقتدار کا چراغ گل ہوگیا۔ انگریز تجارت کی غرض سے برعظیم پاک و ہند میں آئے تھے اور خطے کے مالک بن گئے۔ جنگ آزادی کے اختتام پر انگریزوں نے مسلمانوں سے چن چن کر بدلے لیے۔ انگریزوں نے فتح حاصل کرنے کے بعد ہندوستان کے عام لوگوں کو یہ جتایا کہ یہ دیسی سپاہیوں کی بغاوت اور غدر تھا۔ لیکن اس کی اصل وجوہ ان کے تمام اعلیٰ و ادنیٰ حاکم اور افسر اپنے طور پر بخوبی سمجھتے تھے کہ یہ مسلمانوں کی برپا کی ہوئی انقلابی تحریک اور جنگ آزادی تھی اور یہ بھی کہ مسلمانوں نے کچھ تو اپنے طور پر بعض دوسرے فرقوں کو اپنے ساتھ شریک کیا اور کچھ یہ بھی ہوا کہ چند ہندو راجے انگریزوں سے انتقام لینے کے لیے اس جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوئے اور بعض کئی دوسری وجوہ یا لالچ سے شریک ہوئے۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال حساس طبیعت کے مالک تھے۔ کم عمری میں ہی انھیں مسلمانوں کی بیداری فلاح و بہبود اور خدمت کا احساس دامن گیر ہوگیا تھا۔ زمانہ طالب علمی سان کا تخلیقی ارتقاء اہل ادب کے لیے حیرانی کا باعث تھا۔ اقبالؔ کی خوش بختی ہے کہ ایک تعلیمی اور تعمیری ماحول میسر آ گیا۔ انھوں نے اپنی مثبت سرگرمیوں سے اپنے ہم عصروں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اقبالؔ کا تاریخی مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ مسلمانوں کی عظمت رفتہ پڑھ کر فخر محسوس کرتے اور جب اپنے عہد کے مسلمانوں کی حالت زار کا مطالعہ کرتے تو ان کا دل کڑھنے لگتا۔

اقبالؔ کے والد شیخ نور محمد بھی مسلمانوں کے لیے آزادی کی تڑپ رکھتے تھے لیکن حسب ضابطہ تحریک نہ چلا سکے۔ اقبالؔ کے استاد گرامی مولوی میر حسن کی تربیت نے اقبالؔ میں شعری انقلاب پیدا کیا۔ ابتدائی نظموں میں آزادی کی تڑپ اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی جھلکیاں اقبالؔ کی بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔ اپنی مادر علمی میں ہی درس و تدریس کی سعادت اقبالؔ کے لیے تجربات کا سمندر تھی۔ جب ان کی شعری جولانیاں منظر عام پر آئیں تو لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے۔ انجمن حمایت اسلام میں ان کی طویل نظموں نے ان کے فکر و فلسفہ کی دھوم مچا دی۔ ان کی طویل نظمیں مقبول عام ہوئیں۔ نظم ''طلوعِ اسلام'' اقبال کے فکر و فلسفہ میں مسلمانوں کے درخشندہ ماضی اور عظمت رفتہ کی بھرپور نمائندگی ہے۔ رجائیت سے بھرپور اس نظم میں مسلمانوں کی بیداری اور مستقبل کے لیے اقبال کی بصیرت قابل تعریف ہے۔ ان کی فکر فردا بعد ازاں ان کے خطبہ الٰہ آباد کی صورت میں منظر عام پر آئی۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''1923ء کی صورت حال گذشتہ سال کے مقابلے میں حوصلہ افزاء اور اطمینان بخش تھی۔ ترکوں کو یونانیوں کے خلاف جوابی کارروائیوں میں خاصی کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ ستمبر 1922ء میں انھوں نے عصمت پاشا کی سرکردگی میں سمرنا پر قبضہ کرلیا۔ اس فتح پر ہندی مسلمانوں نے زبردست خوشیاں منائیں اور مساجد میں گھی کے چراغ جلائے۔ ترکوں کو مشرقی یونان اور ادرنہ بھی واپس مل گئے۔ ایران بھی انقلابی تبدیلیوں کی طرف گامزن تھا۔ مصر سے برطانوی پروٹیکٹوریٹ ختم ہوا اور سعد زاغلول پاشا کی قیادت میں مصر نے آزادی کا اعلان کر دیا۔ مراکش میں ہسپانوی فوج کے مقابلے میں مجاہد ریف عبدالکریم کا پلہ بھاری تھا۔ ہندوستان میں تحریک ترک موالات زوروں پر تھی۔ جس کے متاثرین میں اسی فیصد مسلمان تھے۔ بیداری کی اس لہر نے ہندی مسلمانوں کے جذبات میں زبردست ہلچل مچا دی تھی''۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے مسلمانوں کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ انھوں نے 1900 سے قوم کی بیداری کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ ابتدائی نظموں میں ''تصویر درد''، ''صدائے درد''، ''نیا شوالہ''، ''پرندے کی فریاد''، ''بچے کی دُعا''، خضرِ راہ''، طلوعِ اسلام''، ''شکوہ''، ''جوابِ شکوہ''،

''ذوق وشوق''، ''مسجد قرطبہ'' ایسی نظموں کو پیش کر کے اقبالؔ نے قوم کو بیداری کا پیغام دیا۔ درج ذیل شعر تو ان کی فکری آزادی اور غلامی سے نجات کا اشارہ کرتا ہے:

ؔ آزاد مجھ کو کردے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

اسی طرح ''قومی زندگی'' اور ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' ایسے مضامیں اور خطوط بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں کہ اقبال کو برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی آزادی کا کس قدر خیال تھا۔ اقبالؔ جانتے تھے کہ انگریز تنگ نظر اور ہندو کینہ پرور ہیں۔ انگریز 'تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو' کے اصول پر کاربند تھے۔ جب کہ ہندو منافقت کی پالیسی پر عمل کرتے تھے۔ 1905ء کو بنگال تقسیم کردیا گیا۔ لیکن انگریزوں نے ہندوؤں کی خوشنودی کی خاطر اس تقسیم کو منسوخ کردیا۔ علامہ اقبال کو اس کا گہرا دکھ ہوا۔ عطیہ بیگم کے نام 14 دسمبر 1911ء کے خط میں اقبالؔ نے لکھا:

''ہندوؤں نے بنگال کے دو حصوں (ہندو بنگال اور مسلم بنگال) میں تقسیم کو حکومت کی طرف سے بنگالی قومیت کے قلب پر ایک ضرب کاری سے تعبیر کیا ہے لیکن حکومت نے دہلی کو دارالسلطنت قرار دے کر اپنے فیصلے کی خود ہی بڑی ہوشیاری سے تنسیخ بھی کردی۔ بنگال سمجھتا ہے جیت اس کی رہی لیکن اسے نظر نہیں آتا کہ اس کی اہمیت گھٹا کر صفر کردی گئی ہے''۔

اس مسئلے سے متعلق دو شعر ہو گئے۔

ؔ مندمل زخم دل بنگال آخر ہوگیا
وہ جو تھی پہلے تمیز کافر و مومن ہوگئی
تاج شاہی آج کلکتہ سے دہلی آگیا
مل گئی بابو کو جوتی اور پگڑی چھن گئی

اقبالؔ یورپ جانے سے قبل متحدہ قومیت کے حامی ضرور تھے، مبلغ نہیں تھے۔ یورپ سے واپسی کے بعد انھوں نے ہندو پاک کے حالات کو یکسر تبدیل پایا۔ انھوں نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے مظالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور مسلمانوں کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کا بغور

جائزہ لیا۔ یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ قائداعظم سے کہیں پہلے علامہ اقبالؔ نے دوقومی نظریہ پیش کردیا۔ کیوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب قائداعظم کانگرس میں تھے۔ گویا علامہ کی منزل مقصود ایک آزاد مملکت (جو بعد میں ''پاکستان'' کا روپ دھارگئی) تھی۔ جسٹس جاوید اقبال نے لکھا ہے:

> ''1909ء میں وہ اس عقیدے پر پہنچ چکے تھے کہ برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنا اپنا قومی تشخص الگ الگ برقرار رکھنا چاہیے۔''

اس دور میں اقبالؔ نے اپنی تحریروں کے ذریعے مسلم قومیت کے اصولوں کو اجاگر کیا۔ جب تحریک خلافت اور تحریک موالات کے درمیان بہت سے سیاسی رہنما مسلم اتحاد کے خواب دیکھ رہے تھے یا ان کا مطمع نظر انگریزی حکومت کی خوشنودی کا حصول تھا۔ جب علامہ اقبال نے مسلمانوں کی اس بے حسی کو دیکھا تو انھوں نے عملی سیاست میں اترنے کا ارادہ کرلیا۔ جسٹس جاوید اقبالؔ لکھتے ہیں:

> ''تحریک خلافت یا تحریک موالات کے دوران انھیں احساس ہوا کہ دنیائے اسلام کے تمام ممالک پر تو علاقائی قومیت کا بھوت سوار ہے اور برصغیر میں مسلمانوں کے بیشتر سیاسی رہنما یا تو ہندو مسلم اتحاد کے سراب میں بھٹک رہے ہیں یا انگریزی حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے ہی کو اپنا مقصد حیات سمجھتے تھے۔ اس مرحلہ پر اقبالؔ مسلم قائدین سے کٹ گئے۔ بہرحال ان کا تعلق پنجاب یا ایک مسلم اکثریتی صوبہ سے تھا۔ اس لیے فطرتاً وہ سیاست میں جارحانہ رویہ رکھتے تھے۔ مدافعانہ رویہ کے قائل نہ تھے۔ پس انھوں نے عملی سیاست کے خارزار میں اترنے کا مقصد اس لیے کیا کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو اپنے مطالبات منوانے کے لیے قومی سطح پر منظّم کر کے ہندو اکثریت اور انگریزی حکومت دونوں کے مقابلہ میں کھڑا کیا جائے۔''

ہندو مہا سبھا یا سورج پارٹی سیاسیات کے میدان میں اس طرح چھائی ہوتی تھی کہ مسلمانوں کے کسی بھی مطالبے کو درخور اعتنا نہ سمجھا جاتا۔ مسلم لیگ نے بھی ان مطالبات کو بار بار دہرایا لیکن بے سود رہا۔ لیکن اسی منافرت اور فرقہ وارانہ تعصب کے ماحول میں ہندو، مسلم گروہوں کے درمیان اتفاق واتحاد یا مفاہمت کرنا ناممکن تھی۔ پنجاب میں دیہاتی، شہری کا سوال اور برادریوں

کی تقسیم نے سیاست کے اُفق پر غلط اثرات چھوڑے۔ اس دور میں جو سیاسی تنظیمیں موجود تھیں، اس قدر کمزور تھیں کہ قبائلی تعصب اور فرقہ پرستی چھڑا کر مسلمانوں کو ملی سطح پر متحد کرنے کی قوت اور اثر نہ رکھتی تھی۔ عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں:

''مائیکل اڈوائر نے پنجاب کے دیہات کے دیہاتی شہری مسلمانوں کو لڑا کر ان کی ملی وحدت و یکجہتی کو پارہ پارہ کیا۔ 1923ء میں جنم لینے والی یونینسٹ پارٹی وقت تک مضبوط پوزیشن حاصل کرنے کے باوجود قبائلی تعصب کو ہوا دینے میں پیش پیش تھی''۔

جسٹس جاوید اقبال کا کہنا ہے:

1926ء کے ابتدائی مہینوں میں ......احباب کی محفلیں بھی تھیں، جن میں عالمی، ملکی سیاسیات یا صوبائی سیاسیات پر گفتگو ہوتی''۔

چنانچہ ہندوستان خصوصاً پنجاب کے مسلمانوں کی اس صورت حال کو پیش نظر رکھ کر اقبالؔ کا یہ انتہائی عقل مندانہ اقدام تھا کہ انھوں نے قوم وملت کی نیا کو پار لگانے کی ٹھانی اور ایسے نازک حالات میں جب کہ ہندو قوم اپنی تعصّبانہ پالیسیوں پر عمل پیرا تھی، اقبالؔ نے عملی سیاست کے خارزار میں اترنے کا اقدام کیا اور اپنے سیاسی تفکر کو جلا دی، جس نے مسلمانوں کی سیاست اور اور سیاسی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی اور اقبالؔ ایک کامیاب لیڈر کی صورت میں قوم کے سامنے جلوہ افروز ہوئے۔ اقبالؔ کے کارناموں اور سیاسی تفکر کے بارے میں عاشق حسین بٹالوی کہتے ہیں:

''اقبالؔ 1927ء سے 1930ء تک پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن رہے۔ یہ تین سال انھوں نے یونینسٹ پارٹی کے اندر رہ کر اس جماعت کے طریق کار کو بغور دیکھا۔ شہری دیہاتی چپقلش لیجسلیٹو کونسل کے اندر اسی پارٹی نے پیدا کی اور پھر اس چپقلش نے صوبہ کی پوری آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اقبالؔ سے یہ ساری باتیں پوشیدہ نہ رہ سکتی تھیں۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اقبالؔ ایسے بلند پایہ مفکر، فلسفی اور شاعر کو صوبے کی لیجسلیٹو کونسل میں نہیں جانا چاہیے تھا''۔

نومبر 1928ء کو شفیع لیگ کے وفد نے سائمن کمیشن کے سامنے شہادت دی۔ اس وفد

میں اقبال بھی شامل تھے۔ کمیشن نے کچھ حد تک مسلمانوں کے مطالبات قبول کرنے کی سفارش کی لیکن اقبال کمیشن کی رپورٹ سے مطمئن نہ تھے۔ وسط 1930ء میں سائمن کمیشن رپورٹ پر تنقید کی لیکن وائسرائے کی گول میز کانفرنس کے اعلان نے سائمن کمیشن کی رپورٹ کی اہمیت کو ختم کر دیا۔ لہٰذا یہ مشق لاحاصل ثابت ہوئی۔ 20 اگست 1928ء کو اقبال نے نہرو رپورٹ پر دلائل سے تنقید کی۔ 29 دسمبر 1928ء کی آل پارٹیز کانفرنس منعقدہ دہلی آغا خان کی صدارت میں منعقد ہوئی، جس میں جناح لیگ کے سو نمائندگان شریک تھے۔ اجلاس میں نہرو رپورٹ کی مذمت ہوئی اور اقبال نے متفقہ ریزولوشن کے بارے میں وہ حدیث سنائی:

"میری امت کا اجماع کبھی گمراہی پر نہیں ہوگا"۔

13/ اکتوبر 1929ء کو لاہور میں منعقدہ اجلاس میں زیر صدارت اقبال نادر خان نے مفید مشوروں سے نوازا جب کہ 4 مارچ 1929ء کو اقبال نے پنجاب کونسل میں خسارے کے صوبائی بجٹ پر تقریر کی اور تجاویز پیش کیں کہ حکومت ٹیکس کو صوبہ جاتی بنائے۔ 1929ء میں جناح اور اقبال میں ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔ اس کے بارے میں محمد علی جناح نے انعام اللہ کو 14 مئی 1944ء کو خط لکھا:

"1929ء سے میرے اور سر محمد اقبال کے نظریات میں ہم آہنگی پیدا ہوئی اور وہی ایک عظیم اور اہم مسلمان تھے جنھوں نے ہر مرحلہ پر میری حوصلہ افزائی کی آخری دم تک میرے ساتھ مضبوطی سے کھڑے رہے۔"

جنوری 1930ء ہندوؤں کی نافرمانی کی تحریک چلی اور سارا سال جاری رہی۔ 7 مارچ 1930ء کو اقبال نے پنجاب کونسل میں بجٹ پر آخری تقریر میں ترقی سے بیکاری کی لعنت کو دور کرنے کا مشورہ دیا۔ 15 نومبر 1930ء گول میز کانفرنس کے دوران اقبال نے سر آغا خان کے نام تار دیا:

"تازہ خبریں اضطراب انگیز ہیں۔ مسلمانانِ پنجاب کی رائے عامہ دہلی مسلم کانفرنس کی منظور کردہ قراردادوں پر قائم ہے۔ اس میں ردوبدل کو ناقابل برداشت خیال کرتی ہے۔ اگر کوئی ردوبدل کیا گیا تو مسلم مندوبین پر اعتماد نہیں رہے گا۔ اگر ہندو، مسلم مطالبات کو نہیں مانتے تو مسلمان کانفرنس چھوڑ کر چلے آئیں۔"

اس تار پر لاہور کے اخبار ٹریبون نے لکھا:

''ہندو مسلم مفاہمت کی راہ میں دراصل اقبال ہی حائل ہے''۔

23 نومبر 1930ء اقبالؔ نے مسلم آؤٹ لک کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

''پنجاب اور دوسرے حصوں کے مسلمان جداگانہ انتخاب پر مضبوطی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں''۔

1930ء الٰہ آباد اجلاس کی صدارت کے لیے جناح کے اقبالؔ کا نام تجویز کرنے کے بارے میں محمد احمد خان کی رائے کچھ یوں ہے:

''اقبالؔ کو کل ہند مسلم سیاسیات میں نہایت ہی نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہو چکا تھا اور ہندو پریس نے انھیں چوٹی کا فرقہ پرست لیڈر قرار دے دیا تھا۔ غالباً اس لیے انھیں اجلاس الٰہ آباد کے لیے لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔''

خطبہ الٰہ آباد میں ایک الگ مملکت کا تصور اقبالؔ کی سیاسی بصیرت کا آئینہ دار ہے وہ ایک خود مختار اور آزاد مملکت کا تصور پیش کر کے مسلمانوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کر کے ''مصورِ پاکستان'' کہلائے۔ آپ نے فرمایا:

''مجھے یقین ہے کہ یہ اجتماع ان تمام مطالبات کی نہایت شدومد سے تائید کرے گا، جو اس قرارداد میں موجود ہیں۔ یہ ذاتی طور پر میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کر لے یا باہر رہ کر۔ مجھے تو نظر آتا ہے کہ اور میں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظّم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی''۔

ایم۔ ایس ناز نے اپنی کتاب ''اقبال اور تحریک پاکستان'' میں لکھا ہے:

''علامہ اقبال کے خطبۂ صدارت کا بنیادی تصور یہ تھا کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں کو ملا کر ایک اسلامی ریاست تشکیل دی جائے۔ وہ ایک ایسی اسلامی ریاست چاہتے تھے، جو غیروں کے تسلط سے آزاد ہو۔ جہاں مسلمان آزادی کے ساتھ زندگی

بسر کر سکیں اور اس کے اقتصادی مسائل بھی حل ہو جائیں۔ اقبالؔ نے اسلامی ریاست کے قیام کے مطالبہ صرف اس لیے کیا کہ ہندوستان میں داخلی امن کے بعد اسلام کی اپنی اصل شکل وصورت میں نمودار ہو اور وہ ملوکیت کے اثرات سے آزاد ہو جائیں۔ انھوں نے یہ مطالبہ اس لیے بھی کیا کہ اسلام کو اپنی نشو ونما اور بقاء کے لیے ایک ایسا خطۂ سرزمین میسر آجائے جس میں وہ تمدنی قوت کے طور پر زندہ رہ سکے اور وہاں کے لوگ اسلامی اوصاف سے اپنی زندگیوں کو متصف کر سکیں۔ گویا اقبالؔ نے اسلامی ریاست کی تشکیل کا سوال اس لیے بھی اٹھایا کہ برصغیر کے مسلمان اسے اسلامی اصولوں کی ایک تجربہ گاہ بنا سکیں اور دنیا کے سامنے اپنا وہ طرزِ فکر وعمل پیش کریں جو فلاح دارین کا نمونہ ہو''۔

خطبہ الٰہ آباد علامہ اقبال کی بصیرت ثابت ہوا۔ اس تاریخی خطبہ کے بعد علامہ اقبال لندن گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔ خطبہ الٰہ آباد اور گول میز کانفرنس میں علامہ اقبالؔ کی شرکت نے تحریک پاکستان میں ان کے کردار کو اور مستحکم بنا دیا۔ آپ کو لندن میں منعقد ہونے والی گول میز کانفرنسوں میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی نمائندگی کا اعزاز حاصل ہو گیا۔

یہ خطبہ اقبالؔ کی مفکرانہ اور مدبرانہ سوچ کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی سیاسی زندگی کی پوری عکاسی خطبہ الٰہ آباد میں موجود ہے۔ اقبالؔ نے اس خطبے میں ''خطے'' کا مطالبہ نہیں بلکہ مسلم ریاست کی پیش کش کی تھی۔ انھوں نے اپنے اس خطبہ میں اسلام کے تاریخی اور تہذیبی کردار کا ایک ایسا خوب صورت نقشہ کھینچا کہ مسلم مفکرین اس کی مثال پیش نہیں کر سکتے۔ اس خطبہ کو نظریہ پاکستان کی اساس کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ کیوں کہ اقبالؔ نے تقسیم ہند کی بات ہی نہیں کی بلکہ مسلم ریاست کی تشکیل کے لیے فکری بنیاد مہیا کر کے مصور پاکستان کہلائے۔ آپ نے اسلام اور قومیت کے تصور کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا۔ سید حسن ریاض نے قومیت کے بارے میں لکھا ہے:

''قومیت کی نہایت مقبول تعریف یہ ہے کہ وہ سب لوگ جن کی نسل ایک ہو، زبان ایک ہو اور پھر وطن ایک ہو، ایک قوم ہو۔ ہم اس قومیت اور اس کی تعریف کے ہرگز

قائل نہیں لیکن پھر بھی اہل یورپ چوں کہ اسے مانتے ہیں اوراس قوت ہی کے سیاسی عقائد ساری دنیا پر مسلط ہیں۔ لہٰذا قومیت کے اسی خیال اور اس کی تعریف کی بنیاد پر پورے ہندوستان کے باشندوں کو جنھیں ہندو ایک قوم کہہ رہے تھے جانچنا اور پرکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے''۔

اقبالؔ نے کہا:

''یہ ایک نا قابلِ انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت ایک اخلاقی نصب العین اور نظام سیاست کے (اس آخری لفظ سے میرا مطلب ایک ایسی جماعت ہے جس کا نظم و ضبط کسی نظام قانون کے ماتحت عمل میں آتا ہے اور جس کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح سرگرم کار ہو) اسلام ہی وہ سب سے بڑا اجزو ترکیبی تھا، جس سے مسلمانانِ ہند کی تاریخ حیات متاثر ہوئی۔ اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات ولطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارومدار ہے اور جن سے متفرق ومنتشر افراد بتدریج متحد ہوکر ایک متمیّز و معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ دنیا بھر میں شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی جماعت اسلامی کارفرما ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندرونی اتحاد اور ان کی نمایاں یکسانیت، ان کے قوانین، سیاسی افکار نے نہایت تیزی کے ساتھ نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر تمام دنیائے اسلام میں انقلاب پیدا کر رکھا ہے''۔

اقبالؔ نے اسلام کے الگ قومی تشخص کو بڑے منفرد انداز میں ابھار کر ایک الگ ریاست کے قیام کی ضرورت پر زور دیا۔

؎ اپنی ملت پہ قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ﷺ ہاشمی

اسلامی ریاست کے قیام کے طرف سفر کی پیش گوئی اقبالؔ نے خطبہ میں کچھ اس طرح سے دی:

''آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لیے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے، جو اس امر سے مایوس نہیں ہوا ہے کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے۔ جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے۔ جس کا عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے، اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا''۔

آپ نے اپنی تجاویز پیش کرنے کے بعد وضاحت کی:

''اس تجویز کو سن کر نہ انگریزوں کو پریشان ہونا چاہیے، نہ ہندوؤں کو۔ ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی اکثریت قائم کر سکے۔''

''میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظّم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہے، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شہریت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہوں گے۔''

اقبالؔ عملی اقدامات کے خواہاں تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ جو کچھ کہا جائے اس پر عمل ہو۔

''عمل کسی تدبیر کا محتاج نہیں، نہ ہی اسے درسی منطق کی ضرورت ہے۔ وہ جب قلب انسان سے نکل کر کھلی فضا میں آتا ہے تو اپنا منطق ساتھ لاتا ہے''۔

خطبہ الٰہ آباد کو قیام پاکستان کے خواب کی طرف عملی پیش رفت کہا جا سکتا ہے۔ مصور پاکستان نے اپنے فکری جولانیوں میں مسلم ریاست کے قیام کی مہر ثبت کر دی۔ اس تاریخی خطبے کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں اقبالؔ نے صاف صاف لفظوں میں پاکستان کا خیال پیش کیا۔ یہ خیال

جس لاثانی اسلوب اور جس جذبے اور یقین کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، آپ اسے پاکستان کا مطالبہ اور پیش گوئی قرار دے سکتے ہیں۔ اصل الفاظ یہ ہیں:

"I WOULD LIKE TO SEE THE PUNJAB, NORTH-WEST PROVINCE, SINDH AND BOLUCHISTAN AMALGAMATED INTO A SINGLE STATE. SELF-GOVERNMENT WITHIN THE BRITISH EMPIRE OR WITHOUT THE BRITISH EMPIRE, THE FORMATION OF CONSOLIDATED NORTH-WEST INDIAN MUSLIM STATE APPEARS TO ME TO BE THE FINAL DESTINY OF THE MUSLIMS AT LEAST OF NORTH-WEST INDIA"

(میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ریاست میں ملا دیا جائے خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے یا اس سے باہر۔ مجھے تو اب نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظّم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی۔)

اقبال نے حکومت برطانیہ پر واضح کر دیا کہ مسلمان ہر لحاظ سے ایک الگ قوم ہے۔

''ہم جب جداگانہ انتخاب پر زور دیتے ہیں، تو اس کی وجوہات کیا ہیں۔ اپنے ملک میں اور ایسے حالات میں علاقائی حلقہ ہائے انتخاب تمام مفادات کو مناسب نمائندگی عطا نہیں کر سکتے اور قدرتاً وہ ایک ہی طبقے کے خطبہ اقتدار کو پیدا کر دیتے ہیں''۔

اقبال احمد خان نے بھی اس کی تائید اِن الفاظ میں کی ہے:

''علامہ اقبال جداگانہ انتخاب سے کسی صورت میں دست بردار نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جداگانہ انتخاب سے دست بردار اور مخلوط انتخاب پر رضامندی سے ایک ایسی متحدہ قومیت کی تشکیل ہوگی، جو اسلام کا صحیح نصب العین نہیں ہے۔ خلافت کانفرنس والوں نے تجاویز دہلی کی تائید کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب ان کی اس روش کو مناسب نہیں سمجھتے تھے''۔

علامہ اقبال نے ایک خودمختار ہندوستان میں وجدانی طرزِ حکومت کی بھرپور مخالفت کی ہے۔ان کی رائے میں اصل وفاق جیسا ہونا چاہیے، سائمن کمیشن کی رپورٹ عملاً اس کی نفی کرتی ہے۔اسی طرح نہرو رپورٹ کو بھی آپ نے غیر حقیقی قرار دے دیا:

''سائمن رپورٹ نے مسلمانوں کے ساتھ ایک بہت بڑی ناانصافی کی ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے بنگال اور پنجاب میں ان کے لیے آئینی اکثریت کی سفارش نہیں کی۔اس کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلمان یا تو میثاق لکھنؤ کے پابند رہیں یا مخلوط انتخابات کو اختیار کرلیں۔حکومت ہند نے سائمن رپورٹ کے متعلق جو یادداشت میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کی شکایت بجا ہے کہ انھیں بنگال اور پنجاب میں تناسب آبادی کے لحاظ سے نمائندگی کا حق کیوں نہیں دیا گیا۔محض یہ امر کہ انھیں دوسرے صوبوں میں ''پاسنگ'' حاصل ہے۔اس نقصان کی تلافی نہیں کرتا۔تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس یادداشت میں بھی مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش نہیں کی گئی''۔

اقبالؔ کی سیاسی بصیرت نے دفاعی مسئلے کو بھی بحث کا موضوع بنالیا۔

''انگریز ہی ہیں جو ہندوستان کو بیرونی حملوں سے بھی بچائے ہوئے ہیں اور اندرونِ ملک بھی امن وامان قائم رکھنے میں ''غیر جانبدار'' ہیں۔بہرحال وفاق کا جیسا مطلب میں نے سمجھا ہے، ایسے وفاقی ہندوستان میں مسئلے کا بس ایک ہی پہلو باقی رہے گا، یعنی خارجی خطرے سے بچاؤ۔ہندوستان کے اندرونی امن وامان کے لیے صوبائی فوجیں بالکل لازمی ہیں۔ان کے علاوہ ہندوستان کی وفاقی کانگرسی شمال مغربی سرحدی صوبے میں ایک زبردست قومی فوج رکھ سکتی ہے''۔

انھوں نے گول میز کانفرنسوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کردی کہ ان کانفرنسوں میں بھی مسلمانوں کا مؤقف ایک ہی رہے گا اور وہ الگ مسلم ریاست کا قیام ہے:

''ہم مسلمان سات کروڑ ہیں اور ہندوستان کے دیگر باشندوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مربوط ومستحکم ہیں۔اگر ہندوستان کے کسی گروہ کو لفظ قوم کے جدید مفہوم سے صحیح طور پر تعبیر کیا جاسکتا ہے تو وہ صرف ہم مسلمان ہی ہیں''۔

اقبالؔ نے اسلام میں قومیت کا تصور پیش کیا۔ ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' مقالہ پیش کیا؛ تحریک ترک موالات کی مخالفت کی؛ ہندوستان میں ایک اسلامی مملکت کا تصور اور سائمن رپورٹ کے حوالے سے اپنا زاویہ نظر پیش کیا۔ اقبال نے ہندوؤں کی چالوں، سکھوں کی دوعملی، انگریزوں کی حکمت عملی، مسئلہ دفاع، تجاویز گول میز کانفرنس اور مسلمانوں کے جداگانہ تشخص پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے سات کروڑ عوام کے جذبات کی ایسی ترجمانی کی جو بعد میں پاکستان کی شکل میں عملی طور پر سامنے آئی۔ ڈاکٹر عبدالحمید نے لکھا ہے:

''اس خطبے میں انھوں نے اس قسم کی باتیں بھی کہہ ڈالیں (الف) اگر اسلامی صوبوں کا ایک بلاک ملک کے شمال مغربی خطے میں قائم ہوجائے تو مسلمان تمام بیرونی حملہ آوروں کے خلاف ہندوستان کے دفاع کا فرض انجام دیں گے۔ اس انتظام سے ہندوستان کی اندرونی حالت میں استحکام پیدا ہوگا اور ہندوؤں کا یہ خدشہ دور ہوجائے گا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ہمدردیاں اسلامی ممالک کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ملک کا ہر صوبہ اپنی فوج رکھنے مجاز ہوگا۔ کل ملک کے دفاع کے لیے تمام قوموں میں سے بھرتی کی ہوئی ایک مشترکہ فوج ہوگی جو اپنے فرائض ناطرف داری سے انجام دے گی۔ (ب) مجھے ہندو مسلم مسئلے کے حل کی طرف ابھی تک مایوسی نہیں ہوئی۔ (ج) ہندوستان پر مسلمانوں کے بہت سے حقوق ہیں اور ہم مسلمانوں کا مرنا جینا ہندوستان کے ساتھ ہی ہے''۔

ڈاکٹر محمد ریاض رقم طراز ہیں:

''اس خطبے میں آپ نے 1930ء تک کی ہندو مسلم اور انگریز سیاست کو بے نقاب کیا اور غیر مصالحانہ اور بے باکانہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔''

یہ خطبہ ایک دستاویز ہے، جس میں برصغیر کی 1908ء سے لے کر 1930ء تک کی سیاسی رسہ کشی اور مسلمانوں کی بیداری کی داستان ہے۔ مختصر طور پر اس خطبہ کو نظریۂ پاکستان اور پاکستان کے قیام کی پیش گوئی کہا جاسکتا ہے۔ برعظیم پاک و ہند میں موجود صحافیوں، دانشوروں اور ادیبوں نے اپنے اپنے انداز میں وہاں کے مسائل کا حل پیش کیا، مختلف سیاسی جماعتوں کے نقطہ ہائے نظر

منظر عام پر آئے۔ جواہر لعل نہرو کی 1928ء میں پیش کردہ رپورٹ اور پھر اس کے جواب میں 1929ء میں قائداعظم محمد علی جناح کے چودہ نکات نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ 29 اور 30 دسمبر 1930ء کے الہ آباد مسلم لیگی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے علامہ اقبال نے جو تجاویز پیش کیں، ہمارے تصورِ حیات اور فلسفہ سیاست میں اہم ترین سرمائے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے اس بات کی وضاحت کردی کہ ہمارا عالم گیر نظامِ سیاست ہمارا منشور ہے۔ ایک آزاد اسلامی ریاست کے علاوہ کوئی دوسری بات اس خطے کے مسائل کا حل نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے شمالی مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو موقع دینے، پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ریاست بنانے اور سات کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کا حق ادا کیا۔ اقبال نے اس آزاد اسلامی ریاست کے قیام کے لیے عملی جدوجہد کا لائحۂ عمل بھی پیش کردیا۔ اقبال کا یہ عالمانہ خطبہ درحقیقت نظریۂ پاکستان کی صورت ہمارا نصب العین ثابت ہوا۔

برعظیم پاک و ہند کے مسئلے کا یہ حل وقتی یا جذباتی نہیں تھا۔ وہ شمالی مغربی اُن کے علاقوں کو اکٹھا کرکے ایک ایسی اسلامی ریاست کا خواب دیکھ رہے تھے جس میں قرآن اور اسوۂ حسنہ ﷺ اسی قوت اور طاقت کے ساتھ نظر آئے جس قوت سے ریگزارِ عرب میں انقلاب پیدا ہوا تھا اور اس اسلامی ریاست سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا متاثر ہو۔

ے
اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ﷺ

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

علامہ اقبالؒ

8 پاکستان، نفاذِ اسلام اور اقبال

چودھری مظفر حسین

کی کتاب (مطبوعہ 1993ء) کا ایک باب

حکمت اقبال کے مسلمہ شارح ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے قیامِ پاکستان کے لیے ابتدائی سالوں میں یہ پیش گوئی کی تھی کہ کائنات کی مخفی قوتیں ہمیں مجبور کریں گی کہ ہم فلسفہ خودی کو پاکستان کا سرکاری نظریہ بنائیں اور اس فلسفہ کو ''سرکاری نظریہ'' بنانے کی وضاحت ان الفاظ میں کی:

> ''فلسفہ خودی کو ریاست کا سرکاری نظریہ بنانے کے معنی فقط یہ ہیں کہ اسلام کو ریاست کا سرکاری نظریہ بنایا جائے اور فلسفہ خودی کو اس کی سرکاری ترجمانی کے لیے کام میں لایا جائے''۔

ڈاکٹر رفیع الدین کا یہ مؤقف بہت واضح اور محکم تھا کہ نفاذِ اسلام کے لیے اسلام کی صرف وہی تشریح کام دے گی جو علامہ اقبال نے کی ہے۔ ان کا یہ مؤقف ان کی ایک غیر معروف کتاب ''پاکستان کا مستقبل'' میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ یہ مقالہ پاکستان کے سیاسی نظریہ کے طور پر فلسفہ خودی کی اہمیت واضح کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یہ مقالہ قراردادِ مقاصد پیش ہونے سے پہلے لکھا گیا تھا لیکن اس کی اشاعت قراردادِ مقاصد کی منظوری کے بعد ہوئی۔ قراردادِ مقاصد کی منظوری کی بنا پر پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کا دستوری اور قانونی جواز پیدا ہوا تو مصنف نے اسے قیامِ پاکستان ہی کی طرح کا ایک دوسرا معجزہ قرار دیا اور پاکستان کا مستقبل اب انہیں ایک عالمگیر اسلامی ریاست کی

صورت میں نظر آنے لگا۔ چنانچہ انہوں نے لکھا:

’’یہ قرارداد اس خیال کی اور تائید کرتی ہے کہ مستقبل کی عالمگیر اسلامی ریاست پاکستان ہی ہے۔ اقبال کے فلسفہ خودی کا ظہور پانا، پھر اس کا زیادہ مفصل اور منظّم صورت اختیار کرنا، پاکستان کا معرض وجود میں آنا، پھر ایک ایسے ہی معجزے کے طور پر اسلامی ریاست بننا، یہ سب مستقبل کی اسلامی ریاست کی زندگی اور ترقی کے اسباب ہیں اور اس سلسلے کی اگلی کڑی فلسفہ خودی کو پاکستان میں سرکاری ترجمانی کے لیے کام میں لانا ہے اور پھر وہ کڑیاں جن کا ذکر میں نے مختصراً اپنے اس مقالے میں کیا ہے اور جو پاکستان کو زمین کے کناروں تک پھیلا دیں گی، اس کے بعد آئیں گی۔‘‘

ڈاکٹر رفیع الدین نے اس مقالہ میں اس خیال کو بڑے ہی پرجوش اُسلوب اور نہایت زوردار الفاظ میں بار بار دہرایا ہے کہ پاکستان میں اسلام کی سرکاری ترجمانی علامہ اقبالؒ کے فلسفہ خودی سے کی جائے۔ ان کا خیال ہے کہ قدرت نے علامہ اقبال جیسی نابغہ روزگار شخصیت کو اپنے خاص مقصد کو پورا کرنے کے لیے پیدا کیا تھا۔ اسلام کے اسرار و رموز جس طرح علامہ اقبال پر منکشف ہوئے' کسی اور پر نہیں ہوئے۔ دورِ حاضر کی جدید ریاست میں اسلام کے تقاضے فکر اقبال ہی سے پورے کیے جا سکتے ہیں اور فکر اقبال ہی کی بنیاد پر بالآخر ایک ورلڈ سٹیٹ معرضِ وجود میں آئے گی۔ ان کی دلیل یہ تھی:

’’اقبال کے علاوہ دوسرے تمام فلسفیوں کے فلسفے اسلام کے ارتقاء کے وہ مراحل ہیں جو گزر چکے ہیں۔ اقبال کا فلسفہ ان تمام مراحل سے آگے کا ہے جو گزشتہ مراحل کے تمام حاصلات کو اپنے اندر جمع کرتا ہے لیکن اب گزشتہ مرحلوں میں سے کوئی مرحلہ اس کو ہٹا کر اس کی جگہ نہیں لے سکتا کیونکہ ان کا کوئی فلسفہ ایسا نہیں جو اپنے اندورنی استدلال کو وسعت دے کر ایک جدید انسانی اور اجتماعی فلسفہ بن سکے اور آئندہ عالمگیر ریاست کو اپنے سیاسی یا اقتصادی یا اخلاقی یا تعلیمی یا قانونی یا معاشرتی یا اطلاعاتی نظام کے لیے قابل فہم تصورات بہم پہنچا سکے۔ یہ نکتہ نہایت ہی اہم ہے اور جس قدر جلد ہم اس پر حاوی ہو جائیں اتنا ہی ہمارے لیے اچھا ہوگا۔‘‘

''پھر کیوں نہ اس مسلمان فلسفی کو نوعِ بشر کا آخری فلسفی اور آئندہ کے عالمگیر ذہنی انقلاب کا بانی قرار دیا جائے۔ شاید اس سلسلے میں شاہ ولی اللہؒ اور محی الدین ابن عربیؒ جیسے اکابر اسلام کا نام لیا جائے۔ لیکن اس زمانے کے خاص ذہنی حالات اور خاص علمی ماحول اور مقام کی بنا پر اقبال کے فلسفہ خودی کو جو خصوصیات حاصل ہوئی ہیں وہ آج سے پہلے نہ کسی مسلمان کے فلسفہ کو حاصل ہو سکتی تھیں اور نہ ہو سکی ہیں۔''

فکر اقبال کی ان خصوصیات کی بنا پر ڈاکٹر رفیع الدین نے علامہ اقبال سے اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو اقبالیات کا کوئی سکالر یا کوئی عاشقِ اقبال نہ سوچ پایا نہ زبان پر لا سکا، فرماتے ہیں:

''وہ خاتم الانبیاء ﷺ جنہوں نے نوعِ انسانی کو حقیقت کائنات کا کامل تصور عطا کیا، جناب محمد مصطفےٰ ﷺ تھے اور وہ فلسفی جس نے علمی حقائق کی ترقیوں کے اس دور میں سب سے پہلے اپنے فلسفے کی بنیاد نبوتِ کاملہ کے عطا کیے ہوئے تصورِ حقیقت پر رکھی، اقبالؒ ہے اور وہ فلسفہ جو اس دور کے علمی حقائق کو نبوت کے عطا کیے ہوئے کامل تصورِ حقیقت کی بنیادوں پر منظّم کرتا ہے، فلسفہ خودی ہے۔''

غرض ڈاکٹر رفیع الدین اپنی تصانیف میں فکر اقبال کی خصوصیات گن گن کر ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ پاکستان میں نفاذِ اسلام کی وہی کوشش کامیاب ہوگی جس کی بنیاد فکر اقبال پر قائم ہوگی۔ کیونکہ اسلام کی یہی تعبیر دورِ حاضر میں قابل عمل ہے بلکہ اس تعبیر میں یہ استعداد ہے کہ وہ مستقبل کی عالمگیر ریاست کی فکری اساس کا کام دے سکے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اقبال آئندہ کے اس عالمگیر ذہنی انقلاب کا نقیب ہے جس کے بعد کوئی اور ذہنی انقلاب نہیں آسکے گا۔ لہٰذا اقبال آئندہ کی مستقل عالمگیر ریاست کا وہ ذہنی اور نظریاتی بادشاہ ہے جس کی بادشاہت کو زوال نہیں۔''

یہ احساس علامہ اقبال کو خود بھی تھا کہ ان کی فکر کا سرچشمہ الہامی ہے اور ملت اسلامیہ کی رہنمائی کے لیے قدرت نے انہیں بطور خاص منتخب کیا ہے۔ ان کے کئی اشعار اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں انہوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ دورِ حاضر میں

اسلام کے محرمِ اسرار اور دانائے راز وہی ہیں۔

سر عیش جاوداں خواہی بیا
ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا
پیر گردوں بامن ایں اسرار گفت
از ندیماں راز ہا نتواں نہفت
ہیچ کس رازے کہ من گفتم نگفت
ہمچو فکر من در معنی نہ سفت

☆☆

دو عالم را تواں دیدن بمینائے کہ من دارم
کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم

علامہ اقبال کو یقین تھا کہ دورِ حاضر کی سیکولرزم کی تاریکیوں میں بھٹکتی ہوئی انسانیت ان کے افکار سے روشنی حاصل کرے گی اور اس روشنی کی مدد سے اپنی راہ تلاش کرے گی۔

بہ آں آب و تابے کہ فطرت بہ بخشد
درخشم چو برقے بہ ابر سیاہے
مخور ناداں غم از تاریکی شب ہا کہ من دارم
کہ چوں انجم درخشد داغ سیمائے کہ من دارم

ایک بار علامہ اقبال نے بیماری کی شدت میں اپنی زندگی کے بارے میں خطرہ محسوس کیا تو ملت اسلامیہ کے مستقبل کے بارے میں اندیشہ ہائے دور دراز سے بے قرار ہو کر فرمایا:

دہ مرا فرصت ہو حق دوسہ روزے دگرے
کہ دریں دیر کہن بندہ اسرار کجاست
اندریں عصر کہ لا گفت من اِلا گفتم
اس چنیں دیدہ رہ بیں بہ شب تار کجاست
حرفے ناگفتہ مجال نفسے می خواہد
ورنہ ما را بہ جہان تو سروکار کجاست

اور اپنے انتقال سے تھوڑی دیر پہلے جو اشعار بے اختیار آپ کی زبان پر آئے ان میں بھی اپنی موت کے بعد ملت اسلامیہ کی فکری رہنمائی کے بارے میں فکر مندی کا بے ساختہ اظہار ہے:

سرودے رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

ان کے یہ احساسات بلاشبہ مبنی بر حقیقت تھے جن کی شہادت دنیا بھر کے اسلامی سکالر آج بھی دے رہے ہیں۔ضیاء الدین سردار اپنی کتاب ''اسلامی مستقبلیات (ISLAMIC FUTURES) میں لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال کی کتاب '' ری کنسٹرکشن آف ریلیجیس تھاٹ اِن اسلام'' اور ڈاکٹر رفیع الدین کی تصنیف '' آئیڈیا لوجی آف دی فیوچر'' اسلامی علم وحکمت کے دو ایسے کارنامے ہیں جن سے سب سے زیادہ اغماض برتا گیا ہے۔دونوں اپنے وقت سے برسوں آگے تھے۔انہوں نے یہ کتابیں ایسی لکھی ہیں جو مسلمانوں کے مستقبل کی تعمیر میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتی ہیں۔اس لٹریچر کی تخلیق کی تحریک الغزالی کی احیاء العلوم الدین سے ہوئی، جو گیارہویں صدی کی تصنیف ہے اور جس کے ذریعے الغزالی نے اپنی بصیرت کے ذریعے مسلم تہذیب کی تعمیر نو کے لیے اسلام کی اصل روحانی اور اخلاقی اقدار کا احیاء کرنا چاہا''۔

''الغزالی کی زندگی اور ان کے عہد میں مسلم تہذیب اپنے داخلی مسائل میں الجھی ہونے کے باوجود دنیا کی ایک غالب تہذیب تھی۔لہٰذا الغزالی کے لیے' روحانی اور سماجی معاملات پر توجہ دینا ایک قدرتی اَمر تھا لیکن علامہ اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین کو ایسے دور کے مسلمانوں کے لیے لکھا پڑا جن کا معاشرہ اپنی اساس سے ہی محروم ہو چکا تھا اور مسلمان ایسے اجنبی سیاسی ڈھانچوں' معاشرتی نظاموں، ثقافتی ماحولوں اور پیداواری طریقوں کی صورت احوال میں زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے جن کی اسلامی

تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ اس اعتبار سے ان کا کام کہیں زیادہ مشکل تھا۔“

ضیاء الدین سردار نے ڈاکٹر رفیع الدین کو ان کی کتاب کے حوالے سے ایک الگ حیثیت دی ہے اور ایک جرمن سکالر وارن سٹین کرس (warren steincruss) نے بھی ان کے فلسفے کو داعیہ الی العین (Urge for Ideals) کا نام دے کر ایک الگ اور مستقل فلسفہ شمار کیا ہے۔ اقبالیات کے ایک ممتاز سکالر عبدالحمید کمالی بھی ان کے فلسفہ داعیہ الی العین کو ایک الگ اور اپنی جگہ پر مستقل حیثیت دیتے ہیں لیکن خود ڈاکٹر رفیع الدین نے کہیں بھی اپنے فلسفے کو ایک الگ، مستقل طبع زاد فلسفہ کی حیثیت سے پیش نہیں کیا۔ وہ اپنی پوری فکر کو فیضانِ اقبال قرار دینے پر مصر ہیں اور اپنی تحریروں میں جا بجا واشگاف الفاظ میں برملا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی تمام کتابیں فلسفہ خودی کی تشریح اور توسیع کے لیے وقف ہیں۔

عالمگیر سطح پر بھی یہ احساس پایا جاتا ہے کہ علامہ اقبال کی موت سے پیدا ہونے والا خلا آج تک پورا نہیں ہوا۔ فلسطینی نژاد امریکی اسلامی سکالر ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی شہید کس حسرت بھرے لہجے میں فرماتے ہیں:

> ”پاکستان کے روحانی بانی محمد اقبال کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے عصر حاضر میں یہ دعویٰ کیا کہ سیاسی عمل اسلام کی روحانیت ہے اور ان کے اس قول کو پوری دنیا کے مسلمانوں نے تسلیم کیا بلکہ فخر کے ساتھ اسے دہراتے رہتے ہیں لیکن اقبال ہی کے پائے کی کسی دوسری شخصیت کے لیے وہ جگہ ابھی خالی پڑی ہے جو یہ اعلان بھی کرے کہ معاشی عمل اسلام کی روحانیت ہے تاکہ دنیا اسے باور کرے اور اس کی صداقت پر اسی طرح سے یقین کرے جیسا وہ علامہ اقبال کے قول میں رکھتی ہے۔“

معلوم نہیں ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی شہید کے علم میں کیوں یہ بات نہیں آئی کہ معاشی عمل کی روحانی ماہیت کے بارے میں بھی علامہ اقبال نے پوری تحدی کے ساتھ اعلان کیا تھا

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتہ شرع مبیں ایں است و بس

البتہ یہ ضرور ہے کہ جہاں علامہ اقبال کا یہ قول کہ ”سیاست اسلام میں روحانیت ہی کی

ایک شکل ہے'' دنیا کے جغرافیہ پر پاکستان کی شکل میں ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر معرض وجود میں آ چکا ہے' وہاں اسلامی نظام معیشت تا حال دنیا کے کسی بھی ملک میں حقیقت کا روپ نہیں دھار سکا بلکہ پاکستان میں بھی' جس کے روحانی بانی علامہ اقبال ہیں' یہ ایک ایسی حقیقت منتظر ہے جو ابھی عملی شکل اختیار نہیں کر سکی اور بدقسمتی یہ ہے کہ نفاذ شریعت کے علمبردار اس سلسلے میں ابھی تک یہ بھی نہیں بتا سکے کہ اسلامی معاشی نظام کی عملی صورت کیا ہے اور یہ نظام کیونکر نافذ ہوگا۔

ڈاکٹر رفیع الدین کو یقین تھا اور وہ اس بات کا بتکرار اعادہ کرنے سے نہ کبھی تھکے اور نہ اُکتائے کہ پاکستان میں جب بھی اسلام نافذ ہوگا' علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کی بنیاد پر ہوگا' وہ کہتے ہیں:

> ''پاکستان کا قیام درحقیقت کفر کی طاقتوں کے خلاف اسلام کا ردّعمل ہے اور اسلام کا وہی ردّعمل جس نے ایک طرف فلسفہ خودی کو پیدا کیا ہے اسی نے دوسری طرف ایک ریاست کو بھی پیدا کیا ہے جسے فلسفہ خودی اپنے مقصد کے لیے کام میں لاسکتا ہے۔ پاکستان کا تصور بھی اسی اقبال کی ایجاد ہے جو فلسفہ خودی کا موجد تھا۔ دونوں کے ظہور کے وقت کا ٹھیک ٹھیک تطابق اتفاقی نہیں بلکہ اس کے تحت قدرت کی یہ خواہش کام کر رہی ہے کہ کامل نظام افکار کو (عملی شکل دے کر) اور اس کی معرفت تمام دنیا کے باطل فلسفوں سے نجات دلا کر دنیا کے ارتقاء کا راستہ ہموار کیا جائے۔ پس قدرت پاکستان اور فلسفہ خودی دونوں کو ہم رکاب کر کے اپنے مقصد کو پورا کرے گی۔''

پاکستان قائم ہوئے نصف صدی ہونے کو آ رہی ہے لیکن پاکستان اور فلسفہ خودی کی ہم رکابی عمل میں نہیں آ سکی۔ اس پورے عرصے میں اسلام کی سرکاری اور غیر سرکاری تشریح ''جمہوریت'' اور ''سوشلزم'' کے رائج الوقت نظریات سے کی جاتی رہی ہے۔ ہمارے جید علماء کرام بھی ان نظریات کے دام فریب میں آنے سے نہیں بچ سکے۔ اسلامی جمہوریت اور اسلامی سوشلزم کی مرکب اصطلاحیں ایجاد کی گئیں۔ اسلامی جمہوریت کو ہر کسی نے اپنا لیا اور کہا یہ جاتا رہا کہ جمہوریت کی اصطلاح سے فقط شخصی آزادی اور انسانی حقوق کا مفہوم مراد ہے لیکن کسی نے نہ سوچا کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے نفسیاتی تناظر میں شخصی آزادی اور انسانی حقوق کے

تصورات، سیکولر جمہوریت میں شخصی آزادی اور انسانی حقوق کے تصورات سے یکسر مختلف ہوتے ہیں اور متضاد نظریات اور تصورات کی پیوندکاری سے سوائے کنفیوژن کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسلامی جمہوریت کی اصطلاح میں اسلام پر زور دینے کے لیے اسلام کے لفظ کو خواہ سابقہ کے طور پر استعمال کیا جائے، یا لاحقہ کے طور پر، لفظ جمہوریت کے مفہوم میں وہی نظریہ غالب رہے گا جو عملاً دنیا میں کارفرما ہے۔ عصر حاضر میں اسلام ایک عالمی طاقت نہیں ہے اس لیے شاہراہ جمہوریت سے نکلی ہوئی اسلامی جمہوریت کی پگڈنڈی پر سفر کرتے کرتے جمہوری اسلام تک پہنچتے دیر نہیں لگتی اور جمہوری اسلام کے تناظر میں نفاذ اسلام کی جو صورت پیدا ہوتی ہے اس میں اسلام کی حیثیت مردہ بدست زندہ سے زیادہ نہیں ہوتی اور جمہوری اسلام کے پیدا کردہ اس الجھاؤ میں لوگوں کے سامنے بار بار یہ سوال سامنے آتا رہتا ہے کہ کون سا اسلام؟ ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی کتاب ''استحکامِ پاکستان'' میں یہی سوال اٹھایا ہے اور خود ہی اس کا جواب بھی دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''اسلام کی صرف وہی تعبیر مؤثر اور کارگر ہوگی جو صدیوں کے تعامل اور روایت کی بنا پر مسلمانوں کے اجتماعی شعور کا جزو لاینفک بن چکی ہے اور جسے ان علماء کرام کی تائید حاصل ہے جن پر دین اور مذہب کے معاملے میں مسلمان اکثریت اعتماد کرتی ہے۔''

نفاذِ اسلام کے سلسلے میں یہ جمہوریت نواز سوچ جو ''دین اور مذہب کے معاملے میں مسلمانوں کی اکثریت کے اعتماد'' (اجماع؟) کے اصول پر قائم ہے ایک اور الجھاؤ میں مبتلا کرتی ہے: کون سے علماء؟ علماء اور صوفیاء کے مختلف سلسلے ہیں اور انہی سلاسل کی بنیاد پر مسلمان مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہر فرقہ کے مسلمانوں پر اپنے اپنے علماء اور صوفیاء کا ہی سکہ چلتا ہے اور ہر فرقہ انہی عقائد و نظریات اور رسوم و ظواہر کو ایمان اور اسلام کا درجہ دیتا ہے جو بقول ڈاکٹر اسرار احمد ''صدیوں کے تعامل اور روایت کی بنا پر ان کے اجتماعی شعور کا جزو لاینفک بن چکا ہے۔'' اور موجودہ صورت حال میں تعبیر اسلام کی بوقلمونی کو جو نقشہ سامنے نظر آتا ہے کیا اس میں نفاذ اسلام کی کسی واضح منزل کی نشاندہی کی جاسکتی ہے؟

صدر ضیاء الحق مرحوم نے نفاذِ اسلام کے سلسلے میں علماء اور مشائخ سے کام لینے کی کوشش کی اور جو تھوڑی بہت اور بری بھلی پیش رفت ان کے عہد میں ہوئی اس کے حق میں یا مخالفت میں

بہت کچھ کہا جا تا رہا ہے لیکن عملاً یہ نتیجہ نکلا کہ ہر فقہی مکتب فکر نے اپنی اپنی فقہ نافذ کروانے کے لیے زور لگایا اور فقہی اکثریت اور فقہی اقلیت کا سوال اٹھ کھڑا ہوا۔ فرقہ بند علماء جوق در جوق میدان سیاست میں آنے لگے اور فرقوں کے نام پر کئی سیاسی جماعتیں معرضِ وجود میں آ گئیں۔ فرقہ وارانہ عصبیتوں نے وہ زور پکڑا کہ کئی علمائے دین قتل ہو چکے ہیں اور فرقہ واریت کا فتنہ روز افزوں ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ علماء ہمارے دین کے بنیادی ماخذ کے وارث اور محافظ ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں، جو بہار ہو کہ خزاں، قال اللہ اور قال رسول اللہ کا نغمہ الاپتے رہتے ہیں۔ قرآن اور حدیث کے علوم کی انہوں نے بڑی جانفشانی کے ساتھ پہرہ داری کی ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے جابر سلاطین کے سامنے کلمہ حق کہا، قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں اور اپنے اپنے وقت میں عقائد و نظریات کی اصلاح اور غیر اسلامی رسوم و ظواہر کی بیخ کنی کرتے ہوئے اپنی جانیں تک قربان کر دیں اور انہی لوگوں کی جانفشانیوں اور قربانیوں کی بدولت ہر زمانے میں اسلام کی سج دھج قائم اور شان سلامت رہی۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے ان میں سے کتنے علماء تھے جن پر لوگوں کی اکثریت نے اعتماد کیا؟ علماء حقہ ہمیشہ اقلیت میں رہے ہیں اور اپنے اپنے زمانے میں انہیں اکثریت کا اعتمام بھی کبھی حاصل نہیں رہا۔

علامہ اقبال مستند علماء کا بہت احترام کرتے تھے اور اپنی زندگی میں بھی ان علماء سے رہنمائی حاصل کرتے تھے، چنانچہ علامہ انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے علمی مسائل میں آپ نے ہمیشہ رجوع کیا۔ لیکن علماء کی عظیم اکثریت سے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ نالاں رہے اور ان سے کسی خیر کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ لوگ لغت ہائے حجازی کے قارون تو ہیں مگر رمز دیں سے آشنا نہیں ہیں۔ ان کی تاویلات آیات قرآن سے خدا اور جبرئیل اور مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم حیرت میں پڑ گئے ہیں۔ حکمت قرآن سے حیات بخشی کا سامان کرنے کی بجائے ''آسان بمیری'' کا کام لیتے ہیں، نہ دین کے منشاء سے واقف اور نہ عصر حاضر کے حقائق اور تقاضوں سے باخبر! ایسے علماء و فقہاء کے لے علامہ اقبال ''ملا'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور ان سے کلی طور پر مایوس، ناامید اور بیزار ہیں۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور مورخہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر فرمایا:

”آپ کے دین کا اعلیٰ تخیل علماء اور فقہاء کی دقیانوسیوں سے رہائی کا خواہاں ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم تخیلات اور جذبات کے ایک ایسے قید خانے میں محصور زندگی بسر کر رہے ہیں جنہیں گزشتہ صدیوں سے ہم نے اپنے اردگرد بن رکھا ہے۔ یہاں مجھے یہ بھی کہنے دیجیے کہ ہم پرانی نسل کے لوگوں کے لیے کتنی شرم کی بات ہے کہ ہم اپنی نئی نسل کو ان اقتصادی سیاسی اور مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں کر سکے جو انہیں عصرِ رواں میں پیش آنے والے ہیں۔“

اس طرح روشن ضمیر پاک باطن صوفیاء کے ساتھ اپنی پوری عقیدت مندی کے باوجود ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:

”اب اسلام قرونِ وسطیٰ کے اس تصوف کی تجدید کو روا نہ رکھے گا جس نے اس کے پیروکاروں کے صحیح رجحانات کو کچل کر ایک مبہم تفکر کی طرف ان کا رُخ پھیر دیا تھا۔ اس تصوف نے گزشتہ کئی صدیوں میں مسلمانوں کے بہترین دماغوں کو اپنے اندر جذب کر کے سلطنت کے کاروبار کو معمولی آدمیوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا تھا۔ جدید تفکر اس تجربہ کو نہیں دہرا سکتا۔ اب کوئی صوفی یا پیغمبر بھی مسلمانوں کو قرونِ وسطیٰ کے دھندلکوں کی طرف نہیں لے جا سکتا۔“

ایسے سخت کلمات صرف علامہ اقبال ایسا مردِ قلندر ہی کہنے کی جرات کر سکتا ہے جو ”میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند“ قسم کے لوگوں کی جمہوری مصلحتوں سے بے نیاز ہو کر قوم کے سادہ لوح عوام کو ”اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری“ کے الفاظ میں خطاب کرنے کی جرات رکھتا ہو۔

ڈاکٹر رفیع الدین جن کے نزدیک صرف فلسفہ خودی ہی اس زمانے میں اسلام کی صحیح تعبیر ہے۔ علماء کو دو طبقوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ فلسفہ خودی ارتقاء کے راستے کی ایک ناگزیر منزل ہے اور انسانی فطرت مجبور ہے کہ وہ فلسفہ خودی کی راہ سے ہو کر گزرے۔ وہ اسے دائیں یا بائیں چھوڑ کر قطعاً آگے نہیں بڑھ سکتی لہٰذا صرف وہی علماء نفاذِ اسلام کے اہل ہیں جو فلسفہ خودی کو سرکاری نظریہ قرار دینے کے حق میں ہیں چنانچہ وہ علماء جو فلسفہ خودی کو اسلام کی صحیح تعبیر نہیں انہیں مسترد کر دینا چاہیے۔

علامہ کے فلسفہ خودی کے ہمنوا علماء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نام سرفہرست شمار کیا جاسکتا ہے کیونکہ ایک طرف تو خود مولانا مودودی نے اپنی ایک تحریر میں علامہ اقبال کے لیے ''میرا روحانی سہارا'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور دوسری طرف علامہ اقبال بھی اس نوجوان کی شکل میں ایک اُبھرتی ہوئی علمی شخصیت کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتے تھے۔ میاں محمد شفیع کے بقول علامہ اقبال نے مولانا مودودی کے متعلق فرمایا تھا: ''یہ وہ شخص ہے جو نیشنلسٹ علماء کی خبر لے گا۔'' رحیم بخش شاہین کی تحقیق کے مطابق علامہ اقبال نے مولانا مودودی کو پنجاب منتقل ہونے کی دعوت اس لیے دی تھی کہ انہیں فقہ اسلامی کی تدوین نو پر اپنی مجوزہ کتاب لکھنے میں مولانا مودودی ایسے ''صاحب قلم عالم'' کی ضرورت تھی۔ ان دونوں حضرات کا یہ کہنا ہے کہ علامہ اقبال کی تحریک پر ہی مولانا مودودی حیدر آباد دکن چھوڑ کر پنجاب منتقل ہوئے لیکن دارالاسلام کے بانی چودھری نیاز علی خاں مرحوم کے فرزند کے ایم اعظم اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ مولانا مودودی علامہ اقبال کی تحریک پر دارالاسلام آئے۔ وہ اپنے والد کے بیان کی سند پر یہ کہتے ہیں کہ ادارہ دارالاسلام کی سربراہی کے لیے مولانا مودودی کا نام مولانا اشرف علی تھانوی نے تجویز کیا تھا۔

حیدر آباد دکن سے مولانا مودودی کے دارالاسلام منتقل ہونے کی وجہ کچھ بھی ہو، یہ تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں کہ علامہ اقبال اس نوجوان صاحب قلم کے نام سے واقف تھے اور اس کی راست فکری اور صلاحیت تحریر کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔ نیز یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ وطنی قومیت کے خلاف علامہ اقبال کے جہاد میں مولانا مودودی نے ان کا پورا پورا ساتھ دیا اور دیگر ہم عصر علماء کے مقابلے میں تصور دین کی جامعیت کے اعتبار سے بھی وہ علامہ اقبال سے زیادہ قریب تھے۔

مولانا مودودی ۱۹۳۸ء میں پہلی بار دارالاسلام پٹھان کوٹ آئے اور اسی سال علامہ اقبال کا انتقال ہوگیا تھا۔ مولانا مودودی ۱۹۳۹ء میں لاہور تشریف لائے اور اس کے بعد ۱۹۴۱ء میں دوبارہ دارالاسلام گئے۔ اسی دوران جماعت اسلامی قائم ہوئی جس کے مولانا مودودی امیر مقرر ہوئے اور دارالاسلام اس کا ہیڈ کوارٹر قرار پایا۔ قیام پاکستان تک مولانا مودودی وہیں قیام پذیر رہے اور اس دوران اقامت دین کی تحریکی ضروریات کے تحت عام لوگوں کو دعوت دین دینے

اور جماعت اسلامی کے کارکنوں کی تربیت کے لیے مولانا مودودی نے جو لٹریچر لکھا اس میں ایک ''غالب وکارآفریں'' اور ''کارکشا وکارساز'' مردمومن کا حرکی تصور اُبھرتا ہے۔اس اعتبار سے ان کا سارا لٹریچر علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کی ایک عام فہم تشریح ہے۔اپریل ۱۹۷۰ء میں یوم اقبال کے موقع پر جو یونیورسٹی ہال لاہور میں منعقد ہوا اس میں مولانا مودودی نے خود بھی برملا اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ جن دینی حقائق کی وضاحت کے لیے انہوں نے کتابیں لکھیں، علامہ اقبال نے وہ حقائق ایک ایک شعر میں بلکہ ایک ایک مصرع میں بیان کر دیے ہیں۔اور اپنی اس بات کے ثبوت میں مثالوں کے طور پر آپ نے ''عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد'' اور ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی'' کے حوالے دیے۔افکار ونظریات کی اسی گہری مماثلت اور ہم آہنگی اور اپنی زندگی میں مردمومن کا ایک عملی نمونہ پیش کرنے کی بنیاد پر اقبالیات کے ایک ممتاز سکالر بشیر احمد ڈار نے اپنی کتاب A Study in Iqbal,s Philosophy کا انتساب مولانا مودودی کے نام کر کے مندرجہ ذیل دو اشعار ان کی نذر کیے:

روح اقبال از برائش او تپید
آخر آں دانائے راز آمد پدید
چشم حق بیں اندریں عصر جدید
ہمسر سید ابوالاعلیٰ ندید

بایں ہمہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تصورِ دین کے معاملے میں فکری ہم آہنگی کے باوجود اسلامی سیاسی نصب العین کی جدوجہد میں انہوں نے ایک دوسرے سے یکسر مختلف اور بالکل متضاد حکمت عملی اختیار کی۔وطنی قومیت کے خلاف فکری جہاد میں تو مولانا مودودی نے علامہ اقبال کا ساتھ دیا لیکن نیشنلسٹ علماء کی وطنی قومیت کے ساتھ ساتھ مولانا مودودی نے مسلم لیگ کی مسلم قومیت کو بھی اپنی شدید تنقید کا نشانہ بنایا، مسلم لیگ اور پاکستان کی کھلم کھلا مخالفت کی اور کہا:

''بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی، مسلمانوں کا قومی سٹیٹ قائم ہو جائے تو پھر رفتہ رفتہ تعلیم وتربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے اس کو اسلامی سٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔مگر میں نے تاریخ،

سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر اس کو ناممکن سمجھتا ہوں اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو اسے معجزہ سمجھوں گا۔‘‘

بلکہ ان کا خیال تھا کہ ایک مسلم قومی حکومت میں نفاذ اسلام کے سلسلے میں کہیں زیادہ مشکلات پیش آئیں گی۔ آپ نے فرمایا:

’’قومی حکومت جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوگا، اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری اور بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزائیں دیتی ہے، وہ مسلم قومی حکومت ان کی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دے گی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے کے بعد رحمۃ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔‘‘

چنانچہ تحریک پاکستان کے عین عروج کے زمانے میں بھی انہوں نے اسے ایک بری علامت اور عظیم خطرہ قرار دیتے ہوئے یہ لکھا:

’’ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے اس وقت دو قسم کی دعوتیں ہیں۔ ایک طرف ہماری یہ دعوت ہے جو مسلمانوں کو ٹھیک اس کام کے لیے بلا رہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مسلم جماعت کی تاسیس و تشکیل کی واحد غرض قرار دیا ہے۔ اور دوسری طرف وہ دعوتیں ہیں جن کے پیش نظر مسلمانوں کے دنیوی مفاد کی خدمت کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان دو متقابل پکاروں میں سے دوسری پکار کی طرف مسلمانون کا فوج در فوج لپکنا اور پہلی پکار کو اُمت کی عظیم اکثریت کا بہرے کانوں سننا اور اکابر امت اور علماء و مشائخ کا اس کی طرف سے بے اعتنائی برتنا یا اس کی کھلی یا چھپی مخالفت پر اُتر آنا اور ایک قلیل گروہ اس کی طرف بڑھنا بھی رکتے، جھجکتے اور پس و پیش کرتے ہوئے بڑھنا میرے نزدیک ایک بہت بری علامت اور عظیم خطرہ ہے۔‘‘

اس کے برعکس علامہ اقبال جب تک زندہ رہے انہوں نے اپنی سیاسی امیدیں مسلم لیگ سے ہی وابستہ رکھیں اور کبھی ایسے شکوک و شبہات میں مبتلا نہ ہوئے جو مولانا مودودی کو لاحق ہو گئے تھے۔ چنانچہ مولانا مودودی جماعت اسلامی کے نام سے متقین و صالحین کی ایک

نظریاتی انقلابی جماعت کی تیاریوں میں مصروف رہے اور رفتارِ زمانہ انہیں پیچھے چھوڑ گئی۔ مسلم لیگ کی جدوجہد کے نتیجے میں پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا اور مولانا مودودی کو دارالاسلام پٹھان کوٹ چھوڑنا پڑا۔ پاکستان آنے کے بعد انہیں اپنی حکمتِ عملی تبدیل کر کے حقیقت پسندی کی طرف آنا پڑا اور ارکین جماعت اسلامی کے لیے جس قسم کی سیرت سازی پر وہ زور دیتے رہے تھے اس کا تقاضا تھا کہ سیاست کی عملی تربیت بھی انہیں دی جاتی جو میدانِ سیاست میں عملاً داخل ہوئے بغیر ممکن نہیں تھی۔ چنانچہ انتخابات حصہ لینے کا فیصلہ کیا گیا اور نظامِ اسلامی کا مطالبہ میں اب یہ موقف اختیار کیا گیا کہ

''یہ ایک عجیب اور نرالی بات ہوگی کہ کسی قوم کا ایک ایک فرد تو اپنی جگہ مسلم ہو، لیکن جب وہ مل کر ایک سٹیٹ بنالیں تو وہ ایک غیر مسلم سٹیٹ ہو۔''

یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ ''غیر مسلم سٹیٹ'' کے الفاظ ''غیر اسلامی سٹیٹ'' ہی کے معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں اور یہ اپیل بھی مسلم قوم پرستوں ہی کے نام تھی۔ گویا بالواسطہ طور پر اس حقیقت کا اعتراف کر لیا گیا کہ مسلمانوں کے قومی سٹیٹ کے اسلامی سٹیٹ میں تبدیل ہونے کے سلسلے میں جس قسم کی مشکلات کا خطرہ مولانا مودودی بیان کرتے رہے وہ انتہا پسندی کا نتیجہ تھا اور علامہ اقبال کی حکمتِ عملی ہی صحیح تھی۔ اگر مولانا مودودی پاکستان اور مسلم لیگ کی مخالفت کی روش نہ اپناتے اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح مسلم لیگ کا ساتھ دیتے تو شاید پاکستان میں اقامتِ دین کا کام مولانا مودودی کے لیے کہیں زیادہ آسان ہوتا کیونکہ انہیں مسلم لیگ کی طرف سے اس مخالفت کا سامنا نہ کرنا پڑتا جو مسلم لیگ کے خلاف ان کی اپنی ہی پیدا کردہ مغائرت کے ردِّعمل کے طور پر سامنے آیا۔

سیاسی میدان میں جماعت اسلامی کو اتارنے کے بعد مولانا مودودی کے وہ رفقائے کار جو اپنی عینیت پسندی (Idealsim) چھوڑنے کو تیار نہیں تھے، شکوک وشبہات میں مبتلا ہو گئے جس کا نتیجہ انتشارِ قیادت کی صورت میں رونما ہوا۔ ۱۹۵۷ء میں بعض اہم شخصیات جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو گئیں جن میں مولانا امین احسن اصلاحی کی شخصیت سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ ان میں سے کچھ لوگ جماعت اسلامی کی کمزوریوں، خامیوں اور خرابیوں کا تجزیہ کرتے رہے اور ''اقامت

دین'' کے لیے متبادل تنظیم قائم کرنے کے بارے میں سوچا جاتا رہا چنانچہ ۸،۹ستمبر ۱۹۶۷ء کو تنظیم اسلامی کے نام سے رحیم یار خاں میں ایک جماعت قائم کرنے کا منصوبہ بھی تیار ہوا۔ مولانا امین اصلاحی نے شروع میں اس منصوبے میں کچھ دلچسپی بھی لی لیکن بعد میں شمولیت کا ارادہ ترک کر دیا اور اس کے بعد بھی کوئی الگ دینی سیاسی جماعت قائم کرنے سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ اس قسم کی جماعت سازی اب ان کے نزیک ایک فتنہ اور تفریق ملت اور کفر کے مترادف ہے۔ اب وہ یہ فرماتے ہیں کہ جماعت اسلامی میں بھی درحقیقت وہ ''اپنی خواہش اور ارادے سے شامل نہیں ہوئے تھے بلکہ کر لیے گئے تھے'' ایک انٹرویو میں بعض احادیث کے حوالے سے لزوم جماعت کی فرضیت کے بارے میں جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے دوٹوک الفاظ میں فرمایا:

''الجماعۃ سے مراد امت مسلمہ من حیث الجماعت ہے نہ کہ وہ ٹولیاں جو تفرقہ باز، جاہل پمفلٹ فروش گلی گلی بناتے پھر رہے ہیں۔ اس الجماعۃ سے وابستگی لازمہ ایمان ہے۔ اس سے کٹ کر الگ ٹولی بنانا تفریق ملت اور کفر ہے۔''

دین کے نام پر بننے والی جماعتوں کے بارے میں آپ نے فرمایا:

''جس طرح مذہبی فرقے ملت کے لیے فتنہ ہیں، جس طرح پیروں کی گدیاں فتنہ ہیں، اسی طرح دین کے نام پر بننے والی جماعتیں بھی ملت کے لیے فتنہ ہیں۔ انہوں نے ملت کے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر اپنی دکانیں سجالی ہیں اور ان میں سے کسی کے اندر کوئی خیر نہیں۔''

اقامت دین اور دعوت کا فریضہ ادا کرنے کا صحیح طریقہ وہ یوں بتلاتے ہیں:

''صحیح طریقہ خدمت یہ ہے کہ پوری ملت اپنا مقصود بنائیں اور ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق اپنے آپ کو جس خدمت کا اہل پائے وہ خدمت انجام دے اور کسی پہلو سے اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ وہ کسی اعتبار سے ملت سے ممتاز اور بالاتر فرد ہے اور اس کی جماعت ہی دین کی حامل جماعت ہے۔''

نیز دعوت کے کام میں وہ کسی ایسی سیاسی کشمکش کا حصہ نہیں بننا چاہتے جو حکومت وقت کا جا اور بے جا تنقید کا نشانہ بنائے رکھے۔ وہ فرماتے ہیں:

''ارباب اقتدار کی ہر بات کو ہدفِ تنقید بنالینا، یہاں تک کہ ان کے خیر کو بھی شر قرار دینا اور اس کی مخالفت میں اس حد تک بڑھ جانا کہ دوسروں کی برائیاں بھی اس کے کھاتے میں ڈال دینا نہ عقل و منطق کی رو سے جائز ہے نہ اسلام کی رو سے۔ یہ اقتدار کی ہوس میں اندھے ہو جانے کے مترادف ہے......میں نے دیکھا ہے کہ اس قسم کے لوگ انسانیت اور خلق کی محبت سے عاری ہیں۔ یہ لوگ دل سے اس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ ملک میں زلزلے آئیں، قحط پڑیں، سیلاب آئیں، وبائیں پھیلیں تاکہ ان سب چیزوں کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہرا کر اپنے اقتدار کی راہ ہموار کریں۔''

مولانا امین اصلاحی نے دو نامور شاگرد پیدا کیے: ڈاکٹر اسرار احمد اور جاوید احمد غامدی۔ یہ دونوں حضرات اقامت دین کے لیے جماعت سازی کے سلسلے میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف خیالات و نظریات رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد دعوت، اقامت دین اور شہادت حق کے لیے لزوم جماعت کو فریضہ دین قرار دینے پر مصر ہیں اور لزوم جماعت کو اسلامی انقلابی پارٹی کے معنوں میں ہی لیتے ہیں۔ نفاذ اسلام کے لیے ان کے نزدیک انقلابی طریقہ کار ناگزیر ہے۔ تحریک جماعت اسلامی پر بھی ان کی تحقیقی مطالعہ کا حاصل یہ ہے کہ جماعت اسلامی ابتدا میں ایک انقلابی پارٹی تھی اور عجلت پسندی کی بنا پر اس نے انقلابی طریقہ کار کو چھوڑ کر انتخابی سیاست کا راستہ اپنا لیا اس لیے نفاذ اسلام کے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ چنانچہ وہ جماعت اسلامی کو پکارتے رہتے ہیں کہ اپنے دورِ عینیت پسندی کی طرف لوٹ آئے۔

جماعت اسلامی چھوڑ جانے کے بعد سالہا سال کی تحقیق کے نتیجے میں ڈاکٹر اسرار احمد نے ایک نظریہ ''منہج انقلابِ نبوی'' تشکیل دیا ہے جو ایک شش مرحلہ انقلابی عمل ہے۔ اپنی ایک حالیہ تحریر میں انہوں نے اپنے نظریہ انقلاب کو ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے مترادف قرار دیا ہے اور انقلاب برپا کرنے کے لئے ۱۹۶۷ء میں قائم ہونے والی جماعت ''تنظیم اسلامی'' کو زندہ کیا جس کی رکنیت حاصل کرنے کے لئے سمع و طاعت کی بنیاد پر امیر تنظیم کی شخصی بیعت لازم ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ''تنظیم اسلامی معروف معنوں میں سیاسی جماعت نہیں بلکہ'' اصولی اسلامی انقلابی جماعت ہے جو غلبہ دین کے لئے کوشاں ہے۔''

مولانا جاوید احمد غامدی، ڈاکٹر اسرار احمد کے نظریہ انقلاب سے شدید اختلاف رکھتے ہیں۔ان کی تحقیق کے مطابق ایک مسلمان حکومت کی موجودگی میں سمع اور طاعت کی بنیاد پر کسی شخص کی طرف سے اپنی بیعت کا مطالبہ حکومت وقت سے خروج (بغاوت) کے مترادف ہے۔سمع وطاعت کا حق اللہ، رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اولوالامر کے سوا کسی کو حاصل نہیں اور نہ ہی ایک مسلمان حکومت کے اندر غلبہ دین یا شہادت حق کے نام پر سیاسی مضمرات رکھنے والی کوئی ایسی تنظیم قائم کی جاسکتی ہے۔چنانچہ دعوت کا کام کرنے والوں کے لئے ان کا یہ انتباہ بہت اہم ہے کہ

> ''اس بات پر متنبہ رہیں کہ نہ سیاست کی حریفانہ کشاکش ان کی دعوت کا کوئی لازمی حصہ ہے اور نہ ہی اس زمانے کی اصطلاح انقلابی جد وجہد کو اس کا کوئی لازمی مرحلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ بات تجربے سے ثابت ہوچکی ہے کہ دعوت کی جد وجہد اور سیاسی کشمکش ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہوجائی تو اس کے نتیجے میں نہ سیاست باقی رہتی ہے نہ دعوت۔''

البتہ جماعت اسلامی نے اس ملک کی انتخابی سیاست میں حصہ لینے کے نتیجے میں بالآخر ایک سبق یہ سیکھا کہ عوامی تائید حاصل کئے بغیر نفاذ اسلام ممکن نہیں اور اپنے چھیالیس سالہ سیاسی تجربے کے بعد آخر کار عوامی تائید حاصل کرنے کے لئے اسلامک فرنٹ تشکیل دینے پر مجبور ہوگئی۔خرم مراد کا کہنا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد مولانا مودودی نے تیز رفتار توسیع اور عوامی جدوجہد کے جس مرحلے میں قدم رکھ دیا تھا، اسلامک فرنٹ اس مرحلے کا لازمی تقاضا ہے۔اس بات کی تائید میں وہ مولانا مودودی کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

> ''توسیع کتنی بھی ہوتی چلی جائے، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔استحکام اگر پوری طرح سے نہ ہوسکے تو اس سے بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔توسیع روکنے کی ضرورت نہیں۔توسیع ہونے دیجئے لیکن نیوکلیس مضبوط بناتے چلے جایئے۔''

خرم مراد فرماتے ہیں کہ عددی قوت میں اضافہ اور اس کا اظہار (Show) غیر پسندیدہ اور مذموم چیز نہیں بلکہ عین مطلوب ہیں کیونکہ نص قرآنی کے مطابق نصرت اور فتح کو یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا سے باندھ دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ فوج درفوج آنے والے لوگ تربیت یافتہ

اور معیاری نہیں ہو سکتے۔

لیکن عوامی تائید حاصل کرنے کی اس کوشش کے نتیجے میں جو مایوس کن نتائج حالیہ انتخابات میں سامنے آئے، اس نے جماعت میں ''کوئی کارواں سے ٹوٹا حرم کوئی بدگماں حرم سے سے'' والی کیفیت پیدا کر دی ہے اور اس ملک میں نفاذ اسلام کے سلسلے میں ہنوز روز اول کا معاملہ ہے۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں تحریک نفاذ اسلام کی اس طویل جدوجہد کے جو مایوس کن نتائج حالیہ انتخابات میں سامنے آئے ہیں ان میں تمام دینی سیاسی جماعتوں کی بری طرح ناکامی پوری قوم کے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے اور اس بات کا مقتضی ہے کہ مولانا مودودی کی تحریک نفاذ اسلام کا مطالعہ دقت نظر سے کیا جائے۔ اسے محض سیاسی حکمت عملی کی ناکامی تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ علامہ اقبال اور مولانا مودودی کی فکری قربتوں اور فاصلوں کا قدرے تفصیلی جائزہ لیا جائے۔

جس اصول کو نفاذ اسلام کے سلسلے میں ڈاکٹر رفیع الدین، علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کی ہمنوائی سے تعبیر کرتے ہیں، وہ سیاسی معنوں ''با نشہ درویشی در ساز و دمادم زن...... چوں پختہ خود را بر سلطنت جم زن'' کے پروگرام کے ساتھ عمل پیرا ہونا اور دنیا پر چھا جانا ہے اور ظاہر ہے کہ مولانا مودودی تو داعی ہی اسی قسم کے سیاسی پروگرام کے ہیں، چنانچہ اسی غرض کے لیے انہوں نے جماعت اسلامی تشکیل دی تھی۔ جماعت اسلامی کی تاسیس کے وقت مولانا مودودی کی عمر چھتیس سینتیس برس تھی جبکہ علامہ اقبال قیام جماعت سے دو تین سال پہلے وفات پا چکے تھے۔ یہ ''روحانی سہارا'' چھن جانے کی وجہ سے مولانا مودودی جماعت اسلامی کے ابتدائی زمانے (Formative stage) میں علامہ اقبال کی رہنمائی سے تو محروم رہے البتہ انہیں چند قد آور علماء کی رفاقت اور مشاورت حاصل ہوگئی۔ جن میں مولانا منظور احمد نعمانی، مولانا احسن اصلاحی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مسعود عالم ندوی کے نام قابل ذکر ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ علامہ اقبال بھی اپنے آخری ایام میں خواجہ عبدالوحید کی مدد سے ایک جماعت انجمن شبان المسلمین کے نام سے قائم کرنے کے لیے کوشاں تھے جس کے لیے ڈاکٹر سید ظفر الحسن صدر شعبہ فلسفہ علی گڑھ سے ان کا باقاعدہ رابطہ بھی قائم تھا اور اس ضمن میں رازداری سے کام لیا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر احمد فاروقی فرماتے ہیں کہ علامہ اقبال کا یہ خیال تھا کہ اس انجمن کا امیر

کسی روحانی شخصیت کو بنایا جائے جبکہ بشیر احمد ڈار نے لکھا ہے کہ علامہ اقبال نے تردد کے بعد بالآخر اس جماعت کی امارت قبول کر لی تھی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلم لیگ جیسی ملک گیر سیاسی جماعت کی موجودگی میں علامہ اقبال کے پیش نظر وہ کیا خاص مقاصد تھے کہ انہوں نے اس جماعت کے قیام میں اتنی دلچسپی لی اور اس کے بارے میں اتنی رازداری سے کام لیا جاتا رہا۔ معلومات کی کمی کے پیش نظر اگرچہ وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے لیکن اتنی بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ علامہ اقبال تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اسلامی تربیت کے بارے میں بہت فکر مند تھے جن کے ہاتھوں میں مستقبل کی اسلامی ریاست کی سیاسی اور انتظامی قیادت آنے والی تھی۔ اور اسی مقصد کے پیش نظر انہوں نے چودھری نیاز علی خاں سے بھی ایک ادارہ قائم کرنے کا ذکر کیا تھا جو بعد میں دارالاسلام پٹھانکوٹ کے نام سے قائم کیا گیا اور مولانا مودودی یہاں تشریف لائے۔

علامہ اقبال کا انجمن شبان المسلمین کا منصوبہ تو سرے نہ چڑھا لیکن دارالاسلام پٹھانکوٹ میں جماعت اسلامی قائم ہوگئی اور مولانا مودودی نے دارالاسلام میں اپنے قیام کے دوران ایک اسلامی نظریاتی پارٹی کی دینی تربیت کے لیے جو لٹریچر لکھا وہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اسلامی تربیت کے لیے بھی بے حد مفید ثابت ہوا۔ آج بھی ہماری اعلیٰ تعلیم یافتہ نئی نسل میں جو نوجوان دین سے گہرا شغف رکھتے ہیں ان کی عظیم اکثریت ان لوگوں کی ہے جو مولانا مودودی کی تحریروں سے متاثر ہیں اور یہ لوگ خواہ زندگی کے کسی بھی شعبہ سے وابستہ ہوں اور کسی بھی حیثیت میں کام کر رہے ہوں، دین سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں اور اپنی زندگی میں بالعموم باز مانہ بساز کی بجائے باز مانہ ستیز کا رویہ اپناتے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں کہ شروع شروع میں مولانا مودودی بھی وطنی قومیت کی مخالفت میں مسلم قوم پرستی کی انتہاء تک پہنچ گئے تھے، لیکن مولانا امین احسن اصلاحی کی شدید تنقید کی وجہ سے وہ جلد ہی سنبھل گئے اور جب انہوں نے مسلم قومیت کے نظریہ کو ترک کر کے اسلامی قومیت کے نظریہ کو اپنا لیا تو مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے مابین اتحاد و تعاون کی راہ ہموار ہوگئی اور اسی اسلامی قومیت کی بنیاد پر ہی جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی گئی جس نے تحریک پاکستان

کے دوران نہ مسلم لیگ کا ساتھ دیا اور نہ ہی قیام پاکستان میں کوئی دلچسپی لی۔

ہمارا خیال ہے کہ نفاذِ اسلام یا غلبہ دین کی جدوجہد میں مولانا مودودی نے اپنے مزاج کی بنا پر علامہ اقبال سے اختلاف کی راہ اختیار کی۔ اور اسی اختلاف مزاج کی بنا پر دونوں کی اپروچ (Approch) بھی مختلف تھی۔ مولانا مودودی کے مزاج میں عقلیت پسندی کا غلبہ تھا۔ اسی عقلیت پسندی نے ان کی عام فہم اور خوبصورت اردو نثر کو عقل و استدلال کی قوت فراہم کر کے ایک ایسا سائنٹفک اسلوب بخشا جو موجودہ سائنٹفک دور کے پڑھے لکھے نوجوانوں میں بہت مقبول اور بے حد موثر ثابت ہوا اور اسی سائنٹفک اپروچ نے ہی انہیں روسی کمیونسٹ پارٹی کے متقابل ایک نظریاتی سیاسی پارٹی بنانے پر اُکسایا جس کی بنیاد اسلامی نظریۂ حیات اور اخلاقی انقلاب پر رکھی گئی۔ مسلمان قوم کے بارے میں ان کا پارٹی مؤقف یہ تھا کہ ''کریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں بھی پائے جاتے ہیں'' اور ''سانپوں کی قسمیں گن سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کی قسمیں شمار نہیں کی جاسکتیں۔'' اور دوسری طرف نظریاتی جوش وخروش میں یہاں تک کہا جاتا رہا کہ ہندو، انگریز، سکھ اور پارسی کو بھی اس وقت تک نہ کافر سمجھا جائے اور نہ انہیں کافر قرار دے کران سے اظہار بیزاری کیا جائے تاوقتیکہ فرض تبلیغ اور شہادت علی الناس کی ذمہ داری پوری کر کے ان پر اتمام حجت نہ کر دیا جائے۔

علامہ اقبال نے ایک بلند پایہ فلسفی اور مفکر ہونے کے باوجود اپنے پیغام کے ابلاغ کے لیے شاعری کو اپنایا جس میں جذبہ کا عنصر غالب ہے جو ان کے مزاج سے بڑی مطابقت رکھتا ہے۔ علامہ اقبال کے جذبے کی صداقت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ اقبال کے مشہور لیکچرز ''اسلام کی تشکیل نو'' میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان کو جہاں تہاں تسلیم کرنے میں اکثر علماء کو تامل ہوا ہے لیکن انہی حقائق کو ان کی شاعری میں سن کر یا پڑھ کر بے ساختہ قائل ہوجاتے ہیں، اس طرح جیسے وہ نکتہ اپنے تمام معارف و بصائر کے ساتھ ان پر منکشف ہو گئے ہیں۔ علامہ اقبال چونکہ تاثیر جذبہ کے علمبردار تھے، اسلام کی دلوں کو مسخر کر لینے والی تہذیبی قوت پر بے پناہ اعتماد رکھتے تھے اور دورِ حاضر میں اسلامی تہذیب کے روشن مستقبل کے بارے میں بہت پرامید تھے۔ انہیں محبت کی جہانبانی میں اس قدر پختہ یقین تھا کہ فرماتے ہیں:

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

چنانچہ ''برسلطنت جم زن'' کا جو پروگرام علامہ اقبال کے ہاں ملتا ہے وہ کوئی پارٹی تیار کر کے انقلاب لانے کے بجائے ایسی روحانی شخصیات کی تخلیق سے تعلق رکھتا ہے جو امور مملکت میں مجدد الف ثانی کی طرح حکام وقت میں اثر و نفوذ رکھتے ہوں اور عمال حکومت ان کے مشوروں کو گوش نصیحت نیوش سے سننے پر مجبور ہوں:

باز گیر ایں عامل بد گوہرے
ورنہ بخشم ملک تو با دیگرے

بنا بریں کہا جا سکتا ہے کہ احیائے اسلام کے نقطۂ نظر سے علامہ اقبال کے نزدیک اسلام ایک عالمی کلچرل تحریک (Cultural Movement) ہے جس میں سیاست بھی شامل ہے جبکہ مولانا مودودی اسلام کو ایک نظریاتی تحریک (Ideological Movement) کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جس میں سیاست کا رنگ بہت گہرا ہے۔ اس لیے مولانا مودودی نے جو اسلامی نظریاتی پارٹی تیار کی اس کی پہلی سیاسی جھڑپ مسلم لیگ سے ہوئی جو اسلامی نظریے کے خلاف نظریہ مسلم قومیت کو فروغ دے رہی تھی۔ مسلم قومیت کا نظریہ مولانا مودودی کے نزدیک کفر تھا جسے وہ اپنی خالص نظریاتی تحریک کے لیے نہایت مضر خیال کرتے تھے۔ اسی نظریہ پسندی کی شدت میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا کہ اسلامی لڑائی اور قومی لڑائی ایک ساتھ نہیں لڑی جا سکتی اور یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ ''یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں لیکن اگر یہ فی الواقع خلوص قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو سارا ہندوستان، پاکستان بن سکتا ہے۔'' یعنی مولانا مودودی کی نظر میں اسلام کا جہانی نظریہ تھا اور ہندوستان کے سیاسی مسائل کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ ان کو موقف یہ تھا:

ہمارے نزدیک اصل مسئلہ فلسطین، ہندوستان یا ایران یا ترکی کا نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ کفر اور اسلام کی کشمش کا ہے اور ہم اپنا سارا وقت، ساری قوت اور ساری توجہ اسی مسئلہ پر صرف کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا مودودی کی تمام تحریروں میں عقلیت پسندی کارفرما ہے اور تحریک کے زیر

اثر ان کے سائنٹفک اسلوب میں تحریکی قوت (Motivating Force) پیدا ہوگئی، جس نے ان کی نثر کو چار چاند لگا دیئے ہیں، چنانچہ ان کی تفسیر تفہیم القرآن ایک عمدہ تفسیر ہی نہیں اردو نثری ادب کا ایک شاہکار بھی ہے۔ اسی طرح علامہ اقبال ایک بلند پایہ مفکر ہونے کے باجود اپنی افتادطبع کی بنا پر نثر کے بجائے شاعری کی طرف مائل ہوئے تو اس میں انہوں نے تہذیبی تحریکی جذبہ کو سمودیا جس سے ان کی شاعری اپنی اثر انگیزی کے اعتبار سے دوآتشہ بلکہ اپنے پیغام کی بنا پر سہ آتشہ ہوگئی۔ علامہ اقبال نے کوئی تفسیر تو نہیں لکھی لیکن قرآن کی نکتہ رسی کے اعتبار سے وہ ان تمام مفسرین میں ممتاز نظر آتے ہیں جنہوں نے اس زمانے میں تفاسیر لکھیں۔

تفہیم القرآن میں اسلام کی جو تعبیر پیش کی گئی ہے اس میں سیاسی اور نظریاتی کشمکش کا رنگ اتنا گہرا ہوگیا ہے کہ مولانا مودودی ہر سورہ کی تفسیر سے پہلے اس کی شان نزول بیان کرتے ہیں اور اکثر وبیشتر اسلامی تحریک کے اس سیاسی پس منظر کو واضح کرتے ہیں جس میں وہ سورہ نازل ہوئی۔ اس کے برعکس علامہ اقبال کی تعبیر اسلام میں تہذیبی تحریک کا پہلو اس قدر غالب ہے کہ وہ فہم قرآن کے سلسلے میں 'ضمیر پر نزولِ کتاب' کی بات کرتے ہیں اور یہ تاکید بہت ضروری خیال کرتے ہیں کہ مستی وسوز کے بغیر قرآنی حقائق تک رسائی ممکن نہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

ے
ز رازی حکمت قرآں بیاموز
چراغے از چراغ او بر افروز
ولے از نکتہ را از من فرا گیر
کہ نتواں زیستن بے مستی و سوز

چنانچہ ان کی شاعری میں سوز و مستی، عشق وجنوں، فقر و درویشی، طور وتجلی، وصال و فراق، حضور واضطراب، نگاہ مردمومن اور فیضان نظر جیسی تراکیب اور الفاظ کثرت سے ملتے ہیں جو سب کے اقلیم تصوف سے تعلق رکھتے ہیں۔ تصوف سے علامہ اقبال کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ وہ دور حاضر کے انسان کی مخصوص نفسیاتی ضروریات کے تحت کسی نئے سلسلہ تصوف کے لیے چشم براہ ہیں' کیونکہ قرون وسطیٰ کے تصوف کو وہ عہد حاضر کے لئے بالکل بیکار سمجھتے ہیں اور اس میں اجتہاد کی ضرورت کو ناگزیر خیال کرتے ہیں اور یہ کام بھی ان کے نزدیک اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ دور

حاضر میں اسلامی فقہ کی تدوین نو۔

مولانا مودودی نے اپنی کتاب ''دینیات'' (مطبوعہ ۱۹۳۷ء) میں اگرچہ شریعت اور فقہ کے ساتھ ساتھ تصوف کو بھی دین کا ضروری جزو قرار دیا تھا لیکن اس کے تین سال بعد الفرقان بریلی کے شاہ ولی اللہ نمبر (مطبوعہ ۱۹۴۰ء) میں ''منصب تجدید کی حقیقت اور تاریخ تجدید میں حضرت شاہ ولی اللہ'' کے عنوان سے ان کا جو مقالہ (بعد میں تجدید واحیائے دین) چھپا اس میں تصوف کو ''جاہلیت راہبانہ'' سے تعبیر کیا گیا اور وہ تصوف جس کے بارے میں کہا گیا تھا ''شریعت کے احکام کو انتہائی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ بجالانے اطاعت میں خدا کی محبت اور اس کے خوف کی روح بھر دینے کا نام تصوف ہے'' اسی کے متعلق اب یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ ''اس فلسفہ کے ساتھ ایک ایسا نظام اخلاق وجود میں آتا ہے جو بہت کم ایجابی اور بہت زیادہ بلکہ تمام تر سلبی نوعیت کا ہے۔'' نقطہ نظر کی یہ تبدیلی اس لیے ضروری ہوگئی کیونکہ انہوں نے ایک نظریاتی سیاسی جماعت کے قیام کے لیے ذہنی تیاری مکمل کرلی تھی۔ جماعت کی تشکیل (۱۹۴۱ء) کے بعد سیاسی ضرورتوں کے تحت تصوف کے معاملے میں مولانا مودودی کی سردمہری بتدریج بڑھتی گئی۔ ان کی تحریروں میں کسی صوفی کا قول ڈھونڈے بھی نہیں ملے گا بلکہ وہ کسی صوفی کا نام تک زبان پر نہیں لاتے اور تصوف کے مروّجہ نظام سے وہ اس قدر بیزار ہوگئے کہ جس طرح مارکس نے نظریاتی اور طبقاتی کشمکش کے فلسفہ میں مذہب کے لیے افیون کا نام استعمال کیا تھا، اسی طرح مولانا مودودی نے بھی تصوف کو اسلامی تحریک کے لیے افیون اور کوکین قرار دیا۔ تصوف کے بارے میں مولانا مودودی کے اس رویہ کے برعکس علامہ اقبال کے نزدیک سیاسی قوت اور فقر کی قوت کو ایک سی اہمیت حاصل ہے، وہ فرماتے ہیں:

؎ نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ نگاہ کی تیغ بازی وہ سپاہ کی تیغ بازی

اور اسلامی کلچر کے حوالے سے ان کا ایک نعتیہ شعر ہے:

؎ شوکت سنجر وسلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب

مولانا مودودی کی سیاسی نظریاتی تحریک کے لیے ہر رکن جماعت کے لیے تجدید ایمان

کر کے نومسلم بننا ضروری تھا تا کہ وہ دنیا میں اللہ کا نام بلند کرنے کے لیے ''نسلی'' یا ''قانونی'' مسلمان کی سطح سے اٹھ کر ''اصلی'' اور ''نظریاتی'' مسلمان بن جائے۔ لیکن علامہ اقبال نے ''قانونی'' اور ''اصلی'' مسلمان کی تفریق کر کے قوم کے اندر داخلی تضاد کو ابھارنے سے مکمل احتراز اور کلی اجتناب کیا۔ وہ تضاد اور ٹکراؤ کو مسلمان اور ہندو کی کشمکش کے بین الاقوامی دائرے میں لے گئے تا کہ قوم اندرونی طور پر متحد رہے اور بیرونی کشمکش کی اس قومی جنگ میں انہیں اپنی مخفی ایمانی اور تنظیمی قوتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملے اور حکمت عملی یہ اختیار کی کہ ''سارے ہندوستان کو پاکستان بنانے'' سے پہلے'' ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان'' بنا لیا جائے اور اس خطے میں اسلام کی روحانی تہذیب کا احیاء کر کے اسے ایک عالمگیر تہذیب کی شکل دے دی جائے۔ اس کے برعکس مولانا مودودی نے کارکنان جماعت اسلامی کو ایک علیحدہ کلچرل گروپ یا ذیلی کلچر کی شکل دے کر اندرونی تضاد ابھارنے پر اتنا زور دیا جماعت کے کارکنوں کے لیے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ اپنے اندر ''غربت کا احساس'' پیدا کریں۔ انہوں نے کہا:

''موجودہ ماحول میں آپ غربت کا احساس پیدا کریں۔ غربت سے میرا مقصد یہ ہے کہ موجودہ فضا میں آپ کو ہر جگہ اجنبیت کا احساس ہو۔ خاندان میں، سوسائٹی میں، قوم میں آپ کو ہمدرد، آشنا، ہم خیال اور ہم مشرب کم نظر آئیں۔ آپ کو ہر مجلس میں احساس ہو کہ آپ جو چاہتے ہیں دوسروں کی چاہت اس سے مختلف ہے۔''

چنانچہ ''معاشرہ میں اجنبیت'' کو ایک اچھے رکن جماعت کی خوبی اور امتیازی وصف قرار دیا گیا:

''اب جہاں جہاں سے اس کشمکش کی اطلاعات آ رہی ہیں، وہاں کے لوگوں سے میں مطمئن ہو رہا ہوں، جہاں سے ایسی اطلاعات نہیں آ رہی ہیں وہاں کے لئے بے تابی سے منتظر ہوں کہ ایسی کوئی اطلاع ملے۔''

''قانونی مسلمان'' اور ''اصلی مسلمان'' کی اس گھر گھر تفریق اور ٹکراؤ نے جماعت اسلامی کو اس قوم میں فی الواقع ''اجنبی'' بنا دیا۔ اور اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ جماعت نے انتخابی سیاست میں حصہ لیتے ہوئے عوامی تائید حاصل کرنے کے لئے جب بھی مسلمانوں کو پکارا تو ہمیشہ ''قانونی''

مسلمانوں نے ان ''اجنبی'' مسلمانوں کو مسترد کر دیا اور ایک ''نظریاتی سیاسی جماعت'' کو ایک مذہبی فرقہ سے زیادہ حیثیت نہ دی۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے جماعت اسلامی کی انتخابی سیاست سے مایوس ہوکر انقلابی سیاست میں قدم رکھا تو مولانا مودودی کی اس تحریکی شدت پسندی سے بھی آگے نکل گئے اور خالص ملائی انداز میں آخرت کی میزان عمل کو اپنے ہاتھ میں لے کر مرنے والوں کے لیے ''مرحوم'' اور ''رحمتہ اللہ علیہ'' کی درجہ بندی پر بھی اصرار کرنے لگے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اس کے باوجود کہ میں علامہ اقبال کو عہد حاضر میں فکر اسلامی کا مجدد سمجھتا ہوں ان کے نام کے ساتھ صرف وہ لفظ استعمال کرتا ہوں جو اپنے والد ماجد کے لئے استعمال کرتا ہوں یعنی ''مرحوم'' اس لیے فکر کی انتہائی بلندی اور فہم کی انتہائی گہرائی کے باجود علامہ اقبال عمل کا پلڑا اس بہت ہلکا تھا جبکہ دوسری طرف مولانا مدنی کی سیاسی موقف سے شدید اختلاف کے باوجود ان کے نام کے ساتھ ہمیشہ ''رحمت اللہ علیہ'' کے الفاظ استعمال کرتا ہوں، اس لئے کہ وہ ایک بہت بڑے عالم دین اور متقی اور متدین مسلمان تھے۔''

علامہ اقبال نفاذ اسلام کے لئے ملت اسلامیہ کے اندر گنہ گاروں اور نیکو کاروں کی اس شدت پسندانہ تفریق کے خلاف ہیں بلکہ گنہ گاروں کے لئے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

؎ کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے
جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے

نفاذِ اسلام کے لئے ملت اسلامیہ کے اندر سے چھانٹ چھانٹ کر نیکو کاروں کی ایک الگ اسلامی نظریاتی پارٹی تیار کرنے کے بجائے علامہ اقبال نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ ایسے مغرب زدہ گنہ گاروں کے بارے میں ہمدردانہ رویہ اپنایا جائے جو ملت اسلامیہ سے مضبوط دلی رشتہ رکھتے ہیں اور ان کی اسلامی تربیت پر توجہ دی جائے۔ البتہ ''عشق دیگراں دل باختہ'' اور ''آبروئے خویش'' سے عاری لوگوں سے وہ کسی خیر کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے ''ملا'' کی

تنگ نظری کی شکایت کی ہے تو بے دین ''مسٹر'' سے بھی ان کی بیزاری کچھ کم نہیں ہے۔

ز من گیر ایں کہ مردے کور چشمے
ز بینائے غلط بینے نکوتر
ز من گیر ایں کہ نادانے نکوکیش
ز دانشمندے بے دینے نکوتر

غرضیکہ جس قسم کی تہذیبی تحریک کے علامہ اقبال داعی ہیں اس میں نیکوکاروں کے علاوہ گناہ گاروں کے لئے بھی عزت و احترام پایا جاتا ہے بشرطیکہ ان کے دلوں میں دینی جذبہ اور ملت اسلامیہ کے لئے دردمندی موجود ہو۔ بلکہ ایسے گنہ گاروں کے بارے میں وہ کچھ زیادہ ہی حسن ظن رکھتے ہیں:

نہ اُٹھا فرقہ زہاد سے فرہاد کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

اور ڈاکٹر رفیع الدین تو واشگاف الفاظ میں اعلان کرتے ہیں کہ قدرت نے علماء کو اسلام کی خدمت کا نااہل سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے اور اب ترقی کا دارومدار ایسے گنہ گاروں پر رکھا ہے جو زمانے کے تقاضوں کو علماء سے بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''قدرت نے بھی علماء کے اس طبقہ کو اسلام کی خدمت کا نااہل سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے اور اس زمانے میں اسلام کی ترقی کا دارومدار ان پر نہیں رکھا بلکہ ان لوگوں پر رکھا ہے جن کو یہ علماء مغرب زدہ اور گنہ گار کہتے ہیں اور جن کے اعتقاد اگرچہ مغرب کے ساتھ ایک داخلی کشمکش میں مصروف ہیں لیکن پھر بھی وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں اسلام کا درد لئے ہوئے ہیں۔ چونکہ علماء کا یہ طبقہ ایک رکاوٹ بنا رہتا تھا، اس لیے قدرت نے ان کو الگ کر کے اسلام کی پیش برد کے لئے مغرب زدہ گنہ گار مسلمانوں سے کام لیا ہے۔''

''اس دور میں قدرت نے عالم دینداروں کو چھوڑ کر اسلام کی خدمت کے لیے ایسے لوگوں کو چنا ہے جو ان علماء کی نگاہ میں جاہل اور گنہ گار ہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ آئندہ

بھی گناہ کا سدباب کرنے کے لئے سازگار حالات پیدا کرنے میں خداوند تعالیٰ کی حکمت پھر گناہ گاروں سے کام لے۔ مغرب زدہ مسلمان قرآن کو ٹھیک طرح نہیں سمجھتے لیکن زمانہ کو سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اس دور میں وہ ان علماء سے زیادہ موزوں ہیں۔''

علامہ اقبال کے نظریہ اور پروگرام کے مطابق نیکوکاروں کی ایک جماعت تیار کرنے سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ قوم کے افراد میں قومی نصب العین اور مقاصد کا شعور اس طرح راسخ کر دیا جائے کہ انہیں اس سے جذباتی لگاؤ ہو جائے۔ ملت اسلامیہ کی ذلت وخواری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے قومی نصب العین نہیں رہا۔ وہ فرماتے ہیں:

شبے پیش خدا بگریستم زار
مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند و محبوبے ندارند

ڈاکٹر رفیع الدین کے نزدیک بھی مقصد کو اسلامی ریاست کی کامیابی میں بے حد اہمیت حاصل ہے۔ وہ نصب العین کو نیکوکاروں کی جماعت کا نعم البدل قرار دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''ہم میں سے بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ایک اسلامی مملکت کو چلانے کے لئے ہمیں بڑے بڑے پرہیزگاروں اور نیکوکاروں کی ضرورت ہے جو اس وقت ہمیں میسر نہیں۔ لہٰذا وہ ایک اسلامی ریاست کے طور پر پاکستان کی کامیابی سے مایوس ہو جاتے ہیں لیکن اس میں مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمیں شروع میں صرف اور صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ جس طرح دوسری قومیں اپنے اپنے نصب العین کو ٹھیک طرح سمجھتی ہیں، ہم اپنے نصب العین کو ٹھیک طرح سمجھیں اور اس کی درستگی اور پختگی پر پورا پورا یقین رکھیں۔ اس زمانہ میں یہ فہم اور یقین فلسفہ خودی سے پیدا کر سکتے ہیں۔''

نصب العین اور مقصد کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے ڈاکٹر رفیع الدین فرماتے ہیں کہ مقصد کی تکمیل کے اسباب مقصد کے اندر ہی موجود ہوتے ہیں۔ جب ہم کسی مقصد کو اپنا کر اپنا عزم پختہ کر لیتے ہیں تو اس کو حاصل کرنے کے اسباب بھی اس کے اندر سے ہی خود بخود پیدا ہوتے چلے

جاتے ہیں۔ وہ اس کی مثال تخلیق پاکستان سے دیتے ہیں کہ جس طرح پاکستان محض ایک شخص کے مطالبہ کے بعد عدمِ محض سے وجود میں آ گیا، حالانکہ پاکستان کے بارے میں نہ ہمارا تصور واضح تھا، نہ اس کے حصول کی ہمت اور قوت تھی، نہ ضروری تنظیم اور نہ ہی ضروری وسائل میسر تھے، اسی طرح قوم میں مقاصد اسلام کا ہم اور یقین پیدا کر دیا جائے تو نفاذ اسلام کی راہ خود بخود پیدا ہوتی چلی جائے گی اور ہماری اخلاقی حالت خود بخود پستی سے بلندی کا سفر شروع کر دے گی۔

کسی قوم کی فکری اور سیاسی قیادت کا حقیقی امتحان اس بات میں ہوتا ہے کہ کیا اسے قومی نصب العین اور مقاصد کے حصول کے لئے مکانی اور زمانی حقائق کا گہرا ادراک ہے جن میں نصب العین اور مقاصد کو عملی شکل دینا مطلوب ہے۔ اس ضمن میں جب ہم علامہ اقبال اور مولانا مودودی کا موزانہ کرتے ہیں تو دونوں میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ کوئی بھی شخص اس بات پر حیرت و تاسف کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جماعت اسلامی کی چھیالیس سالہ جد وجہد اور مولانا مودودی کی فکر اس ملک کے غریب طبقے کو یہ یقین دلانے میں کامیاب نہیں ہو سکے کہ اسلام میں غربت کے مسائل کا حل بھی موجود ہے جبکہ سیاسی بصیرت سے بہرہ ور ایک جاگیر دار اس ملک کے غریب عوام کو سوشلزم کے نام پر یہ باور کرانے میں ایک ہی سال میں کامیاب ہو گیا کہ ان کے دکھوں کا مداوا اس کے سیاسی فلسفہ میں موجود ہے۔ چنانچہ لوگوں کی ایک قابل لحاظ تعداد آج بھی اسے اپنا نجات دہندہ سمجھتی ہے اور دل وجان سے اس پر فدا ہے۔

حال ہی میں ایک مشہور صحافی نے مولانا مودودی کی اسلامی فکر کو ''اشرافیہ کا اسلام'' کا نام دیا ہے۔ اس الزام کو گرم بازاری سیاست کی مبالغہ آرائی پر بھی محمول کریں تو بھی یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ مولانا مودودی اپنے مخصوص معاشرتی پس منظر (حیدر آبادی اور دہلوی) کی بنا پر اس ملک کے سیاسی اور معاشی حقائق سے پوری واقفیت نہیں رکھتے تھے اور انہیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اس ملک کے سیاسی اور معاشی ڈھانچے پر جاگیر داروں کی گرفت کس قدر مضبوط ہے، نیز نفاذ اسلام کے پروگرام کی ترجیحات میں غریب مزارعین کی ان جاگیر داروں سے گردنیں چھڑانا کیا اہمیت رکھتا ہے اور یہ کہ اسلام کی یہی تعبیر ہے جو ان غریبوں کی سمجھ میں آ سکتی ہے اور انہیں انسانوں کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی کا قائل کر سکتی ہے لیکن مولانا مودودی نے اپنی تصنیف

’’مسئلہ ملکیت زمین‘‘ میں جواز ملکیت کے حق میں جو دلائل دیئے ان کا تمام تر فائدہ جاگیرداروں کو پہنچا اور سوشلسٹ دانشوروں کا اس الزام تراشی کا موقع ملا کہ جماعت اسلامی ملک کے استحصالی نظام کو تحفظ دے رہی ہے۔

اس کے مقابلے میں علامہ اقبال کی سیاسی بصیرت اور معاملہ فہمی کو داد دیجئے کہ انہیں ۱۹۳۲ء میں ہی اس حقیقت کا بخوبی احساس ہوگیا تھا کہ ’’ہندوستان میں اسلام کے مستقبل کا انحصار پنجاب کے کاشتکار کی آزادی پر ہے۔‘‘ چنانچہ انہوں نے جاگیرداروں کی مذمت میں نہایت پرزور اشعار کہے اور الارض للہ کی قرآنی بصیرت کو عام کیا۔ غریب کاشتکاروں کی مظلومی اور بے کسی سے متاثر ہو کر آپ نے باغیانہ اور خون گرمانے والے جو شعر کہے ہیں ان میں انقلابی جوش و خروش کے علاوہ سیاسی حقائق کا بے ساختہ اظہار بھی ہے:

خدا آں ملتے را سروری داد
کہ تقدیرش بدست خویش بنوشت
بہ آں ملت سروکارے ندارد
کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

مسلم کانفرنس کے ایک اجلاس (۱۹۳۲ء) میں آپ نے یہ تجویز پیش کی کہ پورے ملک میں نوجوان لیگیں اور رضا کار دستے قائم کئے جائیں جو دیہات میں خدمت خلق، اصلاح رسوم، قوم کی تجارتی تنظیم اور اقتصادی پروپیگنڈے کے لئے کام کریں۔ دیہی علاقوں کے لئے یہ ایک جامع پروگرام تھا جس پر موثر انداز سے کام کیا جاتا تو اس ملک کی سیاست میں خوشگوار تبدیلی رونما ہو سکتی تھی اور نفاذ اسلام میں مدد مل سکتی تھی۔

دور حاضر میں نفاذ اسلام کے لئے کسی قیادت کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ ملکی حقائق سے پوری طرح باخبر ہو بلکہ اسے ان عالمی حالات اور واقعات سے بھی پوری طرح آگاہ ہونا چاہئے جو اس ملک پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر انداز ہو رہے ہیں اور تاریخ کے جس نازک دور سے ہم آج گزر رہے ہیں وہ پوری اسلامی دنیا کے لئے بڑی ابتلا کا دور ہے اور نفاذ اسلام کے لئے بظاہر انتہائی ناساز گار ہے۔ روس کی شکست و ریخت کے بعد امریکہ واحد عالمی طاقت کی

حیثیت سے ابھرا ہے جو دنیا پر اپنا من پسند نیو ورلڈ آرڈر مسلط کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے اور اسلامی دنیا ایک عالم بے کسی و بیچارگی میں اس کا راستہ ہموار کرتی نظر آتی ہے۔ نظریات، سیاست اور تہذیب میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، لیکن ان میں اسلام کہیں بھی Assert نہیں کر پا رہا۔ دنیا میں نیشنلزم کا نظریہ اپنی دلکشی کھو رہا ہے لیکن اسلامی ممالک ابھی تک اسی کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ آئیڈیالوجی کے خاتمے کا اعلان ڈینئل بیل نے ۱۹۶۰ء کے عشرے میں ہی کر دیا تھا اور اب روس کی شکست نے تو گویا اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ پال کینڈی (Paul kennedy) نے Imperial Overstretch کا نظریہ پیش کر کے عالمی طاقتوں اور سلطنتوں کے عروج و زوال کی ایک نئی تعبیر پیش کی ہے لیکن فوکویاما (Fukuyama) نے تاریخ کے خاتمہ کا اعلان کر دیا ہے اور جمہوریت کو مستقبل کا مستقل عالمگیر سیاسی نظام قرار دیا ہے۔

ایلون ٹافلر (Alvin Toffler) اکیسویں صدی کی جمہوریت کے لئے منظّم مذہب (Organised Religion) کو سب سے بڑا خطرہ قرار دیتا ہے اور ہنٹنگٹن (Samuel P. Huntington) کے خیال کے مطابق اب دنیا کی تمام جنگیں تہذیبوں کے درمیان لڑی جائیں گی۔ اور جن آٹھ تہذیبوں کے درمیان تصادم اور ٹکراؤ کا اس نے ذکر کیا ہے ان میں مذہب کا عنصر نمایاں ہے۔ ہنٹنگٹن نے ان آتش گیر علاقوں (Hot spots) کی نشاندہی بھی کی ہے جہاں یہ ٹکراؤ عسکری تصادم کی صورت میں ظاہر ہوا ہے یا آئندہ ہونے والا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اسلامی تہذیب ہی ایک ایسی تہذیب ہے جس کا بقیہ سات تہذیبوں سے کہیں نہ کہیں ٹکراؤ ہو رہا ہے یا عنقریب ہونے والا ہے۔ اسلام کے مقابلے میں الکفر ملة واحدة کا فرمانِ رسول ﷺ ایک زندہ حقیقت کے طور پر آج کی دنیا میں سامنے آ رہا ہے۔

تہذیبوں کے درمیان عسکری تصادم کے علاوہ ایک نظریہ نہ آنے والی خطرناک جنگ ایسی بھی جو اپنے نتائج و عواقب کے اعتبار سے کہیں زیادہ ہولناک اور تباہ کن ہے اور گھر گھر لڑی جا رہی ہے۔ ایلون ٹافلر نے اپنی کتاب پاور شفٹ (Power Shift) میں اس تہذیبی جنگ بڑی عیاری کے ساتھ کلچرل تجارت (Cultural Trade) کا نام دیا ہے لیکن اپنی سفاکی میں یہ کلچر تجارت عسکری جنگ کی تباہ کاریوں کو کہیں پیچھے چھوڑ گئی ہے اور اس نے ہمارے انداز زندگی کو ہی

سرے سے تبدیل کر کے رکھ دیا ہ اور ہماری نئی نسل ہم سے چھین لی ہے۔ ایلون ٹافلر نئی نسل کو Sereenie Generation کے نام سے موسوم کرتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک کمپیوٹر اور ٹیلی ویژن کی سکرین ہی نئی نسل کی شناخت کا ذریعہ ہے۔ ڈینل لرنر (Daniel Lerner) نے اپنی کتاب The Passing of Traditionan Society کے سرورق پر مشرقِ وسطیٰ میں اسلامی تہذیب کی پسپائی کا جو نقشہ ایک سکیچ کی صورت میں پیش کیا ہے اس میں دکھا گیا ہے کہ ٹیلیویژن کے ٹرانسمیٹر جس نسبت سے بلند ہو رہے ہیں، اسی نسبت سے مساجد کے گنبد و میان نیچے آتے جا رہے ہیں۔

علامہ اقبال نے مسلمان عورت سے خطاب کرتے ہوئے اسے یہ نصیحت کی تھی

بتولؑ باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرؑ بگیری

اور مولانا مودودی نے بھی اپنی کتاب ''پردہ'' میں گھر کی چار دیوا ری اور عورت کے حجاب کو اسلامی تہذیب کا وہ ''آخری قلعہ'' قرار دیا تھا جس کے اندر رہ کر وہ اپنی نئی نسلوں کے لئے اسلامی تہذیب کی حفاظت کرتی ہیں۔ لیکن اب یہ قلعہ بھی ٹوٹ چکا ہے۔ جونہی ٹیلیویژن کسی گھر میں داخل ہوتا ہے تو مغربی تہذیب میں پوری طرح رچا بسا ایک نیا گھرانہ بھی اس کے ساتھ ہی گھر میں آ کر آباد ہو جاتا ہے۔

علامہ اقبال کے زمانے میں ٹیلیویژن تو ابھی نہیں آیا تھا البتہ سینما کا رواج ہو گیا تھا لیکن وہ بہرحال گھر کی چاری دیواری سے باہر تھا۔ پھر بھی انہوں نے سینما کو ''صنعت آزری، دوزخ کی مٹی'' قرار دیا۔ لیکن آج کوئی گھر ایسا نہیں جس میں ٹیلیویژن کی ''صنعت آزری'' اور ''دوزخ کی مٹی'' سے تیار ہونے والی مورتیاں سجانے کے لئے کمرہ نہ مخصوص کیا جاتا ہو، چنانچہ دوزخ کی مٹی سے تیار ہونے والی ان ایمان شکن مورتیوں کے دام سحر سے کوئی بھی محفوظ نہیں۔ بچے موسیقی، رقص اور دہشت گردی کا سبق یہیں سے لیتے ہیں، جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے شرم و حیا کے جذبات یہیں چھینے جاتے ہیں اور بوڑھے بھی ذوقِ سحر خیزی سے یہیں محروم کئے جاتے ہیں۔ غرض اس چھوٹے سے تہذیبی آلہ کو ہلاکت آفرینی سے ہماری تہذیبی شناخت ہی ختم کی جا رہی ہے۔ اس کلچرل تجارت میں امریکہ کی عالمی برتری کا ذکر کرتے ہوئے ایلون ٹافلر بڑے پر اعتماد لہجے میں کہتا ہے کہ الیکٹرانس کی صنعتی تجارت میں

جاپان اپنی عالمی بالادستی کی بنا پر اپنے سونی ٹیلیویژن خواہ دنیا کے ایک ایک گھر میں پہنچا دے لیکن ان پر جو پروگرام دیکھے جائیں گے وہ لامحالہ امریکہ ہی کے ہوں گے اور جب تک عالمی کلچرل تجارت میں امریکہ کو یہ بالادستی حاصل ہے، دنیا پر ہماری گرفت مضبوط رہے گی۔

اس انتہائی مایوس کن صورت حالات میں جبکہ ہماری تہذیبی بقا ہی خطرے میں پڑ گئی ہے، کیا کہیں سے امید کی کوئی کرن نظر آتی ہے؟ ہم زیادہ سے زیادہ یہ سوچ سکتے ہیں کہ امریکہ کی Imperial Overstretch کے بھی وہی نتائج نکلیں گے جو روسی استعمار کی شکست و ریخت کی شکل میں دنیا کے سامنے آ چکے ہیں لیکن مظاہر پرست تہذیب (Sensate Culture) کے ''غرق اندر بدن'' فلسفہ کا نتیجہ جو آج دنیا کے سامنے ہے اس پر علمی کام کر کے دور حاضر کے انسان کو نئی تہذیب کی ضرورت کا احساس دلانے پر ہم کوئی توجہ نہیں دے رہے۔ حالانکہ مادی سہولتوں اور آسائشوں کے باوجود دور حاضر کا انسان سکون سے محروم ہے، مادی آسائشوں کی اس دوڑ میں گھر اجڑ رہے ہیں اور مغربی دنیا کے وسعت پذیر جنسی ویرانے (Sexual Wilderness) میں حرامی بچوں کی کثرت وجہ سے انسانی محبت کے سوتے خشک ہوتے جا رہے ہیں اور ماں باپ، بہن بھائی کے رشتے بے معنی اور بے احترام ہو کر رہ گئے ہیں۔ جرائم کی بہتات کی وجہ سے انسانی معاشرہ ایک جنگل کا سامان پیش کرتا ہے جس پر درندوں کی حکمرانی ہے۔ چنانچہ ڈیسمنڈ مارس جیسے بیالوجسٹ نے تو پوری سنجیدگی کے ساتھ انسان کو برہنہ بوزنہ (Naked Ape) اور انسانی معاشرہ کو انسانی چڑیا گھر (Human Zoo) کا نام دیا ہے اخلاقی بحران نے پوری دنیا کو ایک نفسیاتی عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ طاقتور قومیں کمزور قوموں کو اپنی چراگاہ سمجھتی ہیں۔ علامہ اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین اس تیرہ و تاریک صورت حال میں بھی اسلام کے روشن مستقبل میں یقین رکھتے ہیں تو محض اس واحد دلیل کی بنا پر کہ انسان کی بالقوہ فطرت (Potential Nature) اسے ایک نہ ایک دن مجبور کر دے گی کہ آخر کار وہ اسلام کے دامن میں پناہ لے۔ اقبال فرماتے ہیں:

یکے در معنی آدم نگر از ما چہ می پرسی
ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے

مغربی مفکرین کی تحریریں ظاہر کر رہی ہیں کہ دور حاضر کی اس مادّی، حسی اور مظاہر

پرست تہذیب کے خلاف انسانی شعور بغاوت پر آمادہ ہے۔ ایرک فرام کی Man For Himself ہربرٹ مارکوز کی One Dimensional Man اور ڈیوڈ رائزمین کی The Lonely Crowd ایسی بے شمار کتابیں ہیں جو انسان کی اندرونی خلش کا پتہ دیتی ہیں لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین کے بعد کوئی ایسا دانشور اور مفکر ہمارے حصے میں نہیں آیا جو دورِ حاضر کے انسان کو ''معنی آدم'' کی طرف متوجہ کر سکے۔ چنانچہ ہم فلسفہ خودی، جو معنی آدم بیان کرتا ہے، کی تشریح اور توسیع کے ضمن میں بھی ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے بعد ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکے۔ یہ بھی اسلامی دنیا کی بہت بڑی خوش قسمتی تھی کہ اسے علامہ اقبال کی ہم نوائی میں مولانا مودودی جیسا صاحب قلم شارح اسلام میسر آیا لیکن دقت یہ ہے مولانا مودودی کے مخاطب اوّل و آخر مسلمان اور صرف مسلمان ہیں جنہیں وہ اسلام کا بھولا ہوا سبق یاد دلا کر بہتر مسلمان یا مثالی مسلمان بنانا چاہتے تھے۔ اگرچہ مولانا مودودی اسلام کو ایک جہانی نظریہ اور عالمی تصور قرار دیتے ہیں جو تمام قومیّتوں کی حدود کو توڑ کر بنی نوع انسان کا پکارتا ہے لیکن ان کا اپنا خطاب یٰا ایھا المومنون سے بلند آہنگ ہو کر یاایھا الناس تک نہیں پہنچتا۔ اس لئے ان کی تحریریں مغربی کلچر کے انسان کے لئے زیادہ موثر نہیں ہیں۔ امت مسلمہ کے لئے بلاشبہ مولانا مودودی کے فکر نے آب حیات کا کام دیا ہے اور نوجوان نسل ک خون کو گرمایا۔ پڑھے لکھے نوجوانوں میں خداترس اور مضبوط سیرت و کردار کے لوگ پیدا کیے۔ چنانچہ اسلامی دنیا کے اکثر ممالک میں مولانا مودودی کا نام عزت و احترم سے لیا جاتا ہے۔ مسلمان ممالک کی اسلامی تحریکیں ان کی فکر سے کم وبیش متاثر ہیں۔ خاص طور پر افغانستان اور کشمیر کے جہاد میں مولانا مودودی کے فکر نے شعلہ زندگی تیز کیا ہے۔ غرض اسلام کی تڑپ پیدا کرنے اور لادینی قوتوں اور کفر کا مقابلہ کرنے میں اگرچہ مولانا مودودی کی کی تحریریں ولولہ انگیز ثابت ہوئی ہیں لیکن مغرب کی فکری یلغار کا مقابلہ کرنے میں علامہ اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین کی تحریریں ہی زیادہ موثر ہیں۔

علامہ اقبال کی بصیرت کو داد دیجئے کہ جس عالمی سطح پر کلچرل تصادم کا ذکر ہنٹنگٹن آج کر رہا ہے، اس خطرہ کا احساس علامہ اقبال کو ۱۹۳۲ء میں ہی ہو گیا تھا۔ چنانچہ آپ نے ''ہندوستان اور ایشیا میں آنے والے ایک طوفان'' کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''ایک کلیہ سیاسی تہذیب کا خاصہ ہے کہ وہ انسان کو ایک چیز سمجھتی ہے نہ کہ ایک شخصیت جسے تہذیبی قوتوں کے ذریعے نشونما دی جائے۔ ایشیائی لوگ لازماً اس استحصالی اقتصادیات کے خلاف اٹھیں گے جسے مغرب نے نشو ونما دی ہے اور مشرقی اقوام پر مسلط کیا ہے۔ ایشیا جدید مغربی سرمایہ داری بشمول اس کی غیر تربیت یافتہ انفرادیت کے نہیں سمجھ سکتا۔''

اس تہذیبی تصادم میں اسلام کے روشن امکانات کا ذکر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

''جس مذہب کی آپ نمائندگی کرتے ہیں وہ فرد کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی تربیت کرتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور انسانیت کی راہ میں نثار کر دے۔ اس کے امکانات ابھی ختم نہیں ہوئے۔ وہ اب بھی ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے جہاں انسان کا معاشرتی رتبہ اس کی ذات یا رنگ یا آمدنی سے نہیں بلکہ اس طرز زندگی سے متعین ہوتا ہے جسے وہ بسر کرتا ہے، جہاں غریب امیروں پر ٹیکس عائد کرتے ہیں، جہاں مساوات کی اساس شکم نہیں بلکہ روح پر ہے، جہاں ایک اچھوت ایک بادشاہ کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے، جہاں نجی ملکیت ایک امانت شمار ہوتی ہے اور جہاں اتنا سرمایہ اکٹھا کرنے کی اجازت نہیں کہ وہ دولت پیدا کرنے والوں پر چھا جائے۔''

نئی دنیا تخلیق کرنے کے جو مقاصد یہاں علامہ اقبال نے بیان کئے ہیں وہ درحقیقت توحید وللّٰہیت، تقویٰ اور اخوت، انفاق ومساوات کی اسلامی قدروں کی ہی سادہ اور عام فہم زبان میں تشریح ہے اور اسلام کی یہی تہذیبی قدریں ہیں جن کے لئے آج پوری دنیا ترس رہی ہے۔ کیا یہ ایسی قدریں ہیں جن سے ہمارے علماء ناواقف ہیں؟ اس کے باوجود ہماری دینی سیاسی جماعتوں میں آج کوئی ایسی جماعت نہیں جس نے لوگوں ک سامنے نفاذ شریعت کی آسانی سے سمجھ نہ آنے والی اصطلاح کے بجائے سادہ اور عام فہم زبان میں ان مقاصد کو اپنی سیاسی جدوجہد کا مقصود بنایا ہو؟ حالانکہ یہی تو وہ مقاصد ہیں جن میں نہ صرف پاکستان کے مسائل کا حل موجود ہے بلکہ دنیا کے مصائب کا علاج بھی انہیں میں مضمر ہے اور یوں ان میں ایک عالمگیر اپیل بھی پائی جاتی ہے۔ اس لئے اگر ''نفاذِ شریعت'' کی اصطلاح جس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے اہل علماء صرف اپنے آپ کو ہی سمجھتے

ہیں، کے بجائے عام فہم الفاظ میں ان مقاصد کو لوگوں کے سامنے رکھا جائے جو اسلام کے تہذیبی مقاصد ہیں تو اس نفاذِ شریعت کی بات ان عام لوگوں کی سمجھ مس آئے گی جو نفاذ شریعت کی اصطلاح سنتے ہی اپنے ذہنوں کو یوں مقفل (Swuich Off) کر دیتے ہیں گویا یہ اصطلاح صرف علماء کے سمجھنے کی چیز ہے۔ مگر جب علامہ اقبال شریعت کی بات کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ

ے کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتہ شرعِ مبیں ایں است و بس

تو کون ایسا شخص ہوگا جس کا ذہن شریعت کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے گا؟ لیکن ہمارے علماء پر سیکولرازم کا اس قدر غلبہ ہے کہ وہ اس قسم کی حکمت عملی مشکل سے ہی سوچ سکتے ہیں۔ ہمارا علماء کی سیکولر سوچ کا تو یہ عالم ہے کہ ان کے نزدیک نوافل تو اعمالِ حسنہ شمار ہوتے ہیں لیکن فوجی مشقیں شاید اعمال صالحہ کے زمرے میں بھی نہ آتی ہوں۔ کسی مدرسہ میں دینی تعلیم دینا تو ان کے نزدیک دین کی خدمت ہے لیکن کسی سائنس دان کا تحقیقی کام جو خوراک کی پیداوار میں اضافہ کا باعث بنے، سراسر دنیاوی کام ہے جو ان کے نزدیک دینی اعتبار سے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اور گزشتہ سال اس سیکولر رویے کی ایک انتہائی شکل یہ بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ لاکھوں نیکوکار ایک مقام پر اکٹھے ہو کر گھنٹوں رو رو کر آخرت میں اپنی مغفرت کے لئے دعائیں مانگتے رہے لیکن کشمیر اور بوسینا کے مظلوم مسلمانوں کے لئے ایک حرف دعا تک زبان پر نہ لائے۔

علامہ اقبال نفاذِ اسلام کی بات کرتے ہیں تو کلچرل نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔ کلچرل کا تناظر تو یوں بھی بہت وسیع ہوتا ہے جس مادی اور روحانی عناصر ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی انہوں نے یہ بات ذہن نشین کرانے پر بھی بالخصوص زور دیا ہے کہ اسلام میں مادی اور روحانی عناصر متضاد نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ نفاذ اسلام کے موضوع پر ان کی سب سے جامع اور مربوط تحریر ان کے خطبات میں چھٹا خطبہ ہے جسے انہوں نے The Principle of Movment in the Structure of Islam کا عنوان دیا ہے۔ اس خطبہ کا آغاز اس جملے ہوتا ہے کہ ''ایسی تہذیبی و ثقافتی تحریک کی حیثیت سے اسلام دنیائے قدیم کے اس نظریہ کو مسترد کر دیتا ہے جس کی رو سے کائنات ایک ساکن و جامد وجود ہے بلکہ وہ اسے متحرک قرار دیتا

ہے۔'' دوسری بات جس پر علامہ اقبال نے اس خطبہ میں بار بار زور دیا ہے وہ سیکولرازم کے نظریئے کا اِبطال ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اسلام میں کلیسا اور سٹیٹ ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ اسلام ایک ایسی واحد اور نا قابل تجزیہ حقیقت ہے کہ نقطہ نظر کی تبدیلی سے کبھی اس کا ایک رُخ سامنے آتا ہے اور کبھی دوسرا۔ علامہ اقبال کے نزدیک یہ نکتہ انتہائی دور رس نتائج کا حامل ہے اور اس کے فلسفیانہ مضمرات بہت گہرے ہیں۔ اسلام کی اسی ''واحد اور نا قابل تجزیہ حقیقت'' کے پیش نظر ہی علامہ اقبال نے اجتہاد کا حق غیر علماء لوگوں پر مشتمل ایک ایسی پارلیمنٹ کو دیا ہے جس میں علماء بھی ایک موثر جزو کی حیثیت سے شریک ہوں اور اجتہاد کے لئے علماء کے الگ بورڈ کے قیام کو خطرناک قرار دیا کیونکہ اس سے تھیوکریسی کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ قانون سازی کے لئے پارلیمنٹ میں علماء اور غیر علماء دونوں کی موجودگی اس لئے ضروری ہے کہ پیش آمدہ مسائل پر دینی اور دنیاوی نقطہ ہائے نظر سے مشترکہ غور و خوض اور باہمی تعامل کی وجہ سے علماء اور غیر علماء دونوں کے سیکولرازم کا ازالہ ممکن ہے۔ چنانچہ اس طرح جو اجتہاد پارلیمنٹ کرتی ہے اس میں اسلام کی ''واحد اور ناقبل تجزیہ حقیقت'' پوری طرح منعکس ہوتی ہے۔ تیسری بات جس پر علامہ اقبال نے اس خطبہ میں زور دیا ہے وہ نکتہ توحید ہے۔ اور انسانی زندگی پر توحید کے عملی اطلاقات پر آپ نے بڑی خیال انگیز بحث کی ہے۔

اس خطبہ کے بالکل آخر میں علامہ اقبال نے اپنی بحث کو اسلامی کلچر کے نصب العینی پہلوؤں پر مرتکز کر دیا ہے اور دور حاضر کے انسان کی تین اہم ضرورتوں کا ذکر کیا ہے جنہیں ہم اسلامی کلچر کے بنیادی مقاصد یا عناصر ترکیبی قرار دے سکتے ہیں اور وہ یہ ہیں:

1۔ کائنات کی روحانی تعبیر (Spiritual Interpretation of the Universe)

2۔ فرد کا روحانی استخلاص (Spirtual Emancipation the Individual)

3۔ روحانی جمہوریت (Spirtual Democracy) یعنی ''عالمگیر نوعیت کے وہ بنیادی اصول جن پر معاشرے کا روحانی ارتقاء جاری رہے۔''

ان تینوں مقاصد میں ''روحانی'' کا لفظ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ اسی خطبے میں علامہ اقبال کی یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ ''روحانی'' سے ان کی مراد توحید ہے۔ غرض نفاذ اسلام کے لئے جس قسم کی کلچرل موومنٹ علامہ اقبال کے پیش نظر ہے اس کا لائحہ عمل انہی تین مقاصد کے

حوالے سے متعین ہوتا ہے۔

(1) علامہ اقبال کی ترجیحات میں سب سے پہلا کام ''کائنات کی روحانی تعبیر'' سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے ہم کائنات کی توحیدی تعبیر کے نام سے بھی موسوم کر سکتے ہیں جس کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ کائنات کی تعبیر کرنے والے تمام علوم کو جنہیں عرفِ عام میں سائنس کہا جاتا ہے، خدا جوئی، خدا شناسی اور خدا رسی کا ذریعہ بنایا جائے تا کہ وہی سائنسی علوم جو آج ہماری نئی نسلوں کے لئے پامالی عقائد کا باعث بن رہے ہیں، ہمارے لئے ایمان افروزی اور ایزادی تقویٰ کا وسیلہ بن جائیں۔ اپنے ملک کے نظامِ تعلیم بلکہ دنیائے علم میں یہ انقلاب لانا ہماری اوّلین ضرورت ہے جس کے لئے علامہ اقبال ایک زوردار نعرہ بلند کرتے ہیں

ے اے مسلماناں فغاں از فتنہ ہائے علم و فن
اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیر یاب
انقلاب ، انقلاب، اے انقلاب

علامہ اقبال کے نزدیک علم وفن میں انقلاب لائے بغیر پختہ عقائد نہیں پیدا کئے جا سکتے۔ پختہ عقائد کی بنیاد پر ہی کسی قوم کی زندگی میں عمل اور حرکت کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں

ے دین ہو ، فلسفہ ہو، فقر ہو ، سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوزِ عمل زار و زبوں
ہوگیا پختہ عقائد سے تہی جن کا ضمیر

بلاشبہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین پاکستان کی وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے اس کام کی اہمیت کا احساس کیا اور اس ضمن میں ٹھوس کام بھی کیا۔ سب سے پہلے آپ نے فلسفہ تعلیم کے موضوع پر ایک بلند پایہ کتاب ''تعلیم کے بنیادی اصول'' (First Principles Education) کے نام سے تصنیف کی۔ اس کے بعد آپ نے اسلام اور سائنس کے الحاق کے موضوع پر کئی مقامات شائع کئے۔ اور صرف نظری بحث پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ عملی نمونہ کے طور پر ایک نصابی کتاب A specimen Text-book on Intermediate Physics پر بھی لکھی اور اپنی موت

سے صرف تین سال پہلے ''اسلامک ایجوکیشن کانگریس'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تا کہ سائنس کی نصابی کتابوں میں توحید کے نفوذ کا کام مستقل بنیادوں پر جاری رکھا جا سکے۔

علامہ اقبال نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا تھا کہ قرون وسطیٰ کے تصوف نے قوم کے بہترین دماغوں کو جذب کر کے کاروبار سلطنت معمولی قابلیت کے لوگوں کے سپرد کر دیا، جس کے نتیجے میں مسلمان اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھے لیکن اس دور کا المیہ یہ ہے کہ سیاست ہماری نہایت ذہین اور فطین شخصیات کو نگل گئی اور انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کے لئے تعلیمی میدان کا رخ کرنے کے بجائے سیاسی مہم جوئی کو اپنی عاقبت سنوارنے کا ذریعہ بنالیا ہے جس کے نتیجے میں آج تعلیم کا میدان ایک مہیب ویرانے کا منظر پیش کرتا ہے۔

(2) فرد کے روحانی استخلاص سے علامہ اقبال کی مراد یہ ہے کہ انسان عقیدہ توحید کی بنیاد پر آزادی کا ایسا شعور حاصل کر لے کہ وہ ماسواء اللہ کی غلامی سے آزاد ہو جائے۔اسی روحانی استخلاص کو قرآنی اصطلاح میں تقویٰ، دینی اصطلاح میں تعلق باللہ یا للّٰہیت اور علامہ اقبال کی شاعری کی اصطلاح میں ''خودی'' یا مقام خویش کا نام دیا گیا ہے۔''مقام خویش'' حاصل کرنے کے لئے علامہ اقبال نے ''بحق دل بند وراہِ مصطفیٰ رو'' کا پروگرام دیا ہے اس میں خودی کی تربیت کے تین ارتقائی مراحل بیان کئے ہیں جو اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی کے نام سے موسوم کئے گئے ہیں۔ نیابت الٰہی کا آخری مقام رحمت للعالمینی ہے۔اور نبی کریم ﷺ کی محبت اور اتباع میں انسان نیابت الٰہی کے مقام پر فائز ہو کر رحمت للعالمینی کا مظہر بن جاتا ہے جو انسانی ارتقاء کا نکتہ عروج ہے۔

خلق ، تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمت للعالمینی انتہاست

خودی کے اثبات واستحکام کے سلسلے میں ولامہ اقبال نے تخلیق وتولید مقاصد عشق و محبت، سوال سے اجتناب، فلاطونی اور مجوسی تصوف سے احتراز، تسلیم و رضا اور سخت کوشی ایسے فضائل کا ذکر کیا ہے جن کا تفصیلی ذکر اسرار خودی اور ان کے دوسرے لٹریچر میں موجود ہے۔ جو ادارے ان کے اقدار وفضائل کی تخلیق، حفاظت اور نشو ونما کر سکتے ہیں، علامہ اقبال ان میں سے

ایک ایک کا دقت نظر سے جائزہ لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آستانہ و خانقاہ اور مکتب و مدرسہ، کردار سازی اور تعمیر سیرت و شخصیت کے لئے غیر موثر ہو گئے ہیں جبکہ سکول، کالج اور ذرائع ابلاغ ایسی اقدار پروان چڑھانے میں مصروف ہیں جو ایک عیش کوشانہ تمدن کے فروغ کا باعث بن رہی ہیں۔ لہٰذا ان سب اداروں کی اصلاح ضروری ہوگئی ہے جو صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہمارے روحانی مقاصد ہمیشہ ہمارے سامنے رہیں۔

(3) روحانی جمہوریت کا ذکر کرکے علامہ اقبال نے معاشرہ کی ایسی تنظیم کا ذکر کیا ہے جو مغربی جمہوریت یا اسلامی جمہوریت سے کوئی معنوی علاقہ نہیں رکھتی۔ صاف نظر آتا ہے کہ جس سیاق و سباق میں علامہ اقبال نے روحانی جمہوریت کی بات کی ہے وہاں روحانی جمہوریت (Spirtual Democracy) کے الفاظ روحانی غلامی (Spirtual Slavery) کے بالمقابل استعمال ہوئے ہیں اور یوں جمہوریت کا لفظ اہل مغرب کے لئے (مجبوری ابلاغ میں) درحقیقت اس آزادی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے جو للّٰہیت یا تعلق باللہ کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک توحید اور رسالت ملت اسلامیہ کے اساسی ارکان ہیں جن میں معاشرہ کو سیاسی آزادی کی ایک ایسی فضا میسر آتی ہے جس میں حریت، مساوات اور اخوت کی اسلامی اقدار کو فروغ ملتا ہے۔ علامہ اقبال نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ دنیا نے جس ڈیماکریسی کی شکل میں آزادی کی ایک دھندلی سی جھلک دیکھی ہے وہ درحقیقت یورپ کی مسخ شدہ خودی (Perverted Ego) کا ایک ایسا مرض ہے جس سے آزادی کے نام پر سرمایہ داروں کے لئے غریبوں کے استحصال کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ پاکستان میں جمہوریت کی جو شکل دیکھنے میں آئی ہے اس میں بھی عملاً یہی صورت ہمارے سامنے آئی ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال مشرق و مغرب کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

مذہبی جماعتوں نے بھی جمہوری سیاسی راستے کو اپنا کر نفاذِ اسلام میں کوئی کامیابی

حاصل کرنے بجائے اپنی منزل اور بھی دور کر لی ہے جماعت اسلامی آج زیادہ سے زیادہ یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ اس کی کوششوں کی وجہ سے ملک میں سیکولر قوتوں کو من مانی کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن انہیں کبھی اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ قرار داد مقاصد سے آگے پیشرفت کیوں نہیں ہو سکی اور ۱۹۷۳ء کا آئین جسے مولانا مودودی کی تائید حاصل تھی اس سے قوم کو کیا ملا؟ حقیقت یہ ہے کہ ہماری تمام دینی سیاسی جماعتوں کے پروگرام لوگوں کے حقیقی مسائل سے اتنے بے تعلق رہے ہیں کہ اب لوگوں کے لئے اسلامی نعروں میں کوئی جذباتی اپیل بھی نہیں رہی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ حالیہ انتخابات میں لوگوں نے دینی جماعتوں کو پانچ فیصد سے زیادہ ووٹ نہیں دیئے۔ لہٰذا انہیں مولانا امین احسن اصلاحی اور علامہ اقبال کی اس بات پر توجہ دینی چاہیے کہ الگ الگ (بلکہ متحارب) دینی سیاسی جماعتیں بنانے کے بجائے پوری ملت کو الجماعۃ قرار دیں اور پوری ملت کو مقصود بنا کر ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق اپنے آپ کو جس خدمت کا اہل پائے وہ خدمت انجام دے اور کسی پہلو سے اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو کہ وہ کسی اعتبار سے ملت کا ممتاز فرد ہے اور بس اس کی جماعت ہی دین کی حامل جماعت ہے، لیکن یہ سوچ صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب نفاذِ اسلام کے کام کو ایک سیاسی تحریک کی شکل میں دیکھنے کے بجائے بقول اقبال اسے ایک کلچرل تحریک تصور کیا جائے۔ یقیناً اس کلچرل تحریک میں سیاست بھی ایک لازمی عنصر کی حیثیت سے موجود رہے گی، لیکن اس بنیادی اصول پر کہ سیاست اسلام کا حصہ ہے، اسلام کا حصہ نہیں۔ آج ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے علماء نے اسلام کو سیاست کا حصہ بنا دیا ہے بلکہ مروّجہ سیاسی منڈی کی ایک تجارتی جنس بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم نے انہیں مسترد کر دیا اور انتخابات میں ان کے حصے میں اتنی بھی سیٹیں نہیں آئیں جتنی کہ غیر مسلم اقلیتوں نے جیت لی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ ---

پاکستان درحقیقت ہماری اس گمشدہ جنت کا نام ہے جو ہمارے تہذیبی لاشعور میں محفوظ ہے اس کی بازگشت کا جو خواب ہم نے آج سے نصف صدی پہلے ’’پاکستان کا مطلب کیا۔۔۔ لا الہ الا اللہ‘‘ کی صورت میں دیکھا تھا اس کی تعبیر کے لئے ایک اسی روحانی جمہوریت کے لئے قوم ترس رہی ہے جس میں سربراہِ حکومت، ظالم کو کمزور اور مظلوم کو طاقتور سمجھتا ہو، جو اس دنیا کی مادّی

احتیاجات کے لئے خدا سے مانگی گئی دعاؤں کو بارگاہِ ایزدی میں اپنے خلاف استغاثہ خیال کرے، جسے اپنی ریاست کے ایک پیاسے کتے کی فکر بھی دامن گیر ہو، جو ایک تہائی شب اپنی رعایا کی نجی اور ذاتی مسائل معلوم کرنے کے لئے شہر کا گشت لگائے اور آخری تہائی شب میں اپنی کوتاہیوں اور فروگزاشتوں کی اپنے ربّ سے دعا مانگے، جو ایک مفتوحہ ملک میں اس شان کے ساتھ داخل ہو کہ اس کا ملازم سواری پر بیٹھا ہو اور وہ اس کے ساتھ پیدل دوڑ رہا ہو، جس کا محاسبہ ایک غریب عورت جلسہ عام میں کرے۔ لیکن اس کی جواب طلبی پر اس کا کوئی استحقاق مجروح نہ ہوتا ہو اور جو سزائے جرم میں اپنے لختِ جگر کو کوڑے لگوا کر اس کا چراغ زندگی گل کر دے مگر شفقت پدری راہ انصاف میں اس کے قدموں کو ڈگمگا نہ سکے۔ کیا دورِ حاضر کی جمہوریت، سوشلزم یا کسی بھی دوسرے نظام کو اس روحانی کلچر سے کوئی دور کی نسبت بھی ہے؟

نفاذِ اسلام اسی روحانی کلچر کے احیاء کا نام ہے جسے علامہ اقبال نے 'روحانی جمہوریت' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ چشم فلک نے اس قسم کے روحانی کلچر کا نظارہ انسانی تاریخ میں فقط ایک بار قلیل مدت کے لئے کیا تھا لیکن اس کے نقوش ہمارے تہذیبی لاشعور پر اتنے گہرے ہیں کہ وہ تا قیامت محو نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ صدیوں کی مسلسل ناکامیوں کے باوجود نفاذ اسلام کی قندیل آرزو ہمارے دلوں میں ٹمٹماتی رہتی ہے۔ اس کی لو کبھی مدہم ہو جاتی ہے کبھی تیز۔ اور وقتی طور پر مسلمان قوم جمہوریت اور سوشلزم کے ظلمات میں بھٹک بھی سکتی ہے لیکن نصب العین کی کشش اسے پھر اسلام کی طرف آنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

علامہ اقبال نے اس روحانی کلچر کے احیاء کے لئے جو حکمت عملی اختیار کی وہ یہ تھی کہ پہلے انہوں نے اس مقصد کے لئے کوئی نظریاتی پارٹی تیار کرنے کے بجائے نظریاتی بنیادوں پر ایک ملک حاصل کرنے کی کوشش کی اور سارے ہندوستان کو پاکستان بنانے کے خواب دیکھنے کے بجائے ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے کو پاکستان بنانے کا منصوبہ بنایا اور اسے قوم کے سامنے پیش کیا۔ پھر اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ان کی نگاہ کسی عالم دین پر نہیں اُٹھی بلکہ اس غرض کے لئے انہوں نے ایک ایسے مغرب زدہ گنہ گار کو منتخب کیا جس کے بارے میں ان کے لئے صرف اسی قدر اطمینان کافی تھا کہ وہ ایک خدا، رسول ﷺ اور قرآن پر ایمان رکھنے والا سیدھا

سادا مسلمان ہے، مضبوط کردار کا مالک ہے، ملت اسلامیہ کے لئے دل دردمند رکھتا ہے اور انگریزوں اور ہندوؤں کی ذہنیت اور سیاسی مکاریوں کو خوب سمجھتا ہے۔

اپنی زندگی کے آخری دنوں میں فقہ اسلامی کی تدوین نو کے بارے میں ان کی فکرمندی یہ ظاہر کرتی ہے کہ مستقبل کی اسلامی ریاست میں اسلامی قانون کے نفاذ کے سلسلے میں وہ اس ہوم ورک کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔ علامہ انور شاہ کاشمیری سے ان کا یہ کہنا کہ آپ دینی علوم میں گہری بصیرت رکھتے ہیں اور میں دنیاوی امور کو سمجھنے کی کچھ اہلیت رکھتا ہوں اور اس طرح دونوں کی مشترکہ کاوشوں سے ہی یہ کام انجام پا سکتا ہے۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کے نزدیک ایسے کام کے لئے علماء اور جدید تعلیم یافتہ ماہرین کا اشتراک کس قدر ضروری ہے۔ اس کے برعکس ہماری دینی سیاسی جماعتیں نفاذ اسلام کی سیاست میں اس قدر مصروف ہیں کہ آج تک کسی بھی جماعت نے اس قسم کے علمی کاموں پر کوئی توجہ ہی نہیں دی۔

''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے چھٹے خطبے میں نفاذ اسلام اور اجتہاد پر علامہ اقبال نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان میں کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ ایک مسلم نیشنلسٹ سٹیٹ کو اسلامی سٹیٹ کی منزل تک پہنچانے کے لئے کسی دینی سیاسی جماعت کا قیام ناگزیر سمجھتے ہیں اور نہ ہی اقامت دین کی خاطر اس خطبہ میں کہیں صالحین کی ایسی قیادت کی تیاری کا ذکر ہ جو ایوانِ اقتدار میں پہنچ کر اسلام کو اوپر سے نافذ کرنے کا فریضہ انجام دے۔ البتہ ان کے نزدیک اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ پوری قوم کو اپنا اسلامی نصب العین اور مقاصد واضح طور پر معلوم ہونے چاہیں جن کے حصول کے لئے نیکوکاروں اور گنہ گاروں کی تفریق کے بغیر سبھی لوگ من حیث القوم جدو جہد کریں اور اپنی اپنی صلاحیتیوں کے مطابق اس میں حصہ لیں۔ وہ علومِ دین میں علماء کے تخصص کی وجہ سے ان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہی لیکن نفاذ اسلام کے لیے کسی سیاسی جماعت یا علماء کے کسی حکومتی بورڈ کے قائل نہیں بلکہ علماء کے اس گہرے سیکولرازم کے سخت خلاف ہیں جو دینی اعمال اور دنیاوی اعمال کی تفریق کر کے اسلام کو اس حد تک کنٹرول کرنے لگتے ہیں کہ مرنے والوں کے آخرت کے معاملات کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔

نفاذِ اسلام کا مسئلہ چونکہ اسلام کی روحانی اقدار کو مادّی دنیا میں متشکل کرنے سے تعلق

رکھتا ہے، اس لئے علامہ اقبال علماء سے زیادہ ان غیر علماء (Social Engieers) کوموزوں سمجھتے ہیں جو کارِ دنیا سے آشنا ہیں، مادّی دنیا کی صورت گری کا تجربہ رکھتے ہیں، دورِ حاضر کی سیاسی اور معاشی پیچیدگیوں سے پوری طرح آگاہ ہیں اور علماء ک مقابلے میں کہیں زیادہ معاملہ فہم ہیں۔ ہمارے علماء اگر دانائے دین بننے کے زعم میں امورِ دنیا سے قطع تعلق کر کے ابلہ دنیا بنے رہیں تو نفاذ اسلام سے، جو امورِ دنیا کا مسئلہ ہے، کیسے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں؟ تاہم اگر وہ اپنے دینی تخصص کی بنا پر غیر علماء کے ساتھ بامعنی تعامل کر سکیں تو وہ مجلس قانون ساز کے اہم جزو کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

نفاذِ اسلام کے لئے کسی سیاسی تحریک کے مقابلے میں علامہ اقبال کو زیادہ دلچسپی نفوذ اسلام کی کلچرل تحریک سے ہے جس کا لائحہ عمل ان کے نزدیک یہ ہے کہ توحید کی تعلیم کو عام کیا جائے کیونکہ توحید ہی اسلام کی روحانی اور تہذیبی قوت ہے جس سے طلسم رنگ و بو کو توڑا جا سکتا ہے اور معاشرے کو ایک روحانی اساس پر قائم کر کے تمام معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ انہیں شکوہ ہے کہ توحید کو زندگی آموز تعلیم کا درجہ دینے کی بجائے ہمارے علماء نے اسے علم الکلام کا مسئلہ بنا رکھا ہے جبکہ توحید کا ہر شعبہ زندگی پر اطلاق اور اس میں توحید کی کارفرمائی ہی درحقیقت نفاذ اسلام کا مقصد اولیٰ ہے۔ اسی لئے علامہ اقبال مسلم معاشرہ کے اعلیٰ اور ذہین ترین طبقات سے لے کر انتہائی پسماندہ طبقوں تک توحید کا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ پنجاب کے کاشتکاروں کی ہزاروں برس کی خاکبازی اور غربت و جہالت کی وجہ سے اس کی خوابیدہ صلاحیتیوں کو بیدار کرنے اور اس کی خاک میں دبی ہوئی آگ کا شعلہ تیز کرنے کے لئے بھی ان کا یہی پیغام ہے

یہی دین محکم یہی فتح باب ؎
کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب

توحید نہ صرف انسان کو تسخیر قوائے نظام عالم قدرت بخشتی ہے بلکہ اسی کے فیض سے ہی معاشرے میں رنگ و نسل اور شعوب و قبائل کے امتیازات کو ختم اور حریت، مساوات اور اخوت کی اقدار کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

علامہ اقبال ہر فرد کو ملت کے مقدر کا ستارہ سمجھتے ہیں جو توحید کا رنگ اختیار کر کے اس

کائنات میں اللہ تعالیٰ کی نمائندگی کا درجہ حاصل کرسکتا ہے اور اپنی پختگی کردار سے اس دنیا کی اصلاح کرسکتا ہے۔اس قسم کا ایک فردِ وحید بھی ایک پوری امت شمار ہوسکتا ہے۔قرآن حکیم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تنہا ذات گرامی کو ایک پوری امت قرار دیا اور اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو رحمت للعالمین کے خطاب سے نوازا۔عزمِ محکم، مقصد کی لگن اور مضبوط کردار رکھنے والی شخصیات نے تاریخ میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے جو بسا اوقات پوری قوم کی مجموعی کاوشوں کی بدولت بھی ممکن نہیں تھے۔ایسی ہی شخصیت کی آرزو دل میں لئے علامہ اقبال پرسوز لہجے میں فرماتے ہیں:

؎ اے سوار اشہب دوراں بیا
اے فروغ دیدۂ امکاں بیا

اس قسم کی شخصیات سیاسی عمل سے نہیں بلکہ تربیتی اور تعلیمی عمل سے تیار ہوتی ہیں، اس لئے علامہ اقبال سیاسی علم پر تعلیمی عمل کو اور تعلیمی عمل پر تربیتی عمل کو ترجیح دیتے ہیں۔تربیتی عمل کے لئے وہ کسی روحانی شخصیت کی صحبت کو ضروری قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ انسان کی باطنی واردات پر براہ راست اثر انداز ہوکر ایمانی کیفیات کو تقویت پہنچاتی ہے۔

؎ کیمیا پیدا کن از مشت گلے
بوسہ زن بر آستان کاملے

چنانچہ وہ صوفیاء کرام کی ان تربیتی خدمات کو بھی تسلیم کرتے ہیں جو اپنی توجہ، نگاہ یا نظر سے انسان کے حاسہ مذہبی (Religious Experience) کی تسکین کے ذریعے اسے ایمان کی ایک بلند تر کیفیت یعنی لیطمئن قلبی کی نعمت سے مالا مال کرتے رہے ہیں۔علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اگرچہ اس وقت یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ایسا کیونکر ہوتا ہے لیکن ممکن ہے کہ علم نفسیات ترقی کرکے اس راز کو سمجھنے کے قابل ہوسکے۔

علامہ اقبال کو اس بات کا بھی قوی احساس ہے کہ اس دور کا انسان فکر محسوس (Concrete Thought) کا عادی ہونے کی وجہ سے تصوف کی ایک نئی تکنیک کا محتاج ہے جو اسے مراقبوں کی مشقت میں ڈالے بغیر اس کی روحانی بالیدگی کا سامان کردے۔ذکر کی ضرورت تو ہر دو

میں ناگزیر رہی ہے اور رہے گی کیونکہ قرآن کی تعلیمات کی رو سے ذکر کی اہمیت ہمیشہ کے لئے مسلم ہے لیکن فکر کے معاملے میں علامہ اقبال مراقبوں کو نہ صرف غیر ضروری بلکہ ان مراقبوں سے حاصل ہونے والے مکاشفات اور تجلیات کو غیر حقیقی اور توہماتی کرشمہ سازی قرار دیتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ محسوس کرتے ہیں۔

؎ بے تجلی زندگی رنجوری است
عقل مہجوری و دیں مجبوری است

؎ نمی گردد کہن افسانہ طور
کہ در ہر دل تمنائے کلیم است

تاہم ان کے نزدیک حاسہ مذہبی کی تسکین کے لئے حصول تجلیات کا جو طریقہ قرآن حکیم نے تجویز کیا ہے وہ تصوف کے مروجہ سلاسل کی ان ٹیکنیکوں سے بالکل مختلف ہے جو مجوسی کلچر (Magian Culture) کے زیر اثر پیدا ہوئے۔ دور حاضر کے انسان حاسہ مذہبی (Religious Experience) کی تسکین ''کائنات کی روحانی تعبیر'' سے کی جا سکتی ہے اور ہمیں یہی سبق حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی پہلی وحی میں دیا گیا تھا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ

یعنی علم کی ہر شاخ (یعنی سائنس) جو عالم خلق کے کسی بھی پہلو کی تشریح و تعبیر سے تعلق رکھتی ہے، ہمارے لئے ایک آئینہ خدا نما ہے جس میں تجلیات ربّ کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی تعلیمی نصب العین کو علامہ اقبال نے اپنے ایک مصرع میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کر دیا ہے جسے ہمارے تعلیمی نظام نے ابھی تک قبول نہیں کیا۔ ان کا یہ مضبوط موقف ہے کہ ؎

؎ خرد دیکھے اگر دل کی نگاہ سے
جہاں روشن ہے نور لا الٰہ سے

نیز جس سائنس میں لقائے رب کی تاثیر نہیں وہ کم بصری ہے اور ہمارے تعلیمی مقاصد کو پورا نہیں کرتی

؎ وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم

ڈاکٹر رفیع الدین فرماتے ہیں:

"اگر ہم مسلمانوں کے دینی، علمی اور سیاسی انحطاط کے اسباب کا تجزیہ کریں تو ان میں سب سے بڑا اور سب سے بنیادی سبب یہی نکلے گا کہ انہوں نے اپنی تعلیم کے لئے بے خدا سائنس کو اپنا لیا ہے لہٰذا اس سبب کے ازالہ سے ان کا انحطاط زائل ہوسکتا ہے اور قرآن کی پیشگوئیوں کے مطابق ان کے عالمگیر غلبہ کا راستہ ہموار کیا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلم قوم کا مقدر یہ ہے کہ وہ اپنی یونیورسٹیوں میں سائنسی علوم کی نصابی کتابوں میں خدا اور سائنس کا الحاق کر کے اپنے دینی جذبہ کا احیاء اور عقیدہ توحید کی نشر و اشاعت کا سامان کرے گی۔ دراصل ہمارے نظریہ حیات کے ممکنات کے اندر ہی اس بات کی شہادت موجود ہے کہ ہم مستقبل کے اس عالمگیر انقلاب کا باعث بنیں گے جس کی تمنا اقبال نے کی تھی۔"

اور علامہ اقبال کی یہ تمنا پوری ہونے میں ڈاکٹر رفیع الدین کو حد تک یقین تھا کہ وہ فرماتے ہیں:

"ہو نہیں سکتا کہ پاکستان ایک دینی ریاست تو بنے لیکن دین کی فلسفیانہ، حکیمانہ اور سائنسی توجیہ کو، جو فلسفہ کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے، کام میں نہ لائے اور اس فلسفہ کو اپنا نظریہ نہ بنائے۔ لہٰذا پاکستان وہ ملک ہے جہاں آئندہ کی عالمگیر ریاست کی داغ بیل ڈالی جا چکی ہے اور وہ زمانہ دور نہیں جب پاکستان کی نصابی کتب کے اندر خدا اور سائنس کے الحاق سے خودی کا علم اس قدر عام ہوگا کہ حاکم و محکوم کی مرضیوں کے درمیان مکمل وافقت ہوگی۔"

گویا حاکم و محکوم کی مرضیوں کے درمیان مکمل موافقت کا سیاسی مقصد بھی اسی صورت میں حاصل ہوگا جب ہماری نصابی کتب میں خدا اور سائنس کا الحاق کر دیا جائے گا۔ غرض علامہ اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین کے نزدیک نفاذ اسلام کا اولین مرحلہ نفوذ اسلام ہے جس کے لئے نظام تعلیم میں ایسی تبدیلی لانا ناگزیر ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں، کالجوں اور سکولوں میں سائنسی تعلیم خدا جوئی، خدا شناسی اور خدا رسی کا ذریعہ بن سکے اور یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے کہ سائنس کی نصابی کتابوں اور دوسری سائنسی تحریروں میں عقیدہ توحید کو سمو دیا جائے۔ اگر پاکستان کی

جنگ آزادی میں ہمارا نعرہ ''پاکستان کا مطلب کیا۔۔۔لا الہ الا اللہ'' تھا تو اس کا پہلا تقاضا یہ تھا کہ ہم خرد کو دل کی نگاہ سے دیکھنے کی تربیت دینے کا ایسا تعلیمی نظام وضع کرتے کہ ہماری نئی نسلیں آج زبان حال سے کہہ رہی ہوتیں: ''جہاں روشن ہے نور لا الہ سے'' تاہم ہماری غفلت شعاری کی وجہ سے اگر آج ''درحرم خطرے از بغاوت خرد است'' والی کیفیت ہوگئی ہے تو اس بغاوت کو فرو کرنے کا فقط یہی طریقہ ہے کہ ''ولایت عشق'' سے ''سپاہ تازہ'' فراہم کی جائے جو ہماری نئی نسلوں کو ''جنوں قباست کہ موزوں بقامت خرد است'' کا یقین دلا سکے اور ایسی درس گاہیں معرضِ وجود میں لائی جائیں جن کے بارے میں علامہ اقبال یہ امید رکھتے ہیں:

؎ گہے رسم و رہ فرزانگی ذوق جنوں بخشد
من از درس خرد منداں گریباں چاک می آئم

مختصراً یہ کہ اگر ہم نفاذ اسلام کے بارے میں مخلص ہیں تو ہمیں چاہیے کہ اس آیہ مبارکہ پر توجہ دیں جو نزول وحی کے اعتبار سے قرآن مجید کی پہلی آیت ہے:

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ

علامہ اقبال نے یقیناً اسی آیت سے ''کائنات کی روحانی تعبیر'' کا نکتہ اَخذ کیا ہے جو اس آیت کی نہایت دلنشیں تفسیر ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین، علامہ اقبال کے ان الفاظ سے ''نصابی کتب میں خدا کا سائنس سے الحاق'' مراد لیتے ہیں۔ درحقیقت یہ کام سائنس نگاری کا توحیدی اسلوب وضع کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔

'پہلا کام پہلے' کے اصول کا تقاضا یہ ہے کہ نفاذ اسلام کے سلسلے میں ہم اپنے کام کا آغاز اس اولین وحی کی روشنی میں کریں۔ لیکن ابھی تک ہم نے اس پہلے کام کا پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا۔ ہماری سیاست گزیدہ قوم کو جو نفاذ اسلام کے سیاسی نعروں سے مایوس ہوتی جارہی ہے، علامہ اقبال کی اس پکار پر توجہ دینی چاہئے جس میں کم از کم نفوذ اسلام کی ضمانت ضرور پائی جاتی ہے:

؎ خیز و نقش عالم دیگر بنہ
عشق را با زیرکی آمیز دہ

9 فکرِ اقبال میں اجتہاد کی اہمیت

ڈاکٹر شفیق عجمی

کی کتاب مقالات اقبال (مطبوعہ 2018ء) سے ایک باب

1988ء میں وطن عزیز پاکستان میں حکومتی تبدیلی کے ساتھ ہی بیشتر علمی اداروں کے سربراہوں کی تبدیلی بھی عمل میں آئی۔ اقبال اکادمی پاکستان میں پروفیسر شہرت بخاری (مرحوم) کو بطور ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ ان دنوں اکادمی کا دفتر ماڈل ٹاؤن کی ایک کوٹھی میں قائم تھا۔ بخاری صاحب ستر کی دہائی کے وسط میں گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز، لاہور میں راقم کے استاد تھے۔ وہ اردو اور فارسی کے شعبے کے استاد اور صدر تھے۔ وہ معروف شاعر بھی تھے۔ اور ان اصلاح لینے والے طلبا کی بڑی تعداد ہمیشہ ان کے اردگرد نظر آتی تھی۔ وہ نظم وضبط کے پابند تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ملازمت سے ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان کے رابطہ رہا۔ اسّی (80ء) کی دہائی میں وہ سخت سیاسی دباؤ کے شکار رہے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ کئی برسوں تک برطانیہ میں بھی مقیم رہے۔ اکادمی میں ان کے تقرر کے بعد ان سے ملاقات ہوئی۔ راقم ان دنوں بطور لیکچرار محکمہ تعلیم سے وابستہ تھا اور ایک یونیورسٹی سے ایم۔فل اقبالیات کی تکمیل میں مصروف تھا۔ اتفاق سے راقم کے نگران کار ڈاکٹر وحید عشرت بھی اقبال اکادمی سے وابستہ تھے۔

ایک روز بخاری صاحب کے ساتھ اپنی ملاقات میں راقم نے اقبال اور اجتہاد کے حوالے سے لکھا گیا اپنا مضمون مجلّہ ''اقبالیات'' میں اشاعت کے لیے پیش کیا۔ بخاری صاحب نے اسی وقت اسے جستہ جستہ پڑھ ڈالا اور اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر عشرت کو

بلا کر کہا کہ آئندہ ہفتے حلقہ اقبال کے ہونے والے ماہانہ اجلاس میں یہ مضمون پڑھا جائے گا اور ساتھ ہی ان کو ہدایت کر دی گئی کہ اجلاس کی صدارت ڈاکٹر یوسف گورائیہ صاحب فرمائیں گے، لہٰذا ان کو بھی مطلع کر دیجیے۔ اس سے پہلے کسی علمی مجلس میں اہل علم کے سامنے مضمون پڑھنے کا مجھے اتفاق نہ ہوا تھا اور وہ بھی ڈاکٹر گورائیہ جیسے سکالر کی صدارت میں جو اُن دنوں تواتر کے ساتھ اقبال اور اجتہاد کے حوالے سے لکھ رہے تھے اور علمی حلقوں میں DISCUSS بھی ہو رہے تھے۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ بخاری صاحب سے حیلے بہانے کیے، معذرت بھی کی، جسے انھوں نے مسترد کر دیا۔ لہٰذا مقررہ تاریخ پر حلقہ اقبال کے اجلاس میں حاضر ہو کر یہ مضمون پڑھنا پڑا۔ نہ صرف ڈاکٹر یوسف گورائیہ صاحب نے اجلاس کی صدارت کی بلکہ اپنی طویل صدارتی خطبے میں اجتہاد کے حوالے سے اقبال کے موقف اور عصر حاضر میں اس کی اہمیت پر پر مغز اور مدلل گفتگو کی۔

تقریب کے اختتام پر چائے پیتے ہوئے گورائیہ صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ آپ تو مضمون پڑھ کر صاف بچ نکلے اور اطمینان سے اپنی جگہ پر جا بیٹھے اور مجھے ایک لمبی تقریر بھی کرنا پڑی اور حاضرین کے سوالات کے جوابات بھی دینا پڑے۔ اس اجلاس میں انتظار حسین، سجاد رضوی اور کئی دوسرے ادیب اور دانشور بھی موجود تھے۔ انتظار حسین ان دنوں انگریزی روزنامہ فرنٹیر پوسٹ (FRONTIER POST) میں (POINT COUNTERPOINT) کے تحت کالم لکھا کرتے تھے۔ مذکورہ اجلاس کے حوالے سے انھوں نے بعنوان "OPENING DOORS" کالم تحریر کیا جو مورخہ 4 دسمبر 1990ء کی اشاعت میں شامل تھا۔

انتظار حسین نے اپنے کالم میں بخاری صاحب کی ان کاوشوں کو سراہا جو انھوں نے حلقہ اقبال کو اَز سرِ نو فعال بنانے کے لیے انجام دیں، بلکہ اس طرح سے دانشوروں اور محققوں کو اقبال کے حوالے سے علمی مکالمے کے لیے ایک مؤثر فورم بھی مہیا کیا۔

ذیل میں مذکورہ کالم سے دو اقتباسات درج کیے جاتے ہیں جن میں کالم نگار نے حلقہ اقبال کی بحث کو خوبصورتی سے سمو دیا:

"The article was written by Mr. Shafique Ajami, a lecturer from Government college Sheikhupura, who had attempted to determine the place of 'Ijtihad' in

Iqbal's thought. He referred to one of Iqbal's lecture wherein he has specifically discussed the "Principle of Movement in the Structure of Islam". The gowth of the democratic spirit and the establishment of legislative assemblies in Islamic countries were regarded by him as a progressive step. The writer quoted from different writings of Iqbal and concluded that he had advocated the 'Principle of Ijtehad' and favoured the right of Ijtehad to be delegated to parliament rather than to the religious ulema."

اس سے آگے وہ لکھتے ہیں:

"Dr. Muhammad Yusuf Goraya elaborated on what had been said by Shafique Ajami. He up held the 'principle of Ijtihad' and said that in fact the concept of the termination of the institution of Nabuwat had given birth to the doctrine of 'Ijtihad'".

یہ مضمون مجلّہ اقبالیات کے جنوری، مارچ 1993ء کے شمارے میں شائع ہوا جبکہ بخاری صاحب کی بجائے مجلّے کے مدیر پروفیسر محمد منور تھے۔ گزشتہ بیس بائیس برسوں کے دوران میں نہ صرف خطباتِ اقبال کے اردو تراجم منظرِ عام پر آئے، بلکہ خطبہ اجتہاد کی تسہیل و توضیح کے حوالے سے متعدد تصانیف بھی اس علمی سرمائے میں اضافے کا ذریعہ ثابت ہوئی ہیں۔

اس حوالے سے بنیادی نوعیت کا کام پروفیسر سعید شیخ کا ہے جنھوں نے برسوں کی دیدہ ریزی کے بعد خطباتِ اقبال: "Reconstruction of Religious thought in Islam" کی محشّٰی ایڈیشن مرتب کیا۔ خطبات اقبال کے حوالے سے کی جانے والی تحقیق، تنقید اور توضیح و ترجمہ کے لیے ایک مستند متن کی اشاعت بلاشبہ ایک تحقیقی کارنامہ ہے۔ دقیق علمی و فکری موضوع کے بموجب خطبات کا حلقہ محدود تر رہا ہے۔ لیکن شیخ صاحب مرحوم کے مرتبہ نسخے کی متعدد اشاعتیں اس کی مقبولیت اور فیض رسانی کی شاہد ہیں اور یقینی طور پر اسکالرز اور طلبہ اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔

خطبات کی تسہیل و تفہیم کے لیے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد اور اقبال

اکادمی پاکستان نے کئی مجموعے شائع کیے ہیں۔ اقبال کے تصور پر نامور سکالرز کے مقالات کو ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری نے 1988ء میں ''اقبال۔فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید'' کے عنوان سے پاکستان اسٹڈیز جامعہ کراچی سے شائع کیا۔ ڈاکٹر خالد مسعود نے اقبال کے تصورِ اجتہاد کے حوالے سے اردو اور انگریزی میں قابل قدر تحقیق کی ہے۔ اقبال اور اجتہاد اور "Iqbal's Reconstruction of Ijtihad" کے علاوہ ڈاکٹر ایوب صابر اور سہیل عمر کے مرتبہ مجموعہ مقالات ''علامہ اقبال کا تصور اجتہاد'' کا پہلا مقالہ بھی ڈاکٹر صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ جس میں اس موضوع پر ان کی بیشتر تحریروں کے حالات فکر سمٹ آئے ہیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے ''خطبات اقبال۔تسہیل وتفہیم'' میں بالخصوص خطبہ اجتہاد کا بنظر غائر جائزہ لیا ہے۔ خطبات اقبال کا پہلا اردو ترجمہ (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ) کرنے کا اعزاز اقبال کے معتمد ساتھی سید نذیر نیازی کو حاصل ہے۔ علمی حلقوں میں اس کا خیر مقدم بھی کیا گیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس پر مشکل اور دقیق ہونے کے اعتراضات بھی کیے گئے۔ شاید اسی کو جواز بنا کر خطبات کے اب تک کئی اردو تراجم کیے جا چکے ہیں۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے ''فکر اقبال'' کے آخر میں خطبات کا اردو خلاصہ بھی شامل کیا تھا جسے نامعلوم وجوہات کی بنا پر بعد میں حذف کر کے علیحدہ سے شائع کیا گیا۔ یہ خلاصہ محققین و مترجمین کے لیے بنیادی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ پروفیسر عثمان نے ''فکر اسلامی کی تشکیل نو'' کے عنوان سے خطبات کی ترجمانی یا تشریح کی۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے ''خطباتِ اقبال پر ایک نظر'' کے عنوان سے قرآن وحکمت کی روشنی میں اس کا مدلل جائزہ لیا ہے۔ اسی عنوان سے ایک کوشش پروفیسر شریف بقا کی بھی نظر آتی ہے۔ لیکن سید نذیر نیازی کے بعد خطبات کا مکمل اور باضابطہ ترجمہ پنجابی زبان وادب کے نامور محقق پروفیسر شریف کنجاہی نے ''مذہبی افکار کی تعمیر نو'' (1992ء) کے عنوان سے کیا۔ یاد رہے کہ کنجاہی صاحب نے خطباتِ اقبال کو پنجابی رُوپ میں بھی مؤثر طریقے سے ڈھالا ہے۔ شہزاد احمد نے ''اسلامی فکر کی نئی تشکیل (2000ء)، ڈاکٹر وحید عشرت نے ''تجدید فکریاتِ اسلام'' (2002ء) اور ڈاکٹر محمد آصف اعوان نے خطبات اقبال کو اردو میں ترجمہ کرنے کے علاوہ اس کا ایک تحقیقی توضیحی مطالعہ بھی ''معارف خطباتِ اقبال'' (2009ء) کے

عنوان سے پیش کیا ہے۔ متذکرہ بالا اقبال شناسوں نے فکر اقبال کے اس بنیادی مصدر خطبات اور اس کے مباحث کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

راقم نے اپنی علمی استعداد کے مطابق اس سرمائے کا جائزہ لے کر 1990ء کے اپنے مضمون کو Update کرنا ضروری خیال کیا۔ کیونکہ مضمون میں بعض حوالہ جات نامکمل تھے اور بعض جگہ ثانوی مآخذ پر انحصار کیا گیا۔

اسلامی فکر کی تاریخ میں علامہ اقبال کو ایک بلند مقام حاصل ہے اور ان کی اس فکری و عملی کاوشوں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہے گا۔ جو انھوں نے ایک محکوم مسلم معاشرے کی زبوں حالی پستی اور بے عملی کو ختم کرنے کے لیے عمر بھر سرانجام دیں۔ ایک آزاد اسلامی مملکت کے حصول کی صورت میں انھوں نے پورے عالم اسلام کی آزادی اور اسلامی اصولوں کی سربلندی کا جو خواب دیکھا تھا، وہ نہ صرف ان کی شعری وفکری تخلیقات کا مرکزی نقطہ تھا بلکہ خود ان کے لیے ایک حاصل حیات کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔

مسئلہ اجتہاد کی اہمیت علامہ اقبال کے نزدیک کیا تھی؟ اس کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مسئلہ ہمیشہ ان کے خصوصی غور وفکر کا مرکز رہا۔ اس حوالے سے انھوں نے اپنی معاصر دینی شخصیات سے گفت وشنید بھی کی اور خط و کتابت کے ذریعے سے بھی اس مسئلے کے متنوع پہلوؤں پر ان کے موقف سے آگاہی حاصل کی اپنا نقطہ نظر واضح کیا اور اس طرح سے خطبہ اجتہاد کے اساسی مباحث کو Outhline کیا۔

اسلامی فکر کی نئی تشکیل کے موضوع پر ان کے خطبات:

"RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM".

کا چھٹا خطبہ اسی موضوع پر دیا گیا جسے انھوں نے "PRINCIPLE OF MOVEMENT IN THE STRUCTURE OF ISLAM" کا عنوان دیا۔ جسے اقبال کے لفظوں میں اجتہاد کی مختصر ترین تعریف قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس خطبے میں اقبال نے اسلامی فکری تاریخ میں اجتہاد کی اہمیت اور معنویت کے بارے میں اپنے حاصلاتِ فکر کو بڑی خوبی سے بیان کر دیا ہے جس کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اجتہاد کیا ہے؟

اجتہاد کیا ہے؟

امام راغب اصفہانی کے نزدیک اجتہاد کے معنی ہیں کسی مشکل کام کے لیے اپنی پوری طاقت صرف کر دینا اور انتہائی جدوجہد سے کام لینا۔ فقہ کی اصطلاح میں اجتہاد سے مراد غور و فکر کے ذریعے کسی ایسے مسئلے کو حل کرنا ہے جس کے متعلق قرآن وسنت سے واضح احکام نہ ملتے ہوں۔ مختصراً ہم یوں کہہ سکتے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں عصرِ حاضر کے مسائل کے حل کے لیے کی جانے والی کوششوں کا نام اجتہاد ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اجتہاد قرآن وسنت کے فریم ورک کے اندر رہ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔

''فرہنگ اقبال'' کے مؤلف نے اجتہاد کے جو معنی بیان کیے ہیں وہ نہ تو لغوی کہے جا سکتے ہیں اور نہ ہی وہ اصطلاحی کے ذیل میں آتے ہیں، بلکہ یہ سراسر ان کی طباعی کا نتیجہ ہی ہو سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک اجتہاد معلوم باتوں کو خزانہ دماغ میں ترتیب دے کر نتیجے میں ایک نامعلوم بات اخذ کرنے کا عمل ہے۔ اپنی اس خود ساختہ تعریف کی وضاحت میں انھوں نے ''ضربِ کلیم'' کی نظم ''اجتہاد'' کا حوالہ دیا ہے جس میں ان کے نزدیک اقبال نے اشاروں اشاروں میں یہ کہا ہے کہ مسلمانوں میں اجتہاد کا دروازہ بند ہو جانے کی وجہ سے قرآن پاک اور شریعت کے مطالب مسخ ہوتے چلے جاتے ہیں اس لیے اجتہاد نہایت ضروری ہے۔

اقبال کے تصورِ اجتہاد کے حوالے سے ہمیں اس کے اصطلاحی یعنی فقہی معنی مطلوب ہیں۔ جسے غازی اجمیری کی ''مصطلحات'' بخوبی فراہم کرتی ہے۔ لفظ اجتہاد کے تحت انھوں نے لکھا ہے: ''جو کام شرعی مقصود ہو اس کے معلوم کرنے کے لیے قرآن وحدیث اور آثار میں غور وفکر، کاوش اور سعی بلیغ کے ذریعے دلائل اور ثبوت فراہم کرنا۔''

دراصل اقبال کے تصورِ اجتہاد کی تفہیم ان کے تصورِ حیات و کائنات کی تفہیم سے منسلک ہے جو انھوں نے قرآن سے اَخذ کیا ہے۔ ان کے نزدیک اسلام ایک ایسی تحریک ہے جو کائنات کے سکونی نظریے کو مسترد کرتی ہے۔ وہ نوعِ انسانی کی وحدت پر یقین رکھتے ہیں اور حیات کی اصل ان کے مطابق روحانی ہے، جسے وہ ذاتِ الٰہیہ بھی کہتے ہیں جو ایک قائم و دائم وجود ہے، جسے ہم تغیر و تبدل میں جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ اگر معاشرے کی اساس حقیقت الٰہیہ کے اس تصور پر مبنی ہے تو پھر اس

کے دونوں پہلوؤں یعنی ثبات اور تغیر کو قبول کرنا ہوگا۔ اقبال سوال کرتے ہیں کہ اسلام کی ہیئتِ ترکیبی میں وہ کون سا عنصر ہے جو اس کے اندر حرکت اور تغیر کو قائم رکھتا ہے۔ اس کا جواب ہے اجتہاد۔

"The word literally means to exert. In the terminology Islamic law it means to exert with a view to form an independent judgment on a legal question. "

اقبال اجتہاد کی اساس قرآن حکیم کی اس آیت کو قرار دیتے ہیں:

الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انھیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے۔

قرآنی استشہاد کے بعد اقبال اجتہاد کی مزید وضاحت کے لیے حدیث مبارکہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ روایت ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا عامل مقرر کیا تو فرمایا معاملات کا فیصلہ کیسے کرو گے؟ انھوں نے کہا: کتاب اللہ کے مطابق، لیکن اگر کتاب اللہ نے ان میں تمھاری رہنمائی نہیں کی تو پھر؟ پھر اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کے مطابق۔ لیکن اگر سنت رسول ﷺ بھی ناکافی ٹھہری تو؟ اس پر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا تو پھر میں خود ہی کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔

مولانا محمد طاسین نے اس حدیث مبارکہ سے درج ذیل نتائج اخذ کیے ہیں:

1۔ اجتہاد کا تعلق ایسے مسائل سے ہے جن کے بارے میں قرآن و سنت کے اندر واضح حکم موجود نہ ہو۔

2۔ اجتہاد کا اہل وہ شخص ہوتا ہے جو کتاب و سنت کے علم کے ساتھ ساتھ تفقہ فی الدین اور گہری سوجھ بوجھ بھی رکھتا ہو۔

3۔ اجتہاد نہ صرف شرعاً جائز ہے بلکہ مستحب اور واجب العمل ہے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف یہ کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو اس سے روکا نہیں بلکہ اس پر خوشی کا اظہار فرمایا۔

مذکورہ حدیث اور اس کے حاصل ہونے والے نتائج سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ایسے تمام خودساختہ فیصلے ذاتی تعبیریں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، جن کو بنیاد بنا کر اجتہاد کے دروازے کو بند قرار دیا جاتا ہے۔

2 ستمبر 1925ء کو صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام اپنے ایک مکتوب میں اسی مسئلے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابوحنیفہ کا نظریہ ناممکن ہے۔'' اسی مکتوب میں وہ مزید لکھتے ہیں: ''میری ناقص رائے میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جارہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔''

برصغیر کی اسی مخصوص تقلیدی فضا کے پس منظر میں انھوں نے ''اجتہاد'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی جو ''ضربِ کلیم'' میں شامل ہے اور جس کا حوالہ پہلے دیا جاچکا ہے۔

اجتہاد

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق
حلقہ شوق میں وہ جراتِ اندیشہ کہاں
آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

اقبال اپنی بصیرت سے بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لے رہے تھے اس لیے وہ یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ مذہب اسلام اس وقت زمانے کی کسوٹی پر پرکھا جارہا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ جہاں سائنسی ایجادات واکتشافات سے انسانی زندگی کے لیے آسائشیں پیدا ہوں گی وہیں اسے نت نئے پیچیدہ مسائل کا چیلنج بھی درپیش ہوگا۔ تقلید پرستی کی فضا میں ان مسائل کا حل ڈھونڈنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوکر رہ جائے گا۔ اس لیے کہ بدلتے ہوئے حالات میں درپیش مسائل کو صرف اصول اجتہاد ہی کے ذریعے حل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اجتہاد کے بارے میں مذہبی طبقے کے

خیالات سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود علامہ نے اجتہاد کی ضرورت کو پورے وثوق اور یقین کے ساتھ پیش کیا:

''مجھے اس امر کا بھی یقین ہے کہ جونہی فقہ اسلام کا مطالعہ غائر نگاہوں سے کیا گیا۔اس کے موجودہ ناقدین کی یہ رائے بدل جائے گی کہ اسلامی قانون جامع یا مزید نشو ونما کے ناقابل ہے۔ بد قسمتی سے اس ملک کے قدامت پسند مسلم عوام کو ابھی یہ گوارا نہیں کہ فقہ اسلامی کی بحث میں کوئی تنقیدی نقطہ نظر اختیار کیا جائے۔وہ بات بات پر خفا ہو جاتے اور ذرا سی تحریک پر بھی فقہ وارانہ نزاعات کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔''

اجتہاد کے حوالے سے ہونے والے مباحث میں اجتہاد کے ساتھ ساتھ رائے، قیاس، عقلیت اور تقلید جیسی اصطلاحات بھی زیر بحث آتی ہیں۔ ڈاکٹر خالد مسعود نے تفصیلی طور پر ان اصطلاحات کی وضاحت کی ہے جس کو اختصار کے ساتھ یوں پیش کیا جا سکتا ہے:

اجتہاد اور رائے

ڈاکٹر خالد مسعود نے اقبال کے تصور اجتہاد کی تفہیم کے لیے اس کا اسلامی تاریخ کے تناظر میں جائزہ لیا ہے۔ان کی رائے میں فقہ اسلامی کے آغاز میں اجتہاد کو ''رائے'' کے معنوں میں لیا گیا۔ یہ رائے قرآن اور سنت سے ملنے والی واضح دلیل کی عدم موجودگی میں غور فکر کے نتیجے میں دی جاتی تھی اور یہ رائے اس عالم کی دانست میں قرآن وسنت کے منشاء کے مطابق ہوتی تھی۔

اجتہاد اور قیاس

امام شافعی کے ہاں اجتہاد اور ''قیاس'' مترادف معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ ابتدائی دور میں ''قیاس'' عقلی طرزِ استدلال کا نام تھا۔ابن تیمیہ کے نزدیک فقہی قیاس منطقی قیاس سے قطعاً مختلف نہیں۔

اجتہاد اور عقلیت پسندی

دورِ اوّل میں اجتہاد عقلیت پسندی کے معنی میں معتزلہ کی تحریک کے دوران مستعمل ہوا اور دورِ جدید میں قدامت پسندی اور جدت پسندی کے ٹکراؤ کے نتیجے میں سامنے آیا۔

اجتہاد اور تقلید

اجتہاد اور تقلید کی اصطلاحیں باہم متضاد مفاہم کے طور پر سامنے آئیں۔ تقلید کے عمومی معنی سے قطع نظر نئے زمانے میں تقلید کے جو مفاہیم اُبھرے ہیں وہ جمود، عقل دشمنی، قدامت پسندی، رجعت پسندی وغیرہ کے ہیں۔ ''تقویت الایمان'' میں شاہ اسماعیل کا مؤقف یہ ہے کہ تقلید کے معنی یہ ہیں کہ ''بے دلیل کے دریافت کیے کسی کے حکم کو مان لینا اور یہ دریافت نہ کرنا کہ کس سبب سے یہ حکم تھا جو اکثر لوگ مولویوں اور درویشوں کو حاکم شرح جانتے ہیں۔ ایسی تقلید بدعت اور حرام ہے۔''

اصول اجتہاد کے مختلف پہلوؤں کے جائزے سے اجتہاد کی دو قسمیں سامنے آتی ہیں:

1۔ شخصی اجتہاد 2۔ اجتماعی اجتہاد

شخصی یا انفرادی اجتہاد کے علاوہ اجتماعی اجتہاد کی روایتیں بھی موجود ہیں۔ جن میں سے جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت کو متعدد جگہوں پر بیان کیا گیا ہے۔ جس کی رُو سے جناب علی رضی اللہ عنہ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ ''ہمیں ایسے اُمور کے بارے میں رہنمائی فراہم کریں جن میں قرآن وسنت سے واضح اشارہ نہیں ملتا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علماء اور عبادت گزار لوگوں سے مشاورت کرو اور شخصی رائے پر عمل نہ کرو۔'' گویا کسی مسئلے کے حل کے لیے اہل الرائے کا متفقہ طور پر کسی نتیجے تک پہنچنا بھی اجتہاد ہی کی ایک صورت ہے اور ایسے امور میں اجتماعی اجتہاد شخصی اجتہاد پر فائق ہوگا۔

اجتہاد کا حق

شخصی اجتہاد کی بجائے اجتماعی اجتہاد پر اصرار کی ایک بنیادی وجہ دورِ حاضر کے گوناگوں مسائل اور ان کی تکنیکی پیچیدگیاں بھی تھیں۔ علوم کی وسعت اور پھیلاؤ بھی اجتماعی دانش اور تدبر کے متقاضی ہیں۔ فقہی مکاتب کے اختلافات بھی اجتہاد کی راہ میں مانع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کسی مخصوص مذہبی گروہ کو اجتہاد کا حق دینے کے بجائے اسے ایک منتخب قانون ساز مجلس (پارلیمنٹ) کو تفویض کرنے کے حق میں ہیں۔

''بلادِ اسلامیہ میں جمہوری روح کا نشوونما اور قانون ساز مجالس کا بہ تدریج قیام ایک

بڑا ترقی کا قدم ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مذاہب اربعہ کے نمائندے جو سرِ دست ،فرداً فرداً اجتہاد کا حق رکھتے ہیں، اپنا یہ حق مجالس تشریعی کو منتقل کر دیں گے۔یوں بھی مسلمان چونکہ متعدد فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اس لیے ممکن بھی ہے تو اس وقت اجماع کی یہی مشکل ۔۔۔میرے نزدیک یہی ایک طریقہ ہے جس سے کام لے کر ہم زندگی کی اس روح کو جو ہمارے نظامات فقہ میں خوبیدہ ہے ازسرنو بیدار کر سکتے ہیں۔''

ترکی میں خلافت کے خاتمے اور اس منصب کے اختیارات کو فردِ واحد کی بجائے ایک منتخب شدہ مجلس (پارلیمنٹ) کو تفویض کر دیے جانے کو اقبال ''ترکوں کا اجتہاد'' قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''البتہ میرا خیال ہے کہ ترکوں کا یہ نقطہ نظر سرتاسر درست ہے۔اتنا درست کہ اس کی تائید میں کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔اس لیے کہ ایک تو جمہوری طرزِ حکومت، اسلام کی روح کے عین مطابق ہے۔ثانیاً اگر ان قوتوں کا بھی لحاظ رکھ لیا جائے جو اس وقت عالم اسلام میں کام کر رہی ہیں تو یہ طرزِ حکومت اور بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔''

اقبال کے خطبات بالعموم اور خطبہ اجتہاد بالخصوص ایک مذہبی گروہ ایک آنکھ میں کھٹکتا رہا ہے اور اس کی بنیادی وجہ وہی ہے جو زیر بحث خطبے میں اقبال کے حوالے سے سامنے آتی ہے اور جن کی رو سے اقبال اجتہاد کا حق ''عالمانِ کم نظر'' کو اور نہ ہی کسی بھی مذہبی گروہ کو دینے کی بجائے منتخب پارلیمنٹ کو تفویض کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ کبھی کف افسوس ملتے ہوئے اس امر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ کاش اقبال نے خطبات نہ لکھے ہوتے اور کبھی فقہ اسلامی سے اقبال کی عدم واقفیت پر رائے زنی کی جاتی ہے۔

اقبال کی وفات سے ستر برس بعد ملفوظات پر مبنی امالی کی دریافت اور انکشاف بھی انھی حضرات کا ''کارنامہ'' ہے جو اپنی DOMAIN میں اقبال کی آمد کو ناپسندیدہ تصور کرتے ہیں کیونکہ اقبال دین پر ان کی اجارہ داری اور AUTHORITY کو ہمیشہ چیلنج کرتے رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کی مجلس قانون میں نمائندگان کی اکثریت علم و فضل کے بجائے دولت و ثروت اور دوسرے سیاسی و انتخابی نعروں اور ہتھکنڈوں کے ذریعے منتخب ہونے والوں کی ہے۔لیکن اس قباحت کو ایک مسلسل سیاسی عمل کے ذریعے سے رائے دہندگان کی سیاسی

تربیت میں مثبت تبدیلیاں پیدا کر کے اور امیدواروں کے اوصاف اور اہلیت کا معیار مقرر کر کے ختم کیا جا سکتا۔ ماہرین فقہ کے ساتھ ساتھ جدید علوم وفنون سے آراستہ اہل فکر کی ایک جماعت بھی جو اجتہادی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو، ایسے امور میں مجلس قانون ساز کی معتمد معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ ملک میں پہلے سے آئینی طور پر قائم اسلامی نظریاتی کونسل کو زیادہ بہتر اور مؤثر بنانے کے لیے قانون سازی کی جا سکتی ہے۔ علامہ اقبال نے اجتہاد کا حق کسی مذہبی گروہ کی بجائے مجالس قانون ساز کو دینے کی تجویز پیش کی ہے تو وہ نا قابل عمل ہرگز نہیں۔

ہمارے کچھ مایوس دانشور سیاسی عمل کے تسلسل کی تجویز کو محض اس بنا پر مسترد کر دیتے ہیں کہ ہماری 67 سالہ سیاسی تاریخ کا ثمر ہماری موجودہ اسمبلیاں ہیں جن میں چند فیصد نمائندے بھی قانون سازی کے عمل میں کسی سنجیدہ CONTRIBUTION کے قابل نہیں، ایسے میں وہ اجتہاد کے تقاضوں کو کیونکر پورا کر پائیں گے؟

ہمارے یہ دانشور اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ ہماری قومی سیاسی تاریخ میں ہمارے طالع آزماؤں کی بار بار کی مہم جوئی کے نتیجے میں جمہوری سیاسی عمل کو پنپنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ جس کا نتیجہ موجودہ سیاسی کلچر کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک نے بجا طور پر معرف اسکالر سید حسین نصر کے ان خیالات کو ہدفِ تنقید بنایا ہے جن میں صرف علماء کو فقہی امور پر واحد اتھارٹی کا درجہ دیتے ہیں کہ وہ صدیوں سے یہ وظیفہ سرانجام دیتے چلے آئے ہیں۔ لہٰذا کسی اور کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا۔ ان کے نزدیک صرف علماء ہی اسلامی قانون کے CUSTODIAN ہیں۔ پروفیسر ملک سخت الفاظ میں سید حسین پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس میں شہنشاہیت کی وکالت کر کے انھوں نے سلاطین کی پرستاری کا حق ادا کیا ہے (یاد رہے کہ اس وقت شاہِ ایران کی سپاہِ دانش کے سپہ سالار تھے) اسی لیے وہ اسلامی قانون پر علما کی اجارہ داری کا اثبات کرتے ہیں۔ ان کا استدلال حرف ومعنی پر دو اعتبار سے ان علما کرام سے مستعار ہے جو اجتہاد پر اقبال کے تصورات کی نفی میں سرگرم عمل چلے آتے ہیں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی جنھوں نے خطبات کی اہمیت اور افادیت کا علمی سطح پر اعتراف بھی کیا ہے اور اس ضمن میں اقبال انسٹیٹیوٹ کشمیری یونیورسٹی سری نگر میں 1982ء میں

''خطبات اقبال پر ایک نظر'' کے عنوان سے تین عالمانہ خطبے بھی ارشاد فرمائے۔ انھوں نے اسلامی نقطہ نظر سے خطبات کا جائزہ لیتے ہوئے اقبال کے بعض دینی تصورات پر گرفت بھی کی ہے جو کہ ان کا حق ہے۔ لیکن اس کے علاوہ انھوں نے دیگر علماء کی پیروی میں اقبال پر اعتراض بھی کیا ہے کہ وہ فنی حیثیت سے اصول فقہ، اصول تفسیر اور اصول حدیث کا مطالعہ خاطر خواہ طور پر نہیں کر سکے تھے۔ اسی طرح فقہاء کے اختلافات اور ان کے اسباب پر حضرت شاہ ولی اللہ اور دیگر علما کی کتب کا براہِ راست مطالعہ نہ کر سکے تھے۔ اسی لیے خطبے میں دوسروں سے سن کر یا غیر مستند کتابوں سے پڑھ کر اسے نقل کر دیا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی، علامہ اقبال کی دردمندی خلوص اور محنت کے قائل ہیں اور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اقبال نے خطبات لکھ کر عصر حاضر کو اسلام کی حکمت اور حقانیت سے آشنا کیا ہے اور وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اقبال نے خطبات لکھ کر عصر حاضر کو اسلام کی حکمت اور حقانیت سے آشنا کیا ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ فقہی واجتہادی امور میں اپنی AUTHORITY کے حوالے سے کبھی کوئی دعویٰ نہیں کرتے۔ خود مولانا نے اپنے لیکچرز میں اقبال اور علامہ انور شاہ کشمیری کے حوالے سے جو واقعہ بیان کیا ہے۔ اس سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ عصر حاضر کے مسائل کی پیچیدہ نوعیت کے پیشِ نظر وہ تدوین فقہ کے لیے یہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ دینی امور اور جدید علوم کے ماہرین کی اجتماعی کاوشوں کے نتیجے ہی میں اس دینی پراجیکٹ کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

1978ء میں جب حضرت الاستاد مولانا محمد انور شاہ کشمیری نے انتظامیہ سے سخت اختلاف کے باعث دارالعلوم دیوبند سے استعفیٰ دے دیا تو علامہ نے بہت کوشش کی کہ شاہ صاحب لاہور تشریف لے آئیں۔ اسی دوران ایک روز میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دیوبند کا ذکر آیا تو علامہ نے فرمایا: ''میں شاہ صاحب کو لاہور اس غرض سے بلانا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک اس وقت اسلام کا سب سے اہم مطالبہ اور وقت کا بھی تقاضا یہ ہے کہ اسلامی قانون کی تدوین جدید کی جائے۔ میں خود یہ کام شروع کرنا چاہتا ہوں لیکن ظاہر ہے کہ میں خود تنہا یہ کام نہیں کر سکتا کیونکہ میں اسلامیات کا ماہر نہیں ہوں اور اس طرح شاہ صاحب بھی تنہا اس سے عہدہ

برآنہیں ہوسکتے، کیونکہ وہ جدید مسائل سے واقف نہیں ہیں۔اس لیے کام خاطر خواہ طریقے پر اسی وقت ہوگا جبکہ میں اور وہ دونوں ساتھ بیٹھ کر کام کریں گے''۔

علامہ کے اس اندیشے کو ردّ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ہمارے ہاں آج بھی ایسے اہل علم وفکر نہ ہونے کے برابر ہیں، جو انفرادی طور پر عصری مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے حل کرنے کی اجتہادی صلاحیت سے بہرہ وَر ہوں۔

فقہ اسلامی کے ماخذ

اقبال نے خطبہ اجتہاد میں فقہ اسلامی کے چاروں مآخذ (1۔قرآن 2۔حدیث 3۔اجماع 4۔قیاس) پر مختصر مگر مدلل اور جامع بحث کی ہے جس کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

قرآن

قرآن اسلامی قانون کا اوّلین مآخذ ہے لیکن یہ قانونی ضابطوں کا کوئی مجموعہ نہیں بلکہ اس کی حکمت یہ ہے کہ ذہن انسانی میں اس تعلق کا جو اُسے کائنات اور خالق کائنات سے ہے بہتر شعور پیدا کرے۔قرآن کا نظریہ حیات جمود پر نہیں بلکہ حرکت اور ارتقاء پر مبنی ہے۔جس میں حفظ و ثبات کا ایک عنصر بھی موجود ہے، جو ایک طرف اس کو ماضی سے منسلک کرتا ہے اور دوسری طرف اسلام کی لاجغرافیائی حیثیت کی بدولت مستقبل میں متشکل ہونے والی وحدت انسانی کی صورت گری کرتا ہے۔قرآنی اصول وقونین جامد نہیں بلکہ فکر انسانی کو وسعت اور رواداری سے ہمکنار کرتے ہیں۔اسی کے باوصف فقہائے متقدمین نے متعدد مکاتب فکر قائم کیے جو قوانین اسلام کی نشو وارتقاء کی دلیل ہیں۔

تغیراتِ زمانہ اور علوم کے غیر معمولی پھیلاؤ کی بدولت عالم اسلام نئی نئی قوتوں سے متاثر ہو رہا ہے۔قرآن کے نزدیک زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے، لہٰذا مذاہب فقہ کی تعبیرات کو کیونکر حرفِ آخر قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی حددرجہ قدامت پسندی کے سبب عدالتیں فیصلے کرتے ہوئے مذاہب فقہ تک محدود ہیں۔نتیجتاً انسان بدل رہا ہے مگر قانون ساکت وجامد کھڑا ہے۔

حدیث

اسلامی قوانین کا دوسرا بڑا مآخذ احادیث نبویؐ ہے۔ جو ہر زمانے میں موضوع بحث رہا

ہے۔ گولڈ زیہر (GOLD ZIHER) اور اس قبیل کے دوسرے مستشرقین نے احادیث کی صحت اور عدم صحت پر سوالات اٹھائے ہیں۔ تدوین فقہ کے وقت ذخیرۂ احادیث کو ان احادیث سے الگ رکھا جائے جن کا قانون سے تعلق نہیں۔ امام ابوحنیفہ کے بارے میں اقبال کی رائے یہ ہے کہ چونکہ وہ اسلام کی عالمگیر نوعیت کو بخوبی سمجھتے تھے، اسی لیے انھوں نے استحسان یعنی فقہی ترجیح کا اصول قائم کیا۔ امام صاحب نے نہ صرف احادیث کو ایک آخذ کے طور پر قبول کیا بلکہ اس ضمن میں ان کا طریق کار احتیاط اور سخت چھان پھٹک پر مبنی رہا۔

اِجماع

اقبال کے نزدیک فقہ اسلامی کا تیسرا آخذ اجماع، اسلام کے قانونی تصورات میں سب سے اہم، لیکن عملی طور پر ایک تصور سے آگے بڑھ کر دنیائے اسلام میں ایک مستقل ادارے کی حیثیت اختیار نہ کرسکا۔ کیونکہ خلافت راشدہ کے بعد مطلق العنانیت کا مفاد اسی میں تھا کہ اجتہاد ایک ادارے کی حیثیت اختیار کر کے ان کے اقتدار کے لیے خطرہ نہ بن سکے۔ اقبال دنیا میں نئی اُبھرتی ہوئی قوتوں سے پراُمید ہیں اور بلادِ اسلامیہ میں قانون ساز مجالس کے بتدریج قیام کو ایک ترقی پسند قدم قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ حق اجتہاد اس طرح سے مذاہب اربعہ کے نمائندوں سے پارلیمان کا منتقل ہوجائے گا۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں منقسم ہونے کی وجہ سے اجماع کی یہی صورت ممکن نظر آتی ہے اور جس کے ذریعے سے قوانین اسلامی میں پوشیدہ حکمتوں کو ازسرنو بیدار کیا جاسکتا ہے۔

قیاس

اسلامی قانون سازی میں قیاس کو چوتھے آخذ کی حیثیت حاصل ہے، جس کی تعریف کرتے ہوئے اقبال نے اسے ''مماثلتوں کی بنیاد پر استدلال سے کام لینا'' بنایا ہے۔ فتوحات کے نتیجے میں جو ممالک اسلام کے زیرنگین آئے وہاں کے مخصوص اجتماعی اور زرعی حالات میں جب محسوس ہوا کہ احادیث میں مذکور نظائر سے رہنمائی حاصل نہیں ہورہی تو پھر حنفی فقہاء نے قیاس کا راستہ اختیار کیا۔ اقبال نے قیاس کے مسئلہ پر حنفی اور شافعی فقہاء کے اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے اسے عراقی وحجازی یا استخراجی واستقرائی طریق کا نزاع قرار دیا ہے۔ بہرحال فقہائے متقدمین کی یہی بحثیں تھیں جو قیاس کی حدود اور دیگر متعلقات کے یقین میں معاون ثابت ہوئیں۔

نتیجتاً جس قیاس کو ابتدا میں مجتہدین کی ذاتی رائے سمجھا جاتا تھا وہ بالآخر شریعت اسلامیہ کے لیے حرکت اور زندگی کا سرچشمہ بن گیا، یعنی اصول فقہ کی تعبیر و ترجمانی میں زندگی کے حقیقی تنوع اور حرکت کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔

امام شافعی کے نزدیک قیاس کا دوسرا نام اجتہاد ہے۔ اسی لیے وہ سمجھتے ہیں کہ نصوصِ قرآنی کے اندر رہتے ہوئے اس سے کام لینے کی آزادی ہونی چاہیے۔ کیونکہ بقول قاضی شوکانی بیشتر فقہاء اس امر کے قائل تھے کہ حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے دوران بھی قیاس سے کام لینے کی اجازت تھی لہٰذا یہ کہنا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے محض ایک افسانہ ہے۔

اقبال کا اصرار ہے کہ فقہ اسلامی کی تشکیل نو میں جرأت سے کام لینے کی ضرورت ہے لیکن یہ محض زمانے کے احوال و ظروف سے مطابقت پیدا کرنا نہیں بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ اہم کام ہے۔ اقبال نے عصری تاریخ سے دو اہم مظاہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اوّلاً یورپ کی جنگ عظیم جس نے عالم اسلام کے مستحکم ترین عنصر ترکی میں بقول ایک فرانسیسی اسکالر (آندرے سروئیر ANDRE SERVIER سعید شیخ) بیداری کی لہر دوڑا دی ہے۔ ثانیاً اسلامی ایشیا کے حوالی میں ہونے والے معاشی تجربے (مترجم خطبات، سید نذیر نیازی کے بقول اشتمالی روس) کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اسلام کا معنی و منشا اور اس کی تقدیر فی الحقیقت کیا ہے؟ اقبال نے خطبہ اجتہاد کے آخر میں جس اہم ترین نقطے کی طرف ہماری توجہ مبذول کرنے کی کوشش کی ہے وہ اسلام کی حقیقی غرض و غایت ہے۔ جسے اقبال روحانی جمہوریت (SPIRITUAL DEMOCRACY) کا نام دیتے ہیں اور جس کے حصول اور تکمیل کی اجتماعی جدوجہد ہمارا مقصود منتہا ہونا چاہیے۔

جمود کے اسباب

علامہ اقبال نے خطبہ اجتہاد میں ان اسباب سے بھی گفتگو کی ہے جو فکری جمود کا باعث بن گئے۔ انھوں نے بعض مغربی محققین کے ان خیالات سے اتفاق نہیں کیا جن کی رُو سے ترکی اثرات بھی اسی ذہنی روش کا سبب بنے اس لیے کہ ترکی اثرات کے ظاہر ہونے سے صدیوں پہلے مذاہب فقہ قائم ہو چکے تھے۔

علامہ کے نزدیک معتزلہ کی عقلی تحریک بھی اس طرزِ فکر کا ایک بڑا سبب بنی کیونکہ انھوں

نے بعض ایسے احساس معاملات پر بحثوں کا آغاز کیا جن کی براہِ راست زد بنیادی عقائد پر پڑتی تھی یا پھر ایسا سمجھ لیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ اپنے عقائد پر سختی سے کاربند ہوتے چلے گئے اور ہر پرخلوص کوشش کو بھی انھوں نے مشکوک انداز میں دیکھنا شروع کر دیا، جو اسلام کے فکری اور اجتہادی سرمائے میں اضافے کا سبب بن سکتی تھی۔

دوسرا رہبانی تصوف تھا جو غیر اسلامی اثرات کے تحت پروان چڑھا اور اس روش کا محرک بنا۔ علامہ کے نزدیک مذہبی نقطہ نگاہ سے یہ ایک بغاوت تھی جو فقہائے متقدین کی لفظی حیلہ تراشیوں کے خلاف پیدا ہوئی اور جس نے مسلمانوں کے بہترین دل و دماغ اپنی طرف کھینچ لیے جو بالآخر اسی میں جذب ہو کر رہ گئے۔ اس ضمن میں اقبال نے جناب سفیان ثوری کی مثال پیش کرتے ہیں، جن کا شمار اپنے عہد کے بہترین قانونی دماغوں میں ہوتا تھا اور قریب تھا کہ وہ ایک نئے فقہی مذہب کو لیکر آگے بڑھتے، لیکن غلبہ روحانیت کی وجہ سے وہ خشک فقہی مباحث سے بددل ہو گئے اور تصوف اختیار کر لیا۔

تیرھویں صدی کے وسط میں تاتاری حملوں نے مسلمانوں کے علوم وفنون کے سب سے بڑے اور اہم مرکز بغداد کو برباد کر کے رکھ دیا۔ یہ ایک ایسا ہولناک سانحہ تھا جس نے اسلامی سلطنت کی بنیادیں متزلزل کر دیں۔ یہاں تک کہ مؤرخینِ اسلام کے مستقبل کو مایوس نظروں سے دیکھنے لگے۔ ان حالات میں فقہائے متقدمین کے چھوڑے ہوئے سرمائے میں اضافے کی تدبیر تو کیا ہوتی، اس کو محفوظ کر لینا ہی اصل فرض سمجھ لیا گیا۔ اسی حد سے بڑھی ہوئی احتیاز پسندی نے تقلید کی جڑوں کو مضبوط بنایا۔ علامہ نے ان رویوں کو تجزیہ کرتے ہوئے جو فکر انگیز نتیجہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے، وہ آٹھ دہائیوں سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی فکری بحرانوں میں رہنمائی کا فریضہ ادا کر سکتا ہے اور وہ یہ کہ اگر قوم کے زوال وانحطاط کو روکنا ہے تو اس کا یہ طریق نہیں کہ ہم اپنی گزشتہ تاریخ کو بے جا احترام کی نظر سے دیکھنے لگیں یا اس کا احیاء خود ساختہ ذرائع سے کریں۔ اس کے بعد علامہ نے اپنے کسی ہم عصر مفکر کا نام لیے بغیر اس کا یہ قول نقل کیا ہے:

"The verdict of history, as a modern writer has happily put it, is that worn-out ideas have never risen to power among a people who have worn them out."

یعنی تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جن فرسودہ خیالات کو خود کسی قوم نے مسترد کر دیا ہو ان کا احیاء اس قوم میں پھر نہیں ہو سکتا۔

اجتہاد تاریخ اسلام میں

اجتہاد کے حوالے سے جو بنیادی اصول ہمیشہ خلفاء و فقہاء کے پیش نظر رہا وہ یہی تھا اور جسے ڈاکٹر صبحی محمصانی نے جمہور فقہاء کے متفقہ اُصول کی روشنی میں بیان کیا ہے کہ اگر قرآن وسنت کا کوئی حکم دین و عبادت کے متعلق ہے تو وہ قیامت تک کے لیے ہے اور ان ضابطوں میں نص کے حکم کی اطاعت لازمی ہے اور زمان و مکان اور حالات کی تبدیلی کا کوئی اثر اُن پر نہ ہوگا لیکن معاملات دنیاوی سے متعلق جو احکام ہیں ان کے مقاصد معقول ہیں۔ کیونکہ وہ لوگوں کو نفع پہنچانے اور انھیں نقصانات سے بچانے کے اصول پر مبنی ہیں۔ فروعی مسائل میں تبدیلی کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ احکاماتِ دنیاوی سے متعلق اصول ہے کہ اس کا منشا و مفہوم اور اس کے اسبابِ عمل پر غور و فکر کیا جانا چاہیے۔ مقاصد شریعت کے بارے میں ابن القیم کا قول سب سے بہتر ہے کہ جس کے مطابق شریعت کی بنیاد حکمتوں اور لوگوں کی دنیاوی واُخروی فلاح و بہبود پر ہے اور شرع کل کی کل انصاف ہے، سراسر رحمت و حکمت ہے۔ پس جس مسئلے میں انصاف کی بجائے ظلم ہو، رحمت کی بجائے زحمت ہو، فائدے کی بجائے نقصان ہو اور عقل کی بجائے بے عقل ہو، وہ شریعت کی مسئلہ نہیں چاہے اسے بذریعہ تاویل شرع داخل کر لیا گیا ہو۔

ڈاکٹر محمعانی نے بعض خلفاء آئمہ اور فقہائے اسلام کے ایسے فیصلوں کے حوالے بھی دیے ہیں، جہاں تغیر و تبدل، زمانی و مکانی کے پیش نظر بعض قانونی نظائر یا ان کے کسی حصے کو جزوی طور پر تبدیل کر دیا۔ قرآن حکیم میں صدقات میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ رکھا گیا ہے۔ رسول ﷺ اور عہد صدیقی میں اس پر برابر عمل ہوتا رہا۔ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے موقوف کر دیا۔ مولفۃ القلوب وہ لوگ تھے جنھیں نبی کریم ﷺ اس لیے خیرات دیا کرتے تھے کہ ان کی دلجوئی ہو سکے اور اسلام پر قائم رہیں۔ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو طاقتور بنا دیا ہے اور تم سے بے نیاز کر دیا ہے پس اگر تم اسلام پر قائم رہو تو تمھارے لیے بہتر ہے ورنہ ہمارے اور تمھارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قحط کے سال میں

لوگوں کی ضرورت اوران کی بقاء کے پیش نظر چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا کو موقوف کر دیا اور اسی پر فقہاء کا اجماع ہے اسی طرح قرآن مجید میں صاف حکم ہے کہ مسلمان، کتابیہ یعنی یہودی اور عیسائی خواتین کے حسن و جمال کے باعث ان سے نکاح کر سکتے ہیں، لیکن خلافت فاروقی میں رومی خواتین کے حسن و جمال کے باعث ان سے نکاح کا رجحان بڑھ گیا تھا۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے اس کی ممانعت فرمادی۔ لوگوں نے کہا مگر قرآن میں تو یہ جائز ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہاں شرعاً اب بھی جائز اور مباح ہے لیکن اگر تم لوگوں میں رومی عورتوں سے نکاح رچانے کا رجحان اسی طرح بڑھتا رہا تو دوشیزگانِ عرب کا انجام کیا ہوگا؟ اسی لیے میں حکماً اسے ممنوع قرار دیتا ہوں۔

خلفائے راشدین کے عہد میں اجتہادی فیصلوں کی ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ جن میں سے صرف چند پر ہی اکتفا کیا گیا ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے بعد ان کے قریب ترین اصحاب بھی جب مستند خلافت پر فائز ہوئے تو اجتہاد کی اہمیت کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اپنے فیصلوں میں اسے ایک رہنما اصول کی حیثیت دی، جس کے دُور رَس اثرات بعد کے آنے والے زمانوں پر بھی مرتب ہوئے۔

اسلام کی عالمگیر تحریک کو سب سے زیادہ نقصان ملوکیت سے پہنچا۔ علامہ کے نزدیک اسلام، حدیث، اخوت اور مساوات سے عبارت ہے۔ ایک آزاد مسلمان ہی صحیح معنی میں مسلمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ترکی نے پارلیمان کے قیام کو خوش آئندہ قرار دیا، وہ ترکوں کے اجتہاد کو سراسر درست قرار دیتے ہیں جس کی تائید میں کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

برصغیر میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے اقتدار کے نکلتے ہی ان کے فکری زوال کا بھی آغاز ہوگیا۔ ان حالات میں شاہ ولی اللہ کے مجتہدانہ کردار نے معاشرتی برائیوں کے خاتمے میں رہنمائی فراہم کی۔

1857ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد بالخصوص مسلمانوں کے لیے ایک سخت آزمائش کا زمانہ آیا۔ جب ان کو معاشی مفادات کے ساتھ ساتھ اپنے عقائد کے تحفظ کی فکر بھی دامن گیر ہوئی۔ وہ سیاسی محکومی کے ساتھ ساتھ ذہنی پسماندگی اور مایوسی کے بھی شکار تھے۔ جب سید احمد خاں ایک ایسے رہنما کے طور پر ان کی مدد کے لیے آگے آئے، جنھوں نے خوف و ہراس کی

فضا میں ان کے اعتماد کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ بلکہ زمانے کی رفتار کا ساتھ دینے کے لیے ان کو جدید علوم کے حصول کی بھی دعوت دی۔ سر سید ایک باعمل انسان تھے اور عملِ پیہم اور بے لوث جدوجہد پر یقین رکھتے تھے۔ مسلمانانِ برصغیر کی زندگی کا کوئی اہم پہلو ایسا نہ تھا، جس میں انھوں نے بھرپور رہنمائی کا فریضہ ادا نہ کیا ہو۔ انھوں نے تقلید پرستی کی زبردست مخالفت کی اور مسلمانوں کو عصر حاضر کے چیلنج کو قبول کر کے آگے بڑھنے کا درس دیا۔ سید احمد خاں کی اس تحریک کو علامہ اقبال نے ایک عظیم جدوجہد میں تبدیل کر دیا۔ جسے محمد علی جناح کی مدبرانہ قیادت نے تکمیل تک پہنچایا اور اس طرح سے برصغیر میں ایک آزاد اسلامی مملکت کا قیام ممکن ہو سکا۔

عصر حاضر میں اجتہاد طلب مسائل

بیسوں صدی کی مسلم ورلڈ میں اقبال وہ واحد ایسے مفکر اور رہنما ہیں جنھوں نے نہ صرف اجتہاد کی اہمیت کو سمجھا بلکہ سامراجی عزائم کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے بعض مغربی اسکالرز (مستشرقین) کے اس متعصّبانہ اعتراض پر کہ فقہ اسلامی جمود کی شکار ہے۔ اجتہاد کو ہیئت اسلامی میں اصولِ حرکت کی حیثیت سے پیش کیا۔

یہ درست ہے کہ اقبال نے اپنے لیکچر میں اپنے عہد کے اہم اجتہاد طلب مسائل کی کوئی فہرست پیش نہیں کی لیکن مسئلہ اجتہاد پر اس قدر زور دینے کا مقصد ہی یہ تھا کہ اجتہاد کی اہمیت کو نہ صرف سمجھا جائے بلکہ اس کو ایک رہنما اصول کے طور پر مسائل کے حل میں جگہ دی جائے تاکہ اسلام کی حکمتوں سے معاشرے میں رہنمائی اور آسانی فراہم ہو سکے۔

آج کی اسلامی دنیا سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر کئی طرح کی پیچیدگیوں کی شکار ہے۔ چند ممالک کو چھوڑ کر بیشتر اسلامی ممالک پر آمرانہ طرزِ حکومتیں مسلط ہیں۔ اسی آمرانہ تسلط کا نتیجہ ہے کہ علوم وفنوں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی حیرت انگیز بیسویں صدی میں ان ممالک نے کوئی بڑا مفکر یا سائنس دان پیدا نہیں کیا۔

بعض مغربی طاقتوں کا سامراجی کردار اور ایشیا میں بالخصوص مسلم ورلڈ کو سیاسی اور معاشی طور پر عدمِ استحکام سے دوچار کر دینے والی عوامی دشمن پالیسیاں یقیناً قابل مذمت ہیں لیکن جدید علوم کے حصول کی دوڑ میں ہمارا تذبذب اور ناقابل فہم رویہ سامراجی ممالک کی پالیسیوں سے کہیں

زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہوا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ تقلید اور تنگ نظری کے دائرے سے نکل کر فکر و تدبر کی شاہراہ پر گامزن ہونے سے گریز کی پالیسی کا ناگزیر نتیجہ اسلامی حکمتوں سے محروم معاشروں کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ جہاں حریت، اخوت اور مساوات کے اصولوں کی کوئی روشنی اور عملداری نظر نہیں آتی۔ اقتدار کی رسہ کشی ہر صورت میں اقتدار قائم رکھنے کے لیے سامراجی طاقتوں کی کاسہ لیسی اور غلامی جیسی لعنتوں کی وجہ سے نہ جمہوری سوچ پروان چڑھی اور نہ ہی اجتہادی کلچر کو فروغ حاصل ہوا البتہ نام نہاد جہادی کلچر زور پکڑتا چلا گیا۔ سرمایہ دارانہ مغربی جمہوریت کو ایک سیاسی طرزِ حکومت کے طور پر اقبال نے کبھی بھی ذہنی طور پر قبول نہ کیا۔ اگر وہ اس کو قبول کرتے بھی ہیں تو صرف اس لیے کہ یہ ان کے تصورِ روحانی جمہوریت (SPIRITUAL DEMOCRACY) کی ایک جزوی تعبیر ہے اور روحانی جمہوریت ان کے لیے ULTIMATUM OF ISLAM ہے۔

آج بطور ایک ایک طرز فکر و سیاست کے جمہوری سیاسی نظام کو اس کی خامیوں سمیت ایک مقبول اور مثالی سیاسی نظام قرار دیا جاتا ہے اور اس کا ایک ثبوت یہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ طاقت کے زور پر اقتدار پر قابض ہونے والے غیر جمہوری حکمران بھی اپنی حکومتوں کو جمہوری ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا پورا زور صرف کر دیتے ہیں۔ جمہوریت کے بالمقابل اسلامی طرزِ حکمرانی کے حوالے سے کوئی اجتہادی کاوش نظر آتی۔ البتہ ہمارے یہاں جمہوریت کو مغربی اور سیکولر نظام قرار دے کر مسترد کر دینا ایک مخصوص ذہنیت کا عمومی رویہ ہے۔ آج مسلم ممالک کے اندر ایسی انتہا پسندانہ تنظیمیں بھی متحرک ہیں جو جمہوریت کو اک کافرانہ نظام قرار دیتی ہیں۔ لیکن اس کے بالمقابل کوئی ایسا متبادل پیش نہیں کر سکی ہیں جس کا دینی سطح پر CONSENSUS ہو۔

خوارج اور سبائی فدائین کی طرز پر کام کرنے والی تنظیمیں دین کے نام پر خودکش حملوں کو جائز سمجھتی ہیں۔ ان کا دائرہ عالمی اور قومی سطح تک پھیلا ہوا ہے لیکن کئی حوالوں سے غیر معین بھی ہے۔ اسلئے اب تک ہزاروں نہتے اور بے گناہ شہری ان کی دہشت گردی کے شکار ہو چکے ہیں۔ وہ مذہب کا علم تھامے ہوئے ہیں لیکن پبلک مقامات کے علاوہ عبادت گاہیں اور مزارات بھی ان کی دست برد سے محفوظ نہیں۔ انفرادی حیثیت میں علماء ان خودکش حملوں کو حرام قرار دے چکے ہیں لیکن

یہ مسئلہ اجماعِ امت کے ذریعے ہی مؤثر طور پر حل ہوسکتا ہے۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ بربادی کی ان قوتوں کو معاشرتی سطح پر ایک حلقہ حمایت کا تعاون بھی حاصل ہے۔ گو وہ حلقہ محدود ہے لیکن وہ مذہب کے نام پر ان کے لیے فنڈ بھی اکٹھے کرتا ہے اور ان کی تائید کے لیے ہر قسم کے پروپیگنڈے کو جائز سمجھتا ہے۔ خودکش حملہ آوروں کی حکمت عملی کو بعض ماہرین نے:

"POWER OF THE POWERLESS AND POWERLESSNESS OF THE POWER FULL" کے احوال سے منسلک کیا ہے۔ وہ عالمی آقاؤں اور ان کے مسلط کردہ کٹھ پتلی حکمرانوں کے مظالم کو اپنے خودکش حملوں کی وجہ سے قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان خودکش حملوں کی زد میں آنے والے معصوم ہم وطن کس کے مظالم کے شکار ہو رہے ہیں؟ کیا یہ سنگین مسئلہ اجتہادی توجہ حاصل نہیں کرسکتا؟

معاشی سطح پر قومی وسائل کی منصفانہ تقسیم اور قومی مفادات میں اس کا استعمال خصوصاً جب ملک کی نصف سے زائد آبادی جو سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور جس کے بارے میں اقبال کا تجزیہ یہ ہے کہ غریبی قوائے انسانی پر ایسے برے اثرات مرتب کرتی ہے کہ اس کا آئینہ روح زنگ آلود ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اخلاقی اور تمدنی طور پر اس کا وجود عدم برابر ہو جاتا ہے۔ اقبال کے دل سے یہ آہ بھی نکلتی ہے کہ کیا ہر فرد مفلسی کے عذاب سے آزاد نہیں ہوسکتا؟ کیا گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں صفحہ عالم سے کبھی مٹ نہیں سکتیں؟ ریاست کی ذمہ داری نہیں کہ ان کے حیاتی تحفظ اور عزتِ نفس کی بحالی کے لیے نظامِ زکوٰۃ کی برکات کا رُخ ان کی طرف پھیر دے۔

غربت و افلاس کے خاتمے، سود اور ربا کی حرمت، بینکوں کی بچت اسکیمیں، جی پی فنڈ پر ملنے والا منافع، بیواؤں اور پنشنرز کے ماہانہ اکاؤنٹ، انسانی زندگی بچانے کے لیے اعضاء کا عطیہ اور اعضاء کی پیوند کاری، خاندانی منصوبہ بندی، عائلی قوانین کے متنازعہ پہلو اور دیگر سینکڑوں اجتہاد طلب مسائل ادارہ اجتہاد کی توجہ کے طالب ہیں۔ لیکن ادارہ اجتہاد کہاں ہے؟ کب قائم ہوا یا کب قائم ہوگا؟

بمنزل کوش مانندِ مہ نو

دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر

بحق دل بند و راہِ مصطفیٰؐ رو!

نئے چاند کی طرح منزل کی کوشش کرو۔ اس نیلی فضا میں ہر دم آگے بڑھتے رہو۔ اگر تم اس جہاں میں اپنا مقام حاصل کرنا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ سے دل لگاؤ اور مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر چلو۔

(علامہ اقبال)

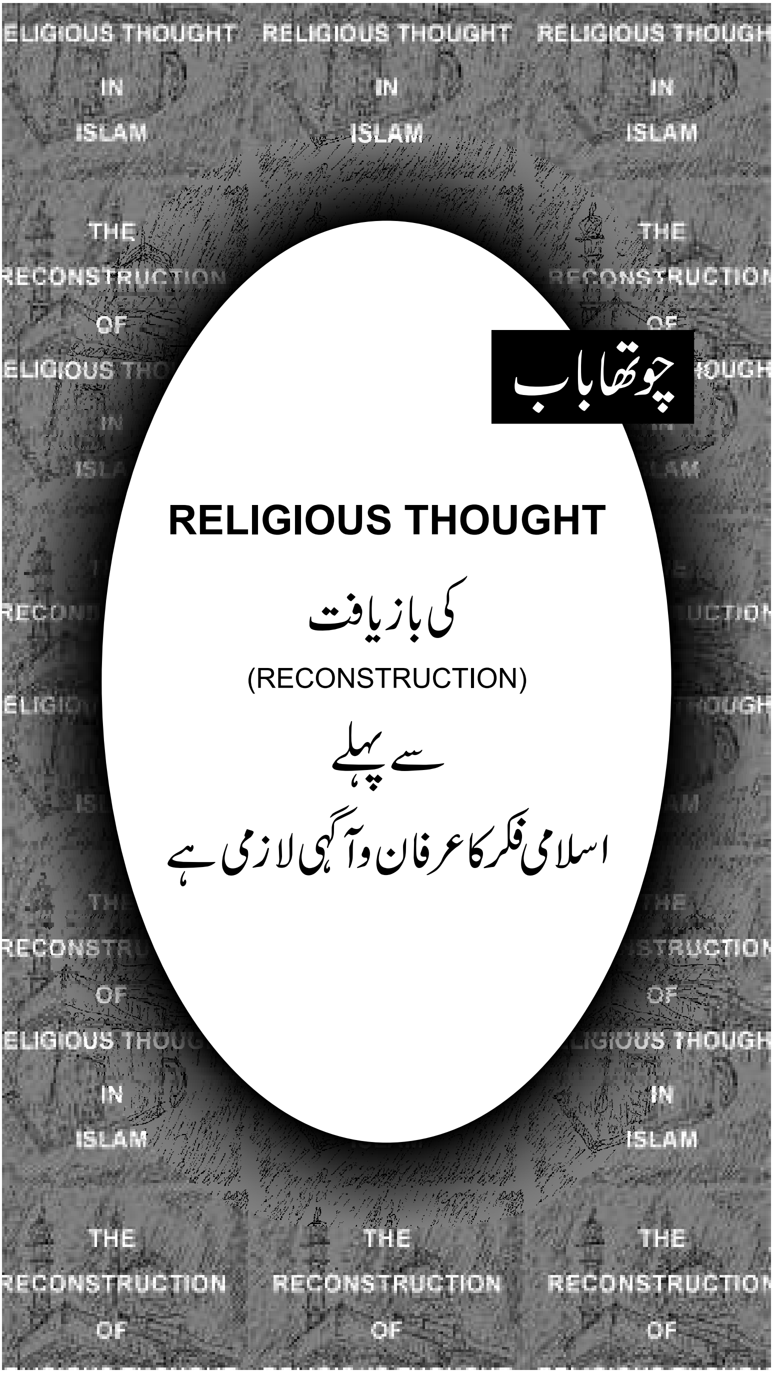

چوتھا باب

RELIGIOUS THOUGHT

کی بازیافت

(RECONSTRUCTION)

سے پہلے

اسلامی فکر کا عرفان و آگہی لازمی ہے

چوتھا باب

1 حالاتِ حاضرہ اور
ہماری قومی ذمہ داریاں ڈاکٹر اسرار احمد 274

2 اقبال دشمنی مغربی ایجنڈے
کا ایک حصہ ہے عامرہ احسان 296

ع بیا بہ مجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش!

فکرِ اقبال کی روشنی میں
حالاتِ حاضرہ
اور
ہماری قومی ذمہ داریاں

خطاب بہ مجلس اقبال،

الحمراء آڈیٹوریم ______ (اپریل 1986ء)

از

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

(بانی تنظیم اسلامی وصدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور)

کی کتاب ''اقبال اور ہم'' سے ایک باب

حمد وصلوٰۃ و دعاء کے بعد

محترم ومکرم صدرِ مجلس! محترم اراکین وکارکنان مرکزیہ مجلس اقبال لاہور، اور معزز خواتین وحضرات!

اگرچہ اس سے قبل بھی متعدد بار: ع ''بیا بہ مجلس اقبال و یک دو ساغر کش'' کے مصداق مجلس اقبال میں شرکت وشمولیت کی سعادت حاصل ہوچکی ہے لیکن اس بار جس انداز میں اس بندۂ ناچیز کا اعزاز واکرام فرمایا گیا ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مناسب الفاظ واقعتہً میرے پاس موجود نہیں ہیں۔ لہٰذا مجبوراً ملک نصر اللہ خان عزیز مرحوم کے الفاظ مستعار لے رہاں ہوں کہ

ع ''اِک بندۂ عاصی کی ــــــ اور اتنی مداراتیں ــــــ!''

مجھے آج صبح ہی کی فلائٹ سے 'شام الھدیٰ' کے مستقل پروگرام کے لیے کراچی روانہ ہوجانا تھا لیکن مجلس اقبال میں شرکت کی سعادت کے لیے یہ ادنیٰ سا تردّد تو ہرگز کوئی قربانی نہیں کہ یہاں سے سیدھا ایئرپورٹ اور ائیرپورٹ سے سیدھا تاج محل ہوٹل کراچی پہنچوں ــــــ البتہ منتظمین مجلس کا یہ احسان عمر بھر یاد رہے گا کہ انہوں نے خاص طور پر میری شمولیت کے لیے مجلس کا آغاز اپنے طے شدہ پروگرام سے ایک گھنٹہ پہلے کیا ــــــ اس کے ساتھ ہی اپنی اس محرومی کا احساس بھی شدت سے ہے کہ آج سے ڈیڑھ سال قبل کی ایک مجلس کی طرح آج بھی مجھے اپنی گفتگو ختم کرتے ہی آدابِ مجلس کے خلاف فوراً روانہ ہوجانا ہوگا اور اس طرح میں اپنے سے بدرجہا اَعلم وافضل اصحاب علم وفضل کے افکار وخیالات سے مستفید نہ ہوسکوں گا۔ بہرحال ''مَا لَا یُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا یُتْرَكُ كُلُّهٗ'' کے مصداق جو میسر آ گیا ہے غنیمت ہے!

بہت سے حضرات یقیناً اس پر حیران ہوں گے کہ میں اپنی روایت کے یکسر خلاف، آج اپنے خیالات تحریری صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام معمول سے ہٹ کر اس بار 'مجلس اقبال' کے لیے بھی ایک موضوع تجویز کر دیا گیا ہے یعنی ''فکر اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ اور ہماری قومی ذمہ داریاں'' اور یہ موضوع اوّلاً تو خطیبانہ جوش سے زیادہ سنجیدہ غور و فکر کا متقاضی ہے ـــــ ثانیاً اس کا اندیشہ ہے کہ زبانی گفتگو کی رواداری میں اس کا کوئی اہم گوشہ تشنہ رہ جائے! ـــــ پھر ایک خواہش یہ بھی ہے کہ یہ باتیں جلد از جلد وسیع پیمانے پر لوگوں کے سامنے لائی جائیں اور من و عن شائع ہوں لہٰذا "نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ" کے مطابق ذہن و لسان کے مابین قلم کو خیالات کی شیرازہ بندی کے ذریعے کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔

عنوان میں اختیار کردہ ترتیب سے ذرا سا ہٹ کر میں پہلے ''حالاتِ حاضرہ'' کے ضمن میں اپنا مشاہدہ اور تجزیہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

آج ہر شخص یہ محسوس کر رہا ہے کہ ہم نے معمارِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مرحوم کے اس اندیشے کے عین مطابق جو ان کے اس تاریخی جملے میں سامنے آتا ہے کہ:

"GOD HAS GIVEN US A GOLDEN OPPORTUNITY TO PROVE OUR WORTH AS ARCHITECTS OF A NEW NATION AND LET IT NOT BE SAID THAT WE DID'NT PROVE EQUAL TO THE TASK"

اپنی نااہلی اور عدمِ قابلیت کا بھرپور ثبوت دیتے ہوئے اُن کے قائم کردہ پاکستان کو تو آج سے لگ بھگ ساڑھے چودہ سال قبل دولخت کرا لیا تھا ـــــ اب اندیشہ یہ ہے کہ مفکر و مصورِ پاکستان علامہ اقبال نے 1930ء میں جس پاکستان کا خواب

"AN INDEPENDENT MUSLIM STATE AT LEAST IN THE NORTH-WEST OF INDIA"

کی صورت میں دیکھا تھا کہیں ہم اُسے بھی اپنی نااہلیوں کی بھینٹ نہ چڑھا دیں اور اس طرح برصغیر پاک و ہند کی مسلم قوم کی نصف صدی سے زائد عرصہ پر پھیلی ہوئی مساعی حبطِ اعمال کے حسرتناک انجام سے دوچار نہ ہو جائیں! ـــــ اس لیے کہ ایک طرف ع ''خموشی گفتگو ہے

بے زبانی ہے زبان میری!'' کے مصداق تا حال 'بے آئینی' ہی سرزمین پاکستان کا 'آئین' ہے۔ گویا قمری حساب سے اپنی قومی زندگی کے چالیس سال پورے کر چکنے کے باوجود (واضح رہے کہ آنے والے ماہِ رمضان مبارک ستائیسویں کو یہ چالیس سال پورے ہوجائیں گے!) ہم ؎

چہل سال عمر عزیزت گذشت مزاجِ تو از حال طفلی نہ گشت

کے مصداق سیاسی و دستوری اعتبار سے ہنوز نابالغ ہیں! ــــ تو دوسری طرف ــــ صاف نظر آتا ہے کہ ع ''آہ! وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف'' ــــ اور ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ پہچانتا نہیں ہوں بھی راہبر کو میں!

کے مصدق اس قافلۂ ملّی کی کوئی منزل متعین ہے ہی نہیں! اور یہ ''ہجومِ مومنیں'' بے مقصدیت کے صحرائے تیہ میں بالکل اس شان سے بھٹک رہا ہے کہ ؎

کس طرف جاؤں' کدھر دیکھوں' کسے آواز دوں اے ہجومِ ناامیدی دل بہت گھبرائے ہے!

چنانچہ اغیار طعنے دے رہے ہیں اور پھبتیاں چست کر رہے ہیں، مبصرین اور تجزیہ نگار انتشار (DISINTEGRATION) اور حصے بخرے ہوجانے (BALKANISATION) کی پیشین گوئیاں کررہے ہیں اور دشمن گھات میں ہیں کہ کب آخری ضرب لگانے کا بہترین موقع ہاتھ آئے اور ع ''خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود'' کے مصداق عصر حاضر کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ختم کردیا جائے! گویا، نظر بظاہر، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ؎

اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز جس نے اس کا نام رکھا تھا جہاں کاف ونوں

پاکستان کی فضا پر متذکرہ بالا عمومی تشویش اور بددلی و مایوسی کے جو بادل چھائے ہوئے ہیں ان کے درمیان سے جھانک کر واقعات کی دنیا میں ''حالاتِ حاضرہ'' کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کا مشاہدہ کیا جائے تو صورتِ حال کچھ یوں نظر آتی ہے کہ:

1۔ ایک جانب سیاچین گلیشیر ہمارے ہاتھ سے جا چکا ہے، اور کشمیر کی کنٹرول لائن آئے دن کی بھارتی جارحیت سے خون آلود ہوتی رہتی ہے۔ پھر کشمیر کے علاوہ ہماری حساس ترین سرحد سے ملحق بھارتی پنجاب شدید خلفشار اور عدمِ استحکام کا شکار ہے اور اس کے ضمن میں کوئی دن نہیں

جاتا جب بھارتی زعما میں سے کوئی نہ کوئی ہمیں موردِ الزام نہ ٹھہراتا ہو۔ نتیجتاً پاکستان سے بھارت کی پیدائشی دشمنی اور مستقل نفسیاتی اور واقعاتی آویزش پر مستزاد یہ فوری اور شدید اندیشہ سر پر منڈلا رہا ہے کہ کسی بھی وقت اپنے اندرونی خلفشار کے باعث جھنجھلا کر بھارت کسی بڑی جارحیت کا ارتکاب نہ کر گذرے۔!

2۔ دوسری جانب افغانستان کی صورتِ حال اور اس کے داخلی نظریاتی تصادم پر مستزاد روس کی ننگی اور براہِ راست مداخلت اور امریکہ کی قدرے ڈھکی چھپی اور بالواسطہ دخل اندازی نے نہ صرف یہ کہ پاکستان کے لیے شدید مسائل اور خطرات پیدا کر رکھے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان، افغانستان اور روسی ترکستان کے پورے علاقے کی قسمت کو گویا ایک معلق ترازو سے وابستہ کر دیا ہے۔ چنانچہ جہاں اس کی بھی امید ہے کہ ایک مردِ درویش کے لگ بھگ پون صدی قبل کے الفاظ کہ ؎

اک ولولہ تازہ دیا میں نے دلوں کو لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند!

حقیقت و واقعیت کا روپ دھار لیں اور یہ خطہ ایک وحدت کی صورت اختیار کر کے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور عالمی غلبے کا نقطۂ آغاز بن جائے، وہاں یہ خطرہ بھی حقیقی اور واقعی ہے کہ سائبیریا کا برفانی ریچھ بحیرۂ عرب کے گرم پانی میں غوطہ لگانے کے لیے آخری دوڑ کا آغاز کر دے اور 'خاکم بدہن' پاکستان بھی اُس کی عریاں جارحیت کا نشانہ بن جائے!

داخلی محاذ پر —— پاکستان کی ماں اور معمارِ پاکستان اور مصور و مفکر پاکستان دونوں کی مشترک وراثت مسلم لیگ جوان دونوں کے منظر عام پر آنے سے قبل واقعتہً صرف نوابوں اور نواب زادوں، اور وڈیروں اور جاگیرداروں کی جماعت تھی البتہ 35ء اور 47ء کے درمیان ایک عوامی تحریک کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ عرصہ ہوا کہ ع ''ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!'' کی مصداقِ کامل بن چکی ہے۔ اور حال ہی میں سرکاری و درباری ذرائع سے اس کے تن مردہ میں جان ڈالنے کی جو کوشش ہوئی ہے اور غیر جماعتی انتخابات میں اپنے ذاتی وسائل اور محض زمینداری یا سرمایہ داری کے بل پر کامیاب ہونے والوں کی پیشانی پر اس کا لیبل چسپاں کر کے اس کے نام سے فائدہ اُٹھانے کی جو کوشش کی گئی ہے کون نہیں جانتا کہ اُس کا حاصل کچھ نہیں اور کم از کم عوام کی

سطح پر اُس کی نہ کوئی حقیقت ہے نہ حیثیت۔

اس طرح ’بظاہر موجود لیکن حقیقتاً کالعدم مسلم لیگ‘ سے قطع نظر ___ قومی سیاست کے میدان میں انتہائی بائیں جانب ہیں وہ اشخاص اور گروہ جن کی پاکستان کو توڑ دینے کی خواہش اب ڈھکی چھپی نہیں رہی بلکہ ببانگ دہل سامنے آ چکی ہے۔ ان میں شخصیات کی سطح پر تو اَہم نام صرف خان عبدالغفار خاں اور جی ایم سیّد کے ہیں البتہ چھوٹی بڑی جماعتیں یا گروہ نصف درجن بلکہ اس سے بھی زائد ہیں جن میں اہم تر نام این ڈی پی، پی این پی، اور سندھی بلوچی پختون متحدہ محاذ کے ہیں! ___ تاہم غنیمت ہے کہ ابھی ان سب کا دائرہ اثر صرف چھوٹے صوبوں تک محدود ہے اور پنجاب کی حد تک اس کی صرف ایک خفیف سی صدائے بازگشت جناب حنیف رامے کی صورت میں سامنے آئی ہے!

دوسری انتہا پر ہیں بعض نیم مذہبی اور نیم سیاسی جماعتیں، جن کی اکثریت واضح طور پر دائیں بازو سے تعلق رکھتی ہے۔ ان میں بھی قابل ذکر تو تین ہی ہیں یعنی جے یو آئی، جے یو پی اور جماعت اسلامی تاہم دوسری نسبتاً چھوٹی جماعتوں اور بڑی جماعتوں کے متحارب دھڑوں کو بھی شمار کیا جائے تو تقریباً وہی بائیں بازو والی تعداد بن جاتی ہے ___ یہ جماعتیں اگرچہ پاکستان کے بقاواستحکام کی بھی دل سے خواہش مند ہیں اور اس میں اسلام کے نفاذ کی بھی داعی ہیں لیکن اوّلاً اس بنا پر کہ ان کا دائرہ اثر بہت محدود بھی ہے اور ملک کے طول وعرض میں مختصر ٹکڑوں (SMALL POCKETS) کی صورت میں منتشر بھی، اور ثانیاً اس بنا پر کہ پاکستان اور اسلام دونوں کی محبت اور وفاداری کی عظیم قدرِ مشترک کے باوجود ان کی باہمی آویزش بلکہ چپقلش ضربُ المثل کی صورت اختیار کر گئی ہے، وہ کوئی فیصلہ کن کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں نظر نہیں آتیں!

ان دو انتہاؤں کے مابین واقعہ یہ ہے کہ قومی اور عوامی سیاست کا اصل دھارا سیکولر ڈیماکریسی سوشل ڈیماکریسی کے رخ پر بہہ رہا ہے، جس میں یوں تو جماعتی اور تنظیمی سطح پر دو نام سامنے آتے ہیں یعنی ایک پاکستان پیپلز پارٹی کا اور دوسرا تحریکِ استقلال کا ___ لیکن بنظر غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ عظیم دھارا اصلاً کچھ چھوٹی اور بڑی اور نئی اور پرانی شخصیتوں اور ان کے مداحوں اور حامیوں، اور عاشقوں اور جانثاروں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے پر بازی

لے جانے کی سر توڑ کوششوں میں مصروف ہیں اور سر دست یہ کہنا مشکل ہے کہ اس عظیم لہر پر سواری کی سعات کس کے حصے میں آتی ہے ــــ گویا ؎

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا   گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا!

اسی درمیانی دھارے میں ایک طوفانی لہر حال ہی میں آنسہ بے نظیر بھٹو کی اپنی اختیاری جلاوطنی کو ختم کر کے پاکستان واپسی ــــ اور شہر اقبال لاہور میں ورود اور اس موقع پر ان کے بے مثال اور حد درجہ والہانہ استقبال‘ اور پھر پاکستان کے دل پنجاب اور اس کے بھی اصل قلب یعنی لاہور، گوجرانوالہ، شیخوپورہ اور فیصل آباد وغیرہ کے اضلاع میں ان کے شاندار اور والہانہ خیر مقدم اور عظیم الشان جلسوں اور جلوسوں کی صورت میں اُٹھی ہے جس نے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے کسی بھی درجہ میں بہرہ ور ہر پاکستانی مسلمان کو نہ صرف یہ کہ ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے بلکہ ملک وملت کے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کر دیا ہے اور غالباً یہ بھی اسی کا شاخسانہ ہے کہ ’مجلس اقبال‘ بھی جو ایک خالص روایتی اور ثقافتی ادارہ بن چکی تھی ’’فکر اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ اور ہماری قومی ذمہ داریوں‘‘ کا جائزہ لینے پر مجبور ہو گئی ہے۔

ہماری قومی اور عوامی سیاست سے اصل اور عظیم تر درمیانی دھارے میں جو طوفانی لہر حال ہی میں اُٹھی ہے اس کے ضمن میں یہ بات بھی بالکل غلط نہیں ہے کہ یہ کسی حد تک آٹھ نو سال کے سیاسی حبس کا ردّ عمل ہے اور اس بات میں بھی یقیناً کچھ نہ کچھ صداقت موجود ہے کہ حالیہ طوفانی کیفیت زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکتی، گویا ع ’’چڑھی ہے یہ آندھی اُتر جائے گی!ــــ لیکن اس قسم کے جملہ عوامل کا حصہ منہا کرنے کے بعد بھی اس کیفیت (PHENOMENON) کی اہمیت ہرگز کم نہیں ہوتی اور اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے کہ اس کے اصل عوامل کیا ہیں، اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور اس کے ضمن میں ملک وملت کے مخلصوں اور بہی خواہوں کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے ــــ اس لیے کہ جہاں یہ اندیشہ موجود ہے کہ اس طوفانی لہر کے جوش کو ٹھنڈا پڑتے دیکھ کر اس پر سوار قائدین بے قابو ہو جائیں اور جھنجلاہٹ میں کوئی غلط اقدام کر بیٹھیں وہاں اس کے سرکاری یا غیر سرکاری مخالفین کا غلط طرزِ عمل اور

MIS-HANDLING بھی نہایت خوفناک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ جس کا ایک تجربہ ہم پندرہ سال قبل مشرقی پاکستان کے معاملے میں کر چکے ہیں!

میں جب علامہ اقبال کے فکر کی روشنی میں عوامی سیاست کے اس درمیانی دھارے اوراس کی موجودہ طوفانی لہر کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے بعینہٖ وہی صورت نظر آتی ہے جو حضرت علامہ نے اس تہذیب حاضر کے تجزیے کے ضمن میں پیش فرمائی ہے جو اپنے آغاز کے اعتبار سے تو یقیناً مغربی اور یورپی تھی لیکن اپنے اثر و نفوذ کے اعتبار سے دیکھتے ہی دیکھتے عالمی اور آفاقی بن گئی تھی اوراس وقت پورے کرۂ ارضی کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے ـــــ اور جس کی خودکشی کی خبر بھی علامہ مرحوم نے اب سے لگ بھگ پون صدی قبل دی تھی کہ ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

اہل نظر جانتے ہیں کہ حضرت علامہ کے نزدیک اس تہذیب کے اصل اجزائے ترکیبی دو ہیں: ایک اس کی اصل ریڑھ کی ہڈی ہے جس کی صلابت اس کے قیام و بقا کی اصل اساس ہے، ’خطبات‘ میں حضرت علامہ نے اسے 'INNER CORE' سے تعبیر فرمایا ہے اور خالص قرآنی الاصل گویا صدفی صد اسلامی قرار دیا ہے یعنی الفاظِ قرآنی: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ، اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا O (بنی اسرائیل:36) کے مطابق یہ طرز اور روش کہ اپنے موقف کو بنیاد نہ توہمات پر قائم کی جائے نہ نرے ہوائی تخیلات پر بلکہ مشاہدات و تجربات اور ان پر مبنی ٹھوس استدلال پر قائم کی جائے۔ حضرت علامہ کی یہ رائے نہایت صائب اور حد درجہ اہم ہے اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہی قرآنی ہدایت و رہنمائی تھی جس نے ایک جانب مظاہر قدرت کو آیاتِ الٰہیہ کا تقدس عطا فرمایا (سورۃ البقرہ آیت 164) اور انسان کو کتابِ فطرت کے سائنٹفک مطالعے اور مشاہدے کی جانب متوجہ کیا (سورۃ الغاشیہ آیات: 17 تا 20) اور دوسری جانب منطق کو استخراج کی تنگ نائیوں سے نکال کر استقراء کی وسعتوں اور پہنائیوں سے روشناس کرایا ـــــ اور اس طرح جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے میدان ہموار کیا۔ چنانچہ یہی

چیز یورپ میں تحریکِ احیاءِ علوم کی بنیاد بنی جس کے نتیجے میں یورپی اقوام اوجِ ثریا پر پہنچیں اور یہ صورت پیدا ہوئی کہ ؎

عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں   کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

حضرت علامہ کی یہ ژرف نگاہی بجائے خود جس عظمت کی مظہر ہے اُس سے قطع نظر میرے لیے اس کی قدر و قیمت کا ایک اضافی پہلو یہ ہے کہ اس سے نبی اکرم ﷺ کے ایک اہم قول کی عظمت و صداقت مبرہن ہوتی ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''اِنَّ اللّٰہَ یَرۡفَعُ بِھٰذَا الۡکِتَابِ اَقۡوَامًا وَ یَضَعُ بِہٖ آخَرِیۡنَ'' ''اب اللہ تعالیٰ اسی کتاب (قرآن) کے ذریعے قوموں کو اُبھارے گا اور اسی کے (ترک کرنے کے) باعث قوموں کو گرائے گا!'' گویا مغربی تہذیب بھی جو اُبھری تو یقیناً قرآن ہی کی ہدایت و رہنمائی کے ایک اہم جزو کے سہارے اُبھری! اور مسلمان گرے تو اسی سبب سے گرے کہ انہوں نے قرآن کی اس ہدایت سے یورپ کو روشناس کرانے کے بعد خود اُسے ترک کر دیا۔ گویا

؎ وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر   اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اور ؎ خوار از مہجوریٔ قرآں شدی   شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

؎ اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ   در بغل داری کتابِ زندۂ

2۔ تہذیب حاضر کا دوسرا جزو اُس کے کچھ خارجی مظاہر ہیں جنھیں خطبات میں تو حضرت علامہ نے صرف ایک لفظ 'DAZZLING EXTERIOR' سے تعبیر فرمایا ہے لیکن اشعارِ اقبال کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مظاہر خارجی کے بھی دو رُخ ہیں جنہیں کہیں تو حضرت علامہ ''چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر'' کے الفاظ سے تعبیر فرماتے ہیں، کہیں ان کی نشاندہی ع ''طبِّ مغرب کے مزے میٹھے اثر خواب آوری'' جیسے الفاظ کے ذریعے کرتے ہیں ___ اور اس ضمن میں غالباً سب سے زیادہ بھرپور انداز یہ ہے کہ ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی   یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

تہذیبِ حاضر کے ان بظاہر حسین و خوشنما اور دل کش و مرعوب کن مظاہر خارجی میں سے مثلاً ایک حریت فکر ہے جس کے پردے میں یا باضابطہ کفر و الحاد ہے یا لاادریت و ارتیابیت،

اوران دونوں کا حاصل ہے یا عریاں لامذہبیت یا کم از کم محدود مذہبیت کے پردے میں لپٹی ہوئی لادینیت!___ گویا ؎

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار — انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!

دوسرے حریتِ عمل ہے جس کی شکّر والی تہہ کے نیچے مضمر ہے اباحیت اور آوارگی کا زہر، جس نے اخلاق وکردار اور شرافت وانسانیت کا دیوالہ نکال دیا ہے، تیسرے نمبر پر ہے حریت نسواں اور نظریۂ مساواتِ مرد وزن جس نے مرد کو 'نامرد' اور زن کو 'نازن' بنا کر رکھ دیا اور دونوں کو تماشائی و ہرجائی بنا کر خاندان کے مقدس ادارے کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ؎

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور — کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال؟ — مرد بے کار و زن تہی آغوش!

اسی طرح — خشت اوّل چوں نہد معمار کج — تا ثریا می رود دیوار کج!

کے مصداق اجتماعیت انسانیہ کے ضمن میں تہذیب مغرب نے سیاسی و معاشی مساوات کے حسین عنوانوں سے انسان کو اوّلاً لادینی جمہوریت (SECULAR DEMOCRACY) کا تحفہ دیا جو ''چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر'' کا مصداقِ کامل ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے حقیقتاً سرمایہ داروں کی بدترین آمریت عوام پر مسلط ہوگئی۔ ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اوراس کے بعد اس نہلے پر دہلا بے خدا اشتراکیت کا مارا جس نے انسان سے اس کی آزادی کو کلیتہً سلب کر کے اسے ایک مشین کا پرزہ بنا کر رکھ دیا۔ فاعتبروا۔

آگے بڑھنے سے قبل اس مقام پر دو امور کی وضاحت مناسب ہے:

ایک تو یہ کہ تہذیب جدید کے اس المیے کا اصل سبب سورۃ البقرہ کے چوتھے رکوع کی روشنی میں ایک جملے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس نے 'علم الاسماء' پر تو پوری توجہ صرف کی جو ابتدائے آفرینش ہی سے حضرت آدم کی سرشت میں ودیعت کر دیا گیا تھا اور جس نے تاریخ انسانی کے دوران مسلسل بروز وظہور اور صعود وارتقاء کے ذریعے 'علم الاشیاء' اور 'علم الخواص' کے راستے

سے سائنس اور ٹیکنالوجی کی صورت اختیار کی ـــــ لیکن اس علم وحی سے یکسر منہ موڑ لیا جسے قرآن 'ہدایت' [فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرۃ:38)] سے تعبیر کرتا ہے۔ نتیجتاً اس نے اُس 'دجال' کی صورت اختیار کر لی جس کی ایک آنکھ بند ہے اور جس کی پیشانی پر جلی حروف میں ''ک ف ر'' لکھا ہوا ہے۔ چنانچہ اب یہ یک چشم عفریت نوعِ انسانی ہی نہیں ہر قسم کی حیاتِ ارضی کی کلی تباہی پر تلا کھڑا ہے!

دوسرے یہ کہ عالم اسلام میں اس تہذیب کے ضمن میں یہ متوازن نقطۂ نظر میری محدود معلومات کی حد تک سوائے علامہ اقبال مرحوم کے اور کسی کے یہاں نظر نہیں آتا، اور ان کے بعد ان کی شمع سے اپنے چراغ روشن کرنے والوں میں بھی کم از کم اپنی محدود بصارت و بصیرت کی حد تک مجھے صرف ایک شخصیت ایسی نظر آتی ہے جس کے فکر میں اس توازن کا عکس کامل موجود ہے اور وہ ہیں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم و مغفور! ـــــ ورنہ اکثر و بیشتر افراد و اشخاص کی حد تک بھی یا حیرانی و سرگردانی نظر آتی ہے، یا انتہا پسندی اور یک رُخا پن! ۔ اور بحیثیت مجموعی بھی ملت کے دو اہم طبقات نے متضاد طرزِ عمل اختیار کیا۔ چنانچہ ایک طرف علماء کرام کی اکثریت نے اس تہذیب کو بالکلیہ ردّ کر دیا۔ نتیجتاً اس کے اُس INNER CORE سے بھی محرومی اختیار کر لی جو اصلاً خالص قرآنی اور اسلامی تھا۔ اور وہ صرف آسمانی ہدایت کے امین بن کر قال اللہ اور قال الرسولؐ کے حصار میں محصور ہو کر رہ گئے۔ اور دوسری جانب قوم کی عظیم اکثریت نے تہذیب مغرب کو من و عن قبول کر لیا۔ نتیجتاً اس کے INNER CORE کے ساتھ ساتھ اس کی ''جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری'' سے پیدا شدہ ''صناعی'' کو بھی ایک شکست خوردہ اور مرعوب ذہنیت کے ساتھ جوں کا توں قبول کر لیا۔ نتیجہ وہ نکلا جسے کسی صاحب درد نے یوں بیان کیا کہ ؎

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں اُلجھ کر اکثر — تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیے
نئی تہذیب کی بے روح بہاروں کے عوض — اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیے

اور اس ضمن میں بھی اللہ رحمتیں نازل فرمائے اپنے اس بندۂ قلندر پر جس نے کمال انصاف کا ثبوت دیا جب ملت کے ان دو اہم طبقات کے تضادِ عمل کو یوں واضح کیا کہ ؎

کہا اقبال نے شیخ حرم سے — تہہ محراب مسجد سو گیا کون؟

ندا مسجد کی دیواروں سے آئی فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون؟

فکرِ اقبال کی اس روشنی میں پاکستان کی عوامی سیاست کے بڑے اور درمیانی دھارے اور اُس کی حالیہ مہیب لہر کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے بھی دو جزو سامنے آتے ہیں چنانچہ اس کا بھی ایک 'INNER CORE' ہے جو نہ غیر اسلامی ہے نہ غیر قرآنی اور نہ افکار و نظریاتِ اقبال کے منافی ہے، نہ تصوراتِ قائداعظم کی نقیض بلکہ عین قرآنی اور اسلامی بھی ہے اور پاکستان کے مصور و مفکر اور مؤسس و معمار دونوں کے خیالات کے مطابق بھی اور اسی میں اس دھارے کی مقبولیت اور اس کی قوت و شوکت کا راز مضمر ہے، البتہ دوسرا جزو جو بجائے خود نہایت اہم ہے بے خدا بھی ہے اور بے دین بھی اور خالص مشرکانہ بھی ہے اور ملحدانہ بھی! اور یہ بات نہایت اہم اور لازمی ہے کہ ان دونوں اجزاء کو علیحدہ علیحدہ پہچان لیا جائے اور دونوں کے ساتھ ایک طرزِ عمل اختیار کرنے کی بجائے علیحدہ علیحدہ رویہ اختیار کیا جائے!

اس دھارے اور لہر کی 'INNER CORE' کے اجزاء ترکیبی میں سے اوّلین جزو ہے ”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ ...... الایہ“ کے مطابق انسان کا محض انسان ہونے کے ناطے اعزاز و اکرام اور تشریف و تکریم، اور رنگ و نسل، مال و منال، اور عہدے، پیشے یا جنس کی بنیاد پر انسانوں کے مابین اعلیٰ و ادنیٰ، شریف و رذیل، اور اونچ اور نیچ کے جملہ امتیازات کا مکمل کا خاتمہ اور انسانوں کے مابین اس سماجی و معاشرتی سطح پر کامل مساوات! بمصداق الفاظِ قرآنی: ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا اِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ“ (الحجرات:13)۔ اور بقول اقبال:

کلُّ مومن اخوةٌ، اندر دلش حریت سرمایۂ آب و گلش
نا شکیب امتیازات آمدہ! در نہادِ او مساوات آمدہ!

ان امتیازات کا کلی خاتمہ اور کامل انسانی مساوات کا بالفعل قیام رسولِ عربی ﷺ کا وہ طرۂ امتیاز ہے جس کے سامنے ایچ جی ویلز جیسے دشمن اسلام اور شاتم رسولؐ بھی اپنے آپ کو سر جھکانے پر مجبور پاتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہی وہ چیز ہے جو موجودہ نام نہاد مسلمان معاشرے

میں ناپیدا ہو چکی ہے، اس ضمن میں علامہ اقبال نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ ؎

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو، تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو!

میں ان کی روح سے معذرت کے ساتھ اس میں یہ اضافہ کروں گا کہ:

ع تم سبھی کچھ ہو مگر سوچو کہ انسان بھی ہو!

اس "INNER CORE" کا دوسرا اہم جزو ہے انسان کے بنیادی عمرانی حقوق (یعنی CIVIL RIGHTS) اور اُن کے ضمن میں کامل سیاسی و قانونی مساوات! جس سے ''تمیز بندہ و آقا'' کا مکمل خاتمہ ہو جائے اور نہ کوئی قوم کسی دوسری قوم پر حکمران ہو، نہ کوئی طبقہ دوسرے طبقے پر برتری کا حامل ہو اور نہ ہی کوئی علاقہ دوسرے علاقے پر بالادستی کا حق جتائے، بلکہ نوعِ انسانی ''کونوا عباد اللہ اخوانًا'' (الحدیث) پر عمل پیرا ہو جائے۔ ترجمہ: تم سب اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ! ___ حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنی ذاتِ اقدس اور جسم اطہر کو بھی قصاص کے لیے پیش فرما کر، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھرے مجمع میں احتساب پر برافروختہ نہ ہو کر بلکہ بالفعل جوابدہی فرما کر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں عدالت میں ایک عام مدعی کی حیثیت سے پیش ہو کر اور اپنے دعوے کے اخراج پر کبیدہ خاطر نہ ہو کر جو اعلیٰ اور روشن اور ابدی و لازوال مثالیں قائم کی تھیں وہ آج متفق علیہ اقدار کی حیثیت سے انسان کے اجتماعی ضمیر کا جزو لاینفک بن چکی ہیں اور عہد حاضر کا انسان ان کو ACHIEVE اور REALISE کرنے کے لیے علامہ اقبال کے ان پر شکوہ الفاظ کے مطابق ہاتھ پاؤں مار رہا ہے کہ ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو زانکہ از خاکش بروید آرزو!

یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہا ست یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است!

لیکن چونکہ وہ نورِ نبوت سے براہ راست استفادہ کرنے پر آمادہ نہیں لہٰذا افراط و تفریط کے دھکوں کے سوا اسے کچھ حاصل نہیں ہو رہا ___ تاہم کون نہیں جانتا کہ آج ان اقدارِ عالیہ سے سب سے بڑھ کر محروم اور سب سے زیادہ تہی دست و تہی دامن وہ ہیں جو مسلمان کہلاتے ہیں ___ اور اسی کا ردِّعمل ہے جو ہماری سیاست کے موجودہ ابھار کی اساس بنا ہے!

اس "INNER CORE" کا تیسرا لیکن اہم ترین جزو ہے معاشی عدل و انصاف اور

کم از کم مواقع کی حد تک کامل مساوات اور ہر نوع کے اقتصادی استحصال اور 'سرمایہ داری' کی لعنت کا مکمل خاتمہ اور ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت کا ذمہ! ــــ یہ تمام باتیں وہ ہیں جو تمام جہانوں کے پروردگار نے اپنے کلام پاک میں ارشاد فرمائیں اور محمد ﷺ اور ان کے حواریین وخلفاءِ راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے بالفعل کر کے دکھائیں۔ چنانچہ ''کَیۡلَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃً بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ'' کے مطابق دولت کی منصفانہ تقسیم اسلام کے معاشی نظام کا اصل الاصول ہے اور ''وَمَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزۡقُہَا'' کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ: ''اگر دجلہ وفرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مرجائے تو اس کے لیے اللہ کے یہاں عمرؓ ذمہ دار ہوگا!'' اسلام کے اقتصادی مقاصد کے ضمن میں POLICY STATEMENT کی حیثیت رکھتا ہے۔ جسے اقبال نے یوں تعبیر فرمایا کہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس نقطۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

اور ؎ آب و نانِ ماست از یک مائدہ دودۂ آدم ''کنفس واحدہ''

لیکن افسوس کہ جب مسلمانوں کے دورِ زوال میں اس پر ملوکیت کے ساتھ ساتھ جاگیرداری اور سرمایہ داری کی چھاپ پڑ گئی تو اسلام اور قرآن کے رُخِ روشن کی یہ جہاں تابیاں نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں وہ صورت بن گئی جس کا نقشہ حضرت علامہ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ؎

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!

نتیجتاً ــــ قوم کی عظیم اکثریت تو اقبال کے اس شعر کا مصداق کامل بن ہی چکی ہے کہ ؎

ہیچ خیر از مردکِ زر کش مجو لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا

خود 'مذہبیت' کی بھی اکثر و بیشتر صرف یہ مسخ شدہ صورت (PERVERTED FORM) باقی رہ گئی ہے کہ ہر قسم کے حرام وحلال ذرائع سے دولت سمیٹو، البتہ کچھ صدقہ وخیرات کے کھاتے بھی جاری رکھو۔ چنانچہ حکومت کی جانب سے سود دے کر اُس میں سے زکوٰۃ وصول کر لینے کا تماشا تو حال ہی میں ہوا ہے، سود لو اور اس میں سے زکوٰۃ دے دو، پر تو ہمارے مذہبی مزاج کے سرمایہ دار بزرگ بہت پہلے سے عمل پیرا ہیں۔

اس سلسلے میں نقد کے ضمن میں 'ربا النسیۃ اور ربا الفضل، کی جو بے شمار صورتیں سرکاری وغیر سرکاری سطح پر ہماری پوری تجارت وصنعت اور ریاست کی سطح پر دفاع وترقی کی جملہ سکیموں میں رچی بسی ہوئی ہیں ان کا ذکر تو تحصیل حاصل ہے، اگر چہ حضرت علامہ کے یہ دو اشعار نقل کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا کہ ؎

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن! کس نداند لذتِ قرضِ حسن

از ربا جاں تیرہ، دل چوں خشت و سنگ آدمی درندہ بے دندان و چنگ

تاہم 'زمین کے سود' کا ذکر ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس کے ضمن میں مذہبی سطح پر تو مغالطے موجود ہیں ہی شیدائیانِ اقبال کا ذہن بھی صاف نہیں ہے چنانچہ وہ ان اشعار کو تو لہک لہک کر پڑھتے ہیں کہ:

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف مُنعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر وعمل کا انقلاب پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں!

اور ؎ دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

اور ؎ رزقِ خود را از زمیں بردن روا ست ایں متاعِ بندہ و ملک خدا است!

لیکن غالباً انہوں نے قرآن کی اس تعلیم اور اقبالؔ کی اس تبیین کو صرف اخلاقی وعظ کے خانے میں رکھا ہوا ہے اور یہ نہیں جانتے کہ زمین کے سلسلے میں یہ اسلام کے قانونی وفقہی نظام کی اہم اساس ہے! چنانچہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام دار الہجرت مالک رحمۃ اللہ علیہ دونوں کا متفقہ فتویٰ ہے کہ مزارعت مطلقاً حرام ہے اور اقبال کا یہ فرمانا محض شاعری نہیں ہے کہ ؎

خدا آں ملتے را سروری داد کہ تقدیرش بدست خویش بنوشت

بہ آں قومے سروکارے ندارد کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

چنانچہ سماجی، سیاسی اور معاشی جملہ سطحوں پر تمام ناانصافیوں اور ناہمواریوں کا خاتمہ کر کے دینِ حق کے کامل نظامِ عدل وقسط کو بالفعل نافذ وقائم کرنے کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے خاتم النّبیین اور سیّد المرسلین محمد الامین صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ (بفحوائے الفاظ قرآنی "وَاُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَیۡنَکُمُ" (الشوریٰ:15) اور "لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ" (الحدید:25) اور ع ''خدایا آں کرم بارِ دگر کن!'' کے مصداق اسی کا پیغام دیا تھا حکیم الامت اور مصور پاکستان علامہ

اقبال مرحوم نے کہ ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　　اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است!

چنانچہ اقبال سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ جہاں شعریت اور جذباتی سوز و ساز کے اعتبار سے کلامِ اقبال کے نقطۂ عروج کا مظہر اُن کی دوسری نظمیں (خصوصاً ذوق وشوق) ہیں وہاں اُمت مسلمہ کے نام ان کے پیغام کا مظہر اتم واکمل ہے 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' اور خصوصاً اس کے یہ آخری اشعار ؎

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف　　　ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں

الحذر! آئین پیغمبر سے سو بار الحذر　　　حافظ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف　　　مُنعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر وعمل کا انقلاب　　　پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں!

چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب　　　یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

چنانچہ اس مردِ قلندر نے تو نہ صرف یہ کہ ؏ ''جوہر دریائے قرآں سُفتہ ام'' کے مصداق قرآنِ حکیم کے حقائق ومعارف کی دل نشیں پیرائے اور شعری اسلوب میں تعبیر وتعلیم میں اپنی توانائیاں کھپادیں بلکہ ساتھ ہی انقلاب کا نعرہ بھی بلند کر دیا تھا ـــــ کہ:

خواجہ از خونِ رگ مزدور سازد لعل ناب　　　از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب!　انقلاب!　اے　انقلاب!!!

یہ دوسری بات ہے کہ ان کے نام لیواؤں اور شیدائیوں نے ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا کہ:

ہر کسے از ظن خود شد یارِ من　　　وز درونِ من نہ جست اسرارِ من

مزید برآں ـــــ یہی تھی وہ حقیقت جسے تعبیر فرمایا تھا بابائے قوم اور بانئ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے کبھی ان الفاظ سے کہ ''ہم پاکستان کی صورت میں ایک ایسے خطہ ارضی کے خواہاں ہیں جس میں اسلام کے اصولِ حریت واخوت ومساوات کا عہد حاضر میں عملی اور مثالی نمونہ پیش کرسکیں۔'' اور کبھی یہ فرما کر ''اسلام ایک سوشل ڈیما کریسی ہے''۔! (روایات بالمعنیٰ!)

لیکن افسوس کہ علامہ اقبال تو خالص 'مسنون عمر' میں پاکستان کے قیام سے لگ بھگ

دس سال قبل ہی دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، قائداعظم مرحوم بھی قیامِ پاکستان کے بعد کل ایک سال زندہ رہے ــــ اور اُن کے بعد اُن کی عوامی تحریک کا ثمرہ اُچک لیا، اولاً نوابوں اور نوابزادوں اور زمینداروں، جاگیرداروں اور وڈیروں نے، اور بعدازاں اس میں مستقل حصہ دار تو بن گئے کچھ نئے اور پرانے سرمایہ دار اور باری باری حصہ بٹاتے رہے اعلیٰ سول اور فوجی عہدہ دار! جس کے نتیجے میں قانونِ قدرت کے عین مطابق عوامی سطح پر ایک شدید احساس محرومی پیدا ہوا جو اندر ہی اندر سلگنے والی آگ کے مانند بڑھتا چلا گیا ــــ اور ــــ اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ اسی احساسِ محرومی کی پرزور ترجمانی کی تھی، ذوالفقار علی بھٹو نے جس نے پاکستان کی سیاست کے اُس نئے اور زوردار عوامی دھارے کو جنم دیا تھا جس کی ایک طوفانی لہر پر سوار ہو کر وہ اب سے پندرہ سال قبل خود ایوانِ اقتدار تک پہنچے تھے!

واضح ہے کہ اس وقت مجھے نہ بھٹو صاحب کی ذات اور شخصیت سے کوئی بحث ہے نہ اُن کی سیرت و کردار سے، اور نہ اُن کے خلوص یا عدمِ اخلاص کے بارے میں کوئی گفتگو کرنی ہے، نہ ان کی اہلیت یا نا اہلیت کے بارے میں کوئی فیصلہ دینا ہے بلکہ فی الوقت میری گفتگو صرف اور صرف پاکستان کی عوامی سیاست کے درمیانی دھارے کے اس "INNER CORE" کی تعیین و تشخیص سے متعلق ہے جس نے اس میں وہ قوت و مقاومت پیدا کر دی ہے کہ پاکستان کی تاریخ کے طویل ترین مارشل لاء سے بھی اس کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی۔ چنانچہ مارشل لاء کے ذرا پس منظر میں جاتے ہی اس کی طوفانی لہر سامنے آ گئی ــــ اگرچہ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ اس بار اس پر سواری بھٹو مرحوم کی صاحبزادی مس بے نظیر کرتی ہیں یا ان کے سابق رفیق کار مسٹر جتوئی، یا ان کی ایک نظر بندی کے دوران ان کے خلا کو پر کرنے والے ائیر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان ــــ یا کوئی اور!!۔

بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ اس دھارے کے بہاؤ کو روکنا نہ کسی چوتھے مارشل لاء کے لیے ممکن ہے نہ پانچویں کے، اور اس کے آگے نہ علماء کرام کوئی بند باندھ سکتے ہیں نہ مشائخ عظام، نہ پشتینی رئیس اس کی راہ میں مزاحم ہو سکتے ہیں نہ نو دولیتے سرمایہ دار، نہ سردار اور وڈیرے اس کا راستہ روک سکتے ہیں نہ زمیندار و جاگیردار ــــ اور نہ کوئی میر اس کے راستے میں

حامل ہوسکتا ہے نہ کوئی پیر ـــــ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کیا جاسکتا ہے تو صرف یہ کہ اس کے رخ کو موڑنے کی کوشش کی جائے!

اس لیے کہ مغرب کی اندھی تقلید میں ہمارا یہ ’ڈان‘ بھی خالص مادیت ہی کے رخ پر بہہ رہا ہے اور اس کے "INNER CORE" کا سارا خارجی لبادہ یورپ سے مستعار لیا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کا کوئی براہ راست سروکار نہ اللہ سے ہے نہ رسول ﷺ سے اور اس میں نہ ہدایتِ آسمانی سے کوئی اعتنا ہے نہ آخرت کی جوابدہی کا کوئی ذکر، لہٰذا عدلِ اجتماعی کے جملہ تصورات و معیارات بھی مغرب ہی سے ماخوذ ہیں اور اُن کے ضمن میں اِفراط وتفریط کی انتہاؤں کے مابین بھٹکنے کی کیفیت بھی لامحالہ وہیں کا چربہ ہے ـــــ مزید برآں ان کے جلو میں بے پردگی بھی ہے اور عریانی بھی، اباحیت (PERMISSI VENESS) بھی ہے اور آوارگی بھی، لاف زنی بھی ہے اور بڑکیں بھی، بھنگڑہ بھی ہے اور ’ہے جمالو‘ بھی ـــــ اور اِن سے بھی بڑھ کر عبادات سے بے اعتنائی ہی نہیں، ان کا استہزاو تمسخر ہے، شریعت سے بے پرواہی ہی نہیں اس کے خلاف نشوز اور بغاوت ہے اور شعائرِ اسلامی کا عدمِ احترام ہی نہیں اس کی باضابطہ توہین وتذلیل ہے ـــ وقس علیٰ ذالک!

فکرِ اقبال کی روشنی میں اس صورتحال کا علاج بھی اسکی کلی نفی (TOTAL NEGATION) اور بحیثیت مجموعی ردّ کردینے (TOTAL REJECTION) میں نہیں بلکہ اس کے صحیح جزو کو قبول کرتے ہوئے غلط جزو کی اصلاح میں مضمر ہے! بالکل ایسے جیسے حضرات علامہ نے موجودہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو ایک ایسے نیام سے تشبیہ دی ہے جس سے ایمان باللہ کی تلوار نکال لی گئی ہو:

عشق کی تیغ جگر دار اُڑا لی کس نے؟ علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

گویا نیام تو اپنی جگہ درست اور کارآمد ہے ضرورت صرف اس کی ہے کہ اس میں تلوار داخل کی جائے اسی طرح علم جدید میں فی نفسہٖ کوئی شے غلط نہیں ہے اور کائنات کے بارے میں معلومات کا جو عظیم خزانہ اس نے جمع کیا ہے وہ اپنی جگہ متاعِ بے بہا ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس میں خالق کائنات کی معرفت ومحبت کی چاشنی گھول دی جائے!

یہی وجہ ہے کہ حضرت علامہ نے اپنے اس مشہور اور متنازعہ فارمولے میں کہ:

مغرب کے مادی فکر کی منطقی انتہا یعنی جدلی مادیت اور اس کے بھی نقطۂ عروج یعنی مارکسزم تک کو بالکلیہ ردّ نہیں کیا بلکہ صرف اس ضرورت کا احساس دلایا ہے کہ اس میں ایمان باللہ کا تریاق شامل کر دیا جائے تو اس کی سمّیت اور زہرناکی ختم ہو جائے گی اور یہ اسلام سے بہت قریب آ جائے گا!

بنابریں فکرِ اقبال کی روشنی میں اِس وقت کرنے کا اصل کام، یہ ہے کہ پاکستان کی عوامی سیاست کے عظیم دھارے کے آگے بند باندھنے کی لاحاصل ہی نہیں حددرجہ مضر اور خطرناک کوشش کی بجائے اس میں ایمان ویقین کی چاشنی اور حکمت ومعرفت کی روشنی شامل کرنے کی کوشش کی جائے اور اس طرح فی الجملہ اس کے رخ کو آسمانی ہدایت کی جانب موڑ دیا جائے!

اور یہ کام ظاہر ہے کہ ہرگز آسان نہیں بلکہ نہایت مشکل اور مشقت طلب ہے البتہ اس کے ضمن میں ایک بہت اہم اور مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں وہ لوگ جو اقبال کے مداح وشیدائی اور ان کے فکر وفلسفہ اور حکمت وبصیرت سے فیض حاصل کرنے والے اور خود کو ان کی جانب منسوب کرنے والے ہیں۔ اس لیے کہ اقبال کے متذکرہ بالا فارمولے کے مانند ایک بظاہر نہایت سادہ لیکن بباطن حددرجہ محکم فارمولا یہ بھی ہے کہ:

> 'پاکستان کی بقا اور استحکام صرف اور صرف اسلام سے وابستہ ہے اور احیاء اسلام کا واحد ذریعہ ہے تجدید ایمان اور ایمان کا واحد منبع اور سرچشمہ ہے قرآن حکیم اور دور حاضر میں احیاء قرآن کا ایک نہایت اہم اور مؤثر ذریعہ ہے فکر وکلام اقبال!'

اس لیے کہ جیسے کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے اور علیٰ وجہ البصیرت کہا ہے اور آج پھر کہہ رہا ہوں اور ڈنکے کی چوٹ کہہ رہا ہوں کہ عہدِ عصرِ حاضر کے ذہنی وفکری ظروف واحوال میں قرآن حکیم کی عظمت کا جس قدر انکشاف اقبال پر ہوا، اور کسی پر نہیں ہوا ـــــ اور موجودہ دور کی اعلیٰ ترین علمی وفکری سطح پر قرآن کے علم وحکمت اور ہدایت ومعرفت کی تعبیر وتبیین اور تشریح وتوضیح کی ہے صرف ـــــ اور صرف اقبال نے! لیکن اس کے لیے اقبال کے مداحوں اور شیدائیوں کو ع "پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر ہے!" کے مصداق کردار اور عمل کے میدان میں اترنا ہوگا، اور

حلقہ اقبال کو محض ایک روایتی اور ثقافتی طائفے کی صورت اختیار کرنے بلکہ شدتِ احساس کے لیے معذرت خواہ ہوں، مزارِ اقبال کے مجاوروں کی حیثیت اختیار کرنے کی بجائے خود اقبال کی ''خانقاہ'' سے بھی باہر نکل کر 'رسم شبیری'' ادا کرنی ہوگی! اور اس کے لیے انہیں اس ہمت و جرأت محنت و مشقت، ایثار و قربانی اور بے نفسی و بے غرضی کے علاوہ جو کسی بھی عظیم مقصد کے لیے لازمی و لابدی ہیں حسب ذیل عملی اقدامات کرنے ہوں گے:۔

1۔ اوّلاً جس دین و شریعت کے نام لیوا اور علمبردار ہیں اس پر خود عمل پیرا ہونا،

اور اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں گا کہ اقبال کے مداحوں اور شیدائیوں کے لیے سب سے مشکل اور کٹھن مرحلہ یہی ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے خود اقبال کی 'بے عملی' کو 'سند' کا درجہ دے دیا ہے۔ حالانکہ قطع نظر اس سے کہ خود حضرت علامہ نے اپنی بے عملی اور 'تن آسانی' کا ہمیشہ ایک کمی کی حیثیت سے برملا اعتراف کیا اور اسے کبھی سند کی حیثیت سے پیش نہیں فرمایا، ان کے فکر کے علو و عظمت کے پیش نظر ان کی 'بے عملی' کی کوئی اہمیت نہیں رہتی بلکہ بلا مبالغہ مجھ ایسے لاکھوں انسانوں کا 'عمل' ان کی 'بے عملی' پر نچھاور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن دوسرا کون ہے جو اس کا مدعی بن کر سامنے آسکے؟ مولانا مودودی مرحوم نے تو حضرت علامہ کو صوفیا کے 'ملامتیہ' گروہ سے متعلق قرار دیا ہے جو اپنے 'عمل' کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپانے کے لیے 'بے عملی' کا مظاہرہ کرتے ہیں، میں یہاں تک بھی نہیں جاتا بلکہ اسے اس قاعدہ کلیہ کے ذیل میں شمار کرتا ہوں کہ نابغہ لوگوں کا عمل بالعموم ان کے فکر کا ساتھ نہیں دے سکتا، تاہم اصل بات یہ ہے کہ حضرت علامہ ہمیں وہ فکر دے گئے جو اس دور کے لاکھوں نہیں کروڑوں 'باعمل' لوگ بھی نہیں دے سکتے تھے لیکن اب اس فکر کو عملاً بروئے کار لانے کا اوّلین تقاضا ع ''شرطِ اول قدم ایں است کہ مجنوں باشی''! کے مصداق اس اسلام پر بالفعل عمل پیرا ہونا ہے جس کی تعبیر حضرت علامہ نے یوں فرمائی کہ ع ''عاشقی؟ محکم شو از تقلید یار!''

اس ضمن میں اس مغالطے پر مستزاد جس تضاد کا مظاہرہ علامہ مرحوم کے حلقہ بگوشوں میں نظر آتا ہے اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ بالفرض وہ داڑھی اس لیے نہیں رکھتے کہ علامہ نے نہیں رکھی تو اسی دلیل کے تحت اپنے گھروں میں پردہ کیوں رائج نہیں کرتے حالانکہ اس موضوع پر حضرت علامہ کے افکار و آرا بھی نہایت واضح اور روز روشن کی طرح عیاں ہیں اور ان کا عمل تو اس سے بھی

کہیں زیادہ روشن تابناک ہے! اس ضمن میں اس وقت مزید کچھ عرض کرنے سے اس لیے گریز کرتا ہوں کہ اس دور میں حضرت علامہ کے اس شعر کا مصداق کامل میں ہوں کہ ؎

کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب	پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند!

تاہم یہ صرف ایک مثال یہ ہے	ع	قیاس کن زگلستانِ من بہارمرا

2۔ ثانیاً اس عظیم مقصد کے لیے علماء کرام کا تعاون حاصل کیا جائے۔ اور اس ضمن میں حضرت علامہ کی ان تنقیدوں اور لطیف اور مزاحیہ انداز کی اُن پھبتیوں کے ساتھ ساتھ جو انہوں نے روایتی ملا پر چست کی ہیں ان کے اس طرز عمل کو نگاہ میں رکھا جائے کہ انہوں نے ہمیشہ علماء حق کا احترام کیا۔ یہاں تک کہ اپنے تمام تر مرتبہ علمی وفکری کے باوجود بالغ نظر اور وسیع الذہن علماء سے خالص طالب علمانہ انداز میں کسب فیض میں کبھی اپنی توہین یا سبکی محسوس نہیں کی۔ چنانچہ علامہ سیّد سلیمان ندوی کے ساتھ ان کی خط و کتابت اس پر شاہد عادل ہے۔ خصوصاً فقہ وقانون اسلامی کے ضمن میں اس دور میں اجتہاد کے سب سے بڑے داعی اور علمبردار ہونے کے باجود، انھوں نے خود اپنے آپ کو کبھی مجتہدِ مطلق نہیں سمجھا بلکہ اس کے باوجود کہ عربی زبان پر انہیں عبور حاصل تھا، قرآن اُن کے رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے تھا اور خود وہ تمام عمر قرآن میں غوطہ زنی کرتے رہے تھے، حکمت دین اُن کے ذہن وفکر کی جزو لاینفک تھی اور تفقہ فی الدین اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا ـــــ قانون اسلامی کی تدوین نو کے ضمن میں انہیں کبھی یہ خیال تک نہیں آیا کہ وہ تن تنہا اس کے اہل ہیں، بلکہ کسے معلوم نہیں کہ وہ اپنی حیاتِ دنیوی کے آخری ایام تک بیہقیؒ وقت مولانا سیّد محمد انور شاہ کاشمیریؒ سے درخواست فرماتے رہے کہ وہ کسی طرح لاہور منتقل ہو جائیں تو دونوں مل کر وقت کی اس اہم ترین ضرورت سے عہدہ برآ ہونے کی کوششیں کریں۔

اس ضمن میں قدیم اور جدید کے امتزاج کی جس قدر فکر اور خواہش حضرت علامہ کو تھی اسی کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم ومغفور کی تحریروں میں اس امتزاج کی جھلک دیکھ کر حضرت علامہ نے انہیں دکن کی سنگلاخ زمین سے ہجرت کر کے پنجاب آنے کی دعوت دی اور اپنے ایک عقیدت مند چودھری نیاز علی مرحوم کے ذریعے پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اُن کے 'تمکّن' کی سبیل پیدا فرمائی ـــــ مجھے حضرت علامہ کے اس اقدام کا پس منظر نظر

آتا ہے کہ ان کے اس قطعے میں جو آج بھی ان کے مرقد کی زینت بنا ہوا ہے کہ ؎

بیا تا کارِ ایں امت بسازیم　　قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجد شہر　　کہ دل در سینۂ ملّا گدازیم

لیکن افسوس کہ مولانا مرحوم نے برصغیر کے مسلمانوں کی قومی جدوجہد کے نقطۂ عروج کے آغاز پر تو یہ کہہ کر قومی سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی تھی کہ 'میں مسلمانوں کا نہیں صرف اسلام کا کام کرنا چاہتا ہوں' ــــــ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد 'اسلام کے کام' کے لیے قومی ہی نہیں خالص سیاسی راستہ اختیار کر لیا۔ اس پر تو اس وقت میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ کاش کہ ایسا نہ ہوتا! اور مولانا مرحوم قیامِ پاکستان کے بعد بھی اپنے سابق انقلابی طریق کار ہی پر عمل پیرا رہتے، تاہم فکرِ اقبال کے شیدائیوں کی توجہ اس جانب مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس چیز کی اہمیت حضرت علامہ کو اس وقت محسوس ہوئی تھی وہ آج بھی نہایت اہم ہے! اور قدیم و جدید کے محکم امتزاج اور علماء حق کے تعاون واشتراک کے بغیر پاکستان کی قومی سیاست کے دھارے کے رخ کو اسلام کی جانب موڑنا ناممکن ہے۔

آخر میں جملہ شرکاءِ مجلس سے طویل سمع خراشی کے لیے معذرت خواہی کے ساتھ ساتھ کارکنانِ مرکزیہ مجلس اقبال کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے 'مجلس اقبال' میں شریک کی دعوت دے کر میرا اعزاز واکرام بھی فرمایا ــــــ اور مجھے یہ موقع بھی عنایت فرمایا کہ اپنا دردِ دل ایسے منتخب روزگار حضرات کی محفل میں بیان کر سکوں اور اٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین کے مطابق سب سے آخر میں شکریہ ادا کرتا ہوں اللہ کا کہ اس نے مجھے بھی تین دن کی مختصر مدت کے اندر اپنے خیالات کو قلمبند کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور میرے ساتھیوں کو بھی ہمت دی کہ اسی قلیل عرصہ میں اس کی طباعت کا مرحلہ طے کر لیا۔ اگر ہم سے کوئی خیر بن آئے تو یہ سب اللہ ہی کی توفیق سے ہوتا ہے اور خطا ہوتی ہے تو ہمارے نفوس کی شرارت سے۔

اقول قولی ھٰذا و استغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین و المسلمات

2

اقبال دشمنی مغربی ایجنڈے کا ایک حصہ ہے

عامرہ احسان

دین اسلام کے مقابلے کے لیے مغربی صہیونی ذہن نے سیکولرازم اور لبرل ازم کے عنوان سے پورا دین ایجاد کر رکھا ہے۔ فلمی ستارے، ناچ گانے کا کام کرنے والے گلوکار ڈانسر سب مغربی تہذیب کے نمائندے اور مبلغ ہیں۔ اور بدکاری، بے حیائی، شراب، ناچ گانا آوارگی اُن کی عبادات اور شعائر ہیں (ملک کی ایک گلوکارہ نے دو تین عشرے پہلے کہا تھا کہ میں گلوکاری کو عبادت سمجھ کر کرتی ہوں)، عریانی فحاشی اُن کی پہچان ہے۔ گزشتہ ایک صدی میں مغرب نے انسانیت کو کہاں سے کہاں تک گرادیا ہے؟ یہ معروف اہل قلم صحافی عامرہ احسان کے درج ذیل شذروں سے نمایاں ہے۔ پڑھیے اور مغرب کے چہرے کو پہچانئے وہ ہمارا دوست نہیں، ہمارا اور اسلام کا دشمن ہے۔ (مدیر)

1

موجودہ دور صرف ایٹمی دھماکوں کا دور نہیں بلکہ علم کے نت نئے دھماکوں، علم کی دھوم دھام، رعب داب اور حکمرانی کا دور ہے۔ اشاعت علم ہمہ نوع ہے۔ سائنسی علوم، دانشوریاں، فلسفہ ہائے زندگی۔ ہر کہ ومہ سقراط بقراط بنا بیٹھا ہے۔ اقبال کے دور میں ہندوستان پر انگریز کی حکمرانی میں اس علم وہنر نے بڑے بڑوں کی آنکھیں چندھیا، دھندلا رکھی تھیں۔ مسلمان صرف بندوق سے مسخر نہیں ہوا، اسے علمی، فکری مار دے کر بھی زیر کیا گیا

؎ آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی، طائرِ دیں کر گیا پرواز

دنیاوی تعلیم کا سحر پھونک کر فرنگی نے چپکے سے مسلمان کی متاع ایمان چرالی۔ اس دور کے علما و مشاہیر اس کے مرثیے پڑھتے رہے۔ اقبال اور اکبرالہ آبادی نے ہر رنگ میں یہ مضمون باندھا مسلمانوں کو باور کروانے کے لیے کہ وہ کیا پا کر کیا کھو رہے ہیں

؎ محسوس پر بناء ہے علوم جدید کی
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش

مگر تمام تر انتباہ کے باوجود تقاضائے شکم اتنے بلند آہنگ تھے کہ جب انتخاب کا یہ مرحلہ آیا کہ: فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم، تو فیصلہ شکم کے حق میں ہوا۔ بے خدا عصری علوم چھا گئے۔ دل خود ہی حکمرانی کی مسند سے رضا کارانہ دستبردار ہوگیا۔ دل کی دھڑکنیں بھی شکم کو منتقل ہوگئیں اور شکم دانہ دنکا، چارہ دیکھ کر بڑے بڑے فیصلے کرتا ہے! جو فصل ایک صدی پہلے کاشت ہوئی، اس کے جھاڑ جھنکار آج دیکھے جاسکتے ہیں۔ جو علم ہمیں بیچا گیا وہ زندگی کی حرارت، خیالِ بلند سے عاری بندۂ درہم و دینار بنا دینے والا علم تھا۔ اقبال نے اسے خوب برتا، جانچا، پرکھا اور کہا:

؎ یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے،
حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات!

اور یہ بھی کہ: تیرے محیط میں کہیں جوہر زندگی نہیں، ڈھونڈ چکا میں موج موج، دیکھ چکا صدف صدف یعنی یہ علم زندگی سے محروم، جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری والی تہذیب میں سے اٹھ کر مصنوعی روشنیوں سے مرعوب کرنے والا ہے۔ خدا پرستی سے ناآشنا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دلِ بینا میسر ہو تو آج سارے حقائق کھل چکے ہیں۔ اقبال کی ساری پیشین گوئیاں، تجزیے حرف بہ حرف درست ثابت ہورہے ہیں۔ ؎ تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا!

ہم ہی راستہ بھول گئے۔ شجر خبیثہ کی جو لازوال مثال خالق نے الفرقان، قرآن مجید میں دی تھی (سورۂ ابراہیم) وہ یہی شاخ نازک ہے، بے جڑ و بے بنیاد!

2

جن سائنس دانوں نے بلا دلیل اپنی خواہشات نفس پر اعلان کر دیا تھا عیاذاً باللہ کہ ’خدا مر گیا‘ وہ خود نسیاً منسیا ہو چکے۔ ان کی زندگیوں کا سرسری مطالعہ ہی ان کے دعووں کی حقیقت کھولنے کو کافی ہے۔ والٹیئر فاؤنڈیشن، روشن خیالی کے زبردست رائٹر والٹیئر کی خبر دیتی ہے۔ فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر نے اس کی 323 ویں سالگرہ پر نومبر 2017ء میں بتایا کہ کیسے یہ مشہور لکھاری توجہ حاصل کرنے کے لیے غلط بیانیاں کرتا رہا۔ حتیٰ کہ اپنی تاریخ پیدائش بارے اور اپنے باپ بارے جھوٹ بولتا رہا! نسب بدلتا رہا! فرانسس بیکن کی موت اس طرح واقع ہوئی کہ ایک سفر میں خیال آیا کہ کیا برف میں گلنے سڑنے کا عمل سست پڑ جاتا ہے؟ راستے سے مرغی خریدی اور اسے (جیتی جاگتی کو!) برف میں دبا دیا۔ اس سے جو سردی چڑھی (اور مرغی کی آہ سرد لگی) تو اسے لے ڈوبی اور وفات پا گیا۔ تجربہ پورا نہ ہوسکا۔ بابائے فزکس نیوٹن، فری لبرل معاشرے کا پرچارک خود اپنی شادی شدہ معشوقہ کے ساتھ اس کے شوہر کے گھر 1733ء کے بعد 15 سال رہا! فرائڈ، ڈارون غرضیکہ جس کی بھی ذاتی زندگی میں جھانکیں گے، سوائے فلسفے بگھارنے کے کوئی نمونے کا انسان ہاتھ نہ آئے گا۔ ہماری علمی متاع، سیرت وکردار کی تشکیل کے ساتھ علوم وفنون کی دنیا میں بھی وافر حصہ عطا کرتی ہے۔ علم دین اور علم دنیا میں (معلوم حدود وقیود میں رہتے ہوئے) کوئی مغائرت نہیں۔ علم ودانائی ہماری میراث ہے! گناہ کی تاریکیوں سے بچنے کی بنا پر مومن کی نگاہ زیادہ تیز ہوتی ہے، صلاحیتیں جلا پاتی ہیں۔ توحید اسے شرک کی وادیوں میں بھٹکنے سے بچا کر روشن پاکیزہ فراست عطا کرتی ہے! منتشر خیالی سے بچاتی ہے۔

مشرف دور سے ملک میں مغربی (جدید) جاہلیت لاگو کرنے کے جو سامان مغربی ایجنڈوں کی بنا پر فراواں ہوئے، اس نے بیس سالوں میں جوان ہونے والی نسل کو انتشارِ فکر کا مریض بنا دیا۔ بہ زبانِ اقبال ہمیں اپنے آپ سے اور جمال مصطفیٰ ﷺ سے بیگانہ کر دیا۔ فکر ونظر میں تشکیک کے کانٹے بو دیے۔ سیرت وکردار، اقدار اطوار سبھی مصطفوی کی جگہ ڈارونی، فرائڈی ہو گئے۔ عجب اود بلا ہجوم دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ (PSL اور سیاسی مجمعوں کا حال دیکھ لیجیے۔)

لبرل ازم سیکولرازم کے ماروں کو کلامِ اقبال کا لخلخہ سنگھا کر ہوش میں لایا جاسکتا ہے۔ جس کے بعد وہ.... قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان، اللہ کرے تجھ کو عطا جرأت کردار.... کی روشنی میں ایمانی جِلا پاسکتا اور دنیا کی رہنمائی (جس کے لیے وہ چن کر نکالا گیا تھا) کے لائق ہوسکتا ہے،فکری اور عملی غلامی سے نجات پا کر۔

اقبال کا سفر انہی راہوں سے ہو گزرا ہے جہاں آج کا نوجوان کھڑا کر دیا گیا ہے۔اس کی مغرب سے مرعوبیت، گھگھیاہٹ، ترس ترس کر، پلٹ پلٹ کر رشک آمیز نگاہوں سے مغرب کو دیکھنا! مقامی یونیورسٹیوں کی چھوٹی موٹی ڈگریاں،مخلوط تعلیم کی کشاکش، کانفرنسوں سیمیناروں میں شرکت (سیمی نار: انگریزی / عربی سیمی، آدھا / نیم۔نار، آگ،فکری آگ بھسم کر دیتی ہے عقل ودل ونگاہ کو بالعموم۔ اصطلاح اور اہتمام دونوں مغربی ہیں۔) مدرسہ ڈسکورسز نوعیت کے بظاہر چکاچوندی علمی اہتمام، ایمانی سرمائے پر نقب لگانے کے ٹھیک ٹھاک انتظام ہیں۔اقبال کو دیکھیے، وہ کیوں کر سرخرو ہو کر نکلے۔ایک نظر ان کا تعلیمی پس منظر ملاحظہ ہو، تاکہ یہ واضح رہے کہ مغربی تہذیب بارے ان کے خیالات مفروضوں یا ضد کی بنیاد پر نہیں ہیں، بلکہ بقول ان کے

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ، انگریزی ادب اور عربی میں بی اے، ایم اے کیا۔ بعدازاں اورینٹل کالج میں عربی کے استاد رہے۔انگریزی عربی فارسی جرمن زبانوں پر عبور حاصل تھا۔اسکالرشپ لے کر کیمبرج سے بی اے کیا۔اسی دوران لنکنز ان سے بیرسٹری بھی کی۔جب مغرب میں نت نئے سائنسی اکتشافات اور عقل کی جولانیوں نے یورپیوں کو خدا بیزار، مذہب دشمن بنا رکھا تھا، یہ وہی دور تھا۔اقبال نے میونخ (جرمنی) کی معروف یونیورسٹی سے فلسفے میں پی ایچ ڈی کی۔واپس آ کر گورنمنٹ کالج میں انگریزی، فلسفے کے استاد رہے۔وکالت زیادہ عرصہ نہیں کی۔ 1934ء میں مکمل ترک کر دی۔ یورپ قیام کے دوران ان کی شاعری میں عظیم انقلاب آیا جو اس عین الیقین کی بدولت تھا جو انہیں مغربی تہذیب وسیاست،قومیت، وطنیت، مادیت اور ان کے

انکارِ خدا کے براہِ راست مشاہدے سے ملا۔

1908ء سے 1938ء تک ان کی ہر تصنیف اور نظم میں یہ شدت احساس سمویا پرویا ہوا ہے کہ دنیا کی نجات اسلامی اصولوں کی تبلیغ و اشاعت میں مضمر ہے۔ 1907ء میں کہی نظم میں رنگ بھرتے باقی مہ و سال گزارے۔ مسلمانوں کو ذلت و نکبت کے گڑھے سے نکالنے کا غم انہیں لاگو تھا۔

میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری، نفس میرا شعلہ بار ہوگا

یورپ سے واپسی پر عالم اسلام پر جو قیامتیں ٹوٹیں، انگریز کی اسلام دشمنی کھل کر سامنے آ گئی۔ اقبال نے اپنی شاعری مسلمانوں کے دلوں میں ولولہ پیدا کرنے، تہذیب مغرب، تعلیم جدید کے خطرات سے آگاہی اور اپنے قلبی جذبات کی ترجمانی کے لیے وقف کر دی۔ نبی کریم ﷺ سے عقیدت بھی بے پایاں ہو چکی تھی۔ اس کا اظہار بھی قیمتی سرمایہ ہے۔ مغربی تعلیم کے مٹکے پی کر بھی ایمانی کیفیت، شیفتگی قابل رشک ہے۔ ہمارے والے تو چلو بھر پی کر ہوش کھو بیٹھتے ہیں، گورے کے سنگ آستاں پر دیدہ و دل فرش راہ کرتے ہیں۔ اپنی تحریروں کو اس دیس کے ناموں سے سجانے میں فخر و ناز پاتے ہیں! ٹائیاں سوٹ پہن کر ناز سے بھر جاتے ہیں۔

مومناں را گفت آں سلطانِ دیں
"مسجدِ من ایں ہمہ روئے زمیں"
الاماں از گردشِ نُہ آسماں
مسجدِ مومن بدستِ دیگراں
سخت کوشد بندۂ پاکیزہ کیش
تا بگیرد مسجدِ مولائے خویش

ترجمہ: اُس سلطانِ دین (ﷺ) نے مسلمانوں سے فرمایا: 'یہ تمام روئے زمین میری مسجد ہے'۔ نو آسمانوں کی گردش سے پناہ ہے کہ مسلمانوں کی مسجد، غیروں کے قبضے میں!۔ پاک فطرت بندہ زبردست جدوجہد کرتا ہے تا کہ اپنے آقا کی مسجد غیروں کے قبضے سے چھڑا لے۔

پانچواں باب

اسلام کی انقلابی فکر کی تجدید

(RECONSTRUCTION)

کے لیے آزاد ملک، زندہ قوم اور

ایک اجتماعی اُمنگ ناگزیر ہے

خطباتِ اقبال

IDEALISM اور REALISM

کے تناظر میں 304

خطباتِ اقبال

IDEALISM اور REALISM

کے تناظر میں

1۔ یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ علامہ اقبال کے خطبات بعنوان

"RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM"

ایک نادر کتاب ہے اور گزشتہ دو صدیوں کے احیائی کام اور اس کے پیچھے مصروفِ عمل شخصیات کے خیالات کا سب سے اہم مرقّع ہے۔ اوّلاً تو اس کتاب کا موضوع ہی ایسا ہے اور ثانیاً یہ خطبات عالمی سامراج کے دورِ عروج میں، صدیوں سے غلام قوم کے ایک نمایاں صاحب نظر کا مسلمان اُمت کے (1930ء کے خطبہ الٰہ آباد میں تجویز پاکستان سے قبل) ایک سنہرے مستقبل کی تعمیر و تشکیل و تنفیذ کے پیش نظر رہنما اصولوں کے طور پر سامنے لائے گئے تھے وارثانِ ممبر و محراب اور خاکسارانِ جہان تصوف کی جہاں تک رسائی تو کیا، کوئی فکر کی کمند بھی نہ ڈال سکے وہاں ایک درد دل کے مالک علامہ اقبال نے اپنے زندگی کے تجربات، مطالعہ، تعلیم، پیشہ، دیارِ مغرب کے اسفار اور غالب عالمی سامراج کو قریب سے دیکھنے کے بعد اسلامی روایات اور اسلامی قانون کا احترام کرتے ہوئے امت مسلمہ کے سامنے رکھے تھے۔

ان خطبات میں، مسلمانوں کے ذہین افراد جو ملت اسلامی کے مستقبل کے لیے فکر مند بھی ہوں اور سرگرم بھی، دینی تعلیمات پر عمل پیرا بھی ہوں اور اسلامی تعلیمات کی اقرارٌ باللسان کے ساتھ تصدیق بالقلب کے درجے پر کھڑے ہوں، FOOD FOR THOUGHT، ایک اہم

کرنے کا کام اور عصر حاضر میں مغربی افکار کے تناظر میں اسلامی تعلیمات کے اثبات کا داعیہ رکھنے والوں کے لیے ایک روشنی کے طور پر چند امور کا تذکرہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ’کَلَامُ الْمُلُوْکِ مُلُوْکُ الْکَلَامِ‘ کے مصداق علامہ اقبال جیسے نابغہ عصر شخصیت کی زبان وقلم سے نکلے ہوئے الفاظ اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں اور امت کے بہی خواہوں کے لیے ’اعتصام‘ کا پیغام بھی دیتے ہیں۔

ان سطور کے راقم کے نزدیک علامہ اقبال کے ان خطبات اور ان سطور کے ساتھ بین السطور بھی اہم ہے اور قابل لحاظ ہے۔

2۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خالق کائنات نے مسلمانوں کی غلامی اور دور غلامی کی کسمپرسی، ذلت، اسلامی اقدار کی بے قدری، مسلمانوں میں آرزو انقلاب اور آزادی کی اُمنگ کے پیش نظر ایک خطہ زمین تو ان خطبات کے بعد دو عشروں میں عطا فرما دیا مگر مسلمانان جنوبی ایشیا کے عمومی ماحول، غلامی کے زہریلے اثرات مغربی نظامِ تعلیم، مغربی سائنسی ترقی کو نظر کو خیرہ کرنے والی چمک دمک کے پیش نظر آج ایک صدی بعد بھی مجموعی طور پر آزاد ملک خداداد پاکستان میں ہنوز روز اول والی کیفیت ہے بلکہ جذبہ اور امنگ کے پیمانوں سے اس بھی بدتر۔ (واللہ اعلم)

3۔ ان خطبات کو سمجھ کر ان پر نقد وجرح کرنے والے اس وقت بھی کم تھے اور آج بھی کم ہیں۔ پھر ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی کتاب ’اسلام کا سیاسی نظام‘ میں علامہ اقبال کا ایک انقلابی جماعت کی تشکیل کے لیے کوششوں کا بے سود ہونا ایک سوالیہ نشان ہے اور تنظیم اسلامی کے سابق امیر حافظ عاکف سعید صاحب کی کتاب ’علامہ اقبال کی آخری خواہش‘ کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں آزادی سے آگے اس آزاد ملک میں ’اسلامی انقلاب‘ لانے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کرنے والے لوگ تیار کیے جائیں۔ کہاں ہیں۔ کچھ جماعتیں، کچھ افراد اور علمی، تحقیق اور تعلیمی میدان میں مصروفِ عمل اہل علم کی تعداد 22 کروڑ کی آبادی میں ایک فی صد (22 لاکھ) تو بہت بڑی تعداد ہے ایک فی ہزار بھی ہوں تو غنیمت ہے۔

4۔ پھر یہ بات بھی ایک نوشتۂ دیوار (WRITING ON THE WALL) ہے کہ اگر کوئی نصب العین ایک ہی مرحلہ میں حاصل ہونے کے امکانات کم ہوں تو اس کے حصول کے لیے اس

مشن کے کئی مراحل طے کر کے مرحلہ وار کوشش کی جائے (کہ ایک مرحلہ کے بعد دوسرا مرحلہ شروع ہو) تو وہ نصب العین ممکن الحصول نظر آتا ہے۔ تعلیمی شعبے میں پرائمری، ہائی سکول اور کالج کی تعلیم کئی کئی سالوں کے نصاب میں تقسیم کر کے حاصل کی جاسکتی ہے۔ مزید آسان مثال یہ ہے کہ اگر کوئی ہمت والا انسان یہ چاہے کہ میں ایک جست میں زمین سے کمرے کی چھت پر پہنچ جائے تو زیادہ امکان ہے وہ عام حالات میں اتنا بڑا ہائی جمپ (HI-JUMP) لگانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اگر اسی کمرے کے ساتھ بارہ پندرہ STEPS والی سیڑھی بنا دی جائے تو بڑے اور بوڑھے کیا بچے اور خواتین بھی اس کمرے کی چھت پر پہنچ سکتے ہیں۔

5۔ یہی حال اُمت مسلمہ کی تشکیل جدید (RECONSTRUCTION) کے ضمن میں گذشتہ ایک صدی کی محنت کا ثمر ہے کہ ہم وہیں کے وہیں کھڑے ہیں اور روز اوّل والی کیفیت ہے۔ علامہ اقبال خود بھی ان خطبات کے بعد برطانوی سامراج سے آزادی کی صورت میں امت مسلمہ کے اس نوزائدہ ملک کے 'قانون' کے لیے فکرمند تھے۔ جس عنوان پر ان کے خطبات میں چھٹا خطبہ ہے THE PRINCIPLE OF MOVEMENT IN ISLAM جس کا بجا طور پر ترجمہ ''اسلامی تعلیمات میں اجتہاد کا تصور'' کیا گیا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں اجتہاد کے لیے جو بنیادیں ہیں وہ قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس ہیں۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ پہلے بھی اور آج بھی یہ کسی فرد واحد کا کام نہیں ہے ورنہ اختلافات پیدا ہوں گے، بڑھیں گے اور درمیان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا گوہر مقصود عنقا ہو جائے گا۔

6۔ علامہ اقبال کی یہ عظمت ہے کہ وہ عربی کے استاذ ہونے، مغربی افکار کو اعلیٰ علمی سطح پر سمجھنے اور قانون کے شعبے میں اعلیٰ ترین قابلیت (بیرسٹری) کے حامل ہونے کے باوجود اکیلے اس کام کو کرنے کے روادار نہیں تھے۔ صرف چند دوستوں کو جمع کر کے ایک فورم پر یہ کام ہوسکتا ہوتا تو علامہ اقبال جیسے ملکی سطح کے جانے پہچانے رہنما (LEADER) کے لیے ناممکن نہیں تھا۔

آپ نے اس سلسلہ میں جامعہ از ہر مصر کو خط لکھ کر کسی ایسے عالم دین کو لاہور بھیجنے کی درخواست کی جو انگریزی زبان اور جدید قانون کے ساتھ قرآن اور دیگر دینی علوم کا ماہر ہو۔ مگر

وہاں سے جواب نفی میں ملا۔ (اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہاں بھی برطانوی سامراج کی حکومت تھی کہ ایسا آدمی مہیا نہ کیا گیا ہو۔ جیسا کہ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے اپنی کتاب 'اسلام کا سیاسی نظام' میں لکھا ہے کہ علامہ اقبال کا اپنے نوجوان بہی خواہوں پر مشتمل 'شبان المسلمین' کے نام سے ایک انقلابی جماعت بیعت کی بنیاد پر بنانے کا ذہن تھا جس کے لیے کئی اجلاس ہوئے جن میں خود ڈاکٹر برہان احمد فاروقی زمانہ طالب علمی میں شریک ہوتے رہے۔ مگر اس کام کا آغاز نہ ہو سکا۔ بعد میں ایک خط میں علامہ اقبال نے لکھا کہ آخری اجلاس میں غالباً 14 آدمی شریک تھے جن میں سے آدھے سے زیادہ افراد حکومتی خفیہ ایجنسی کے آدمی تھے یعنی حکومت ہند علامہ اقبال کے مغرب مخالف بلکہ معاندافکار کے پیش نظر ان پر مصلحتاً ہاتھ نہ ڈال سکی مگر ان کی سرگرمیوں پر تو گہری نظر رکھتی تھی۔)

7۔ یہ بات بھی اقبالیات سے وابستہ افراد جانتے ہیں کہ علامہ نے مولانا محمد انور شاہ کاشمیریؒ سے خط و کتابت فرمائی کہ وہ لاہور منتقل ہو جائیں تا کہ مستقبل قریب میں ایک نوزائیدہ مسلم ریاست کے لیے قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے قانونی ڈھانچہ تیار کیا جا سکے۔ مگر اللہ کو منظور نہیں تھا اور 1933ء میں مولانا انور شاہ کاشمیری انتقال فرما گئے اور یہ کام نہ ہو سکا۔

علامہ اقبال کی عقابی نگاہ بہت دور حیدر آباد دکن میں ایک جوان مولانا مودودی پر جا پڑی۔ خط و کتابت کے بعد ان کو لاہور آنے کی دعوت دی تا کہ مستقبل کی اسلامی ریاست کے لیے قانون (CODIFIED LAW) تیار کیا جا سکے۔ اس لیے کہ کہنے کو تو اسلامی قانون کا ماخذ قرآن و سنت ہے مگر سب لوگ جانتے ہیں کہ پاکستان میں ضلعی سطح پر ہر سول جج اور سیشن جج کے دفتر میں قرآن پاک اور صحاحِ ستہ (حدیث کی اہل سنت کی چھ مستند کتابیں) رکھوا دی جائیں کہ ان کو دیکھ کر مقدمات کا خود فیصلہ کرلو، یہ طریقہ انصاف اور عدل کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔ جج کے لیے تو CODIFIED LAW شق دار درکار ہے یہ 'اجتہاد' اور استنباط کا کام اعلیٰ عدالتوں یا اداروں کا کام ہے کہ ان اصولوں کے مطابق قانون سازی کر کے جج حضرات کو عمل درآمد کے لیے 'سول لاء' اور کریمنل لاء کی کتابیں فراہم کر دیں۔ بالآخر مولانا مودودی بمشکل اس کام پر راضی ہوئے اور وہ شدّ رحال کر کے فروری 1938ء میں پنجاب منتقل ہوئے۔ علامہ اقبال ہی کے قدردان اور ہم خیال

ایک زمیندار نے ضلع گورداسپور میں ریلوے لائن کے ساتھ اپنے رقبہ میں دارالاسلام پٹھانکوٹ قائم کیا۔ضروری عمارات تعمیر کرائیں وہاں حیدرآباد دکن سے یہ قافلہ آ کر ٹھہرا، خیال تھا کہ جلدی علامہ اقبال سے ملاقات ہوگی اوراسلامی قانون سازی پر کام کا آغاز کیا جائے گا مگر یہ بھی اللہ تعالیٰ کومنظور نہ تھا21 اپریل 1938ء کوعلامہ اقبال وفات پا گئے۔کاش مولانا مودودی اس کام کو لے کر آگے بڑھتے ،مگرہوتا وہی ہے جواللہ چاہتا ہےمَا شَآءَ اللّٰهُ كَانَ وَ مَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ۔

قارئین کرام کے لیے یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ پاکستان کی آزادی کی تاریخ طے ہونے اور قریب آنے پر قائداعظم محمد علی جناح 11 اگست 1947ء کو کراچی پہنچے۔ کئی اجلاسوں میں 14 اگست کی تیاریاں کرنے کے مشورے ہوئے۔ صدیوں بعد مسلمانوں کو ایک آزاد مملکت کا انتظام وانصرام مل رہا تھا۔ایک اہم مسئلہ یہ بھی درپیش ہوا کہ اس ملک کا قانون کیا ہوگا؟ جواب ندارد۔ یہ کام علامہ اقبال نہ کر سکے علماء کرام کو نہ اس وقت احساس تھا اور نہ آج ہے کہ عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق قانون کی فراہمی ازبس ضروری ہے۔کافی انتظار کے بعد قائداعظم نے برطانوی قانون کی کتابیں منگائیں اوران پر انڈیا کاٹ کر پاکستان لکھ دیا۔اللہ اللہ خیر صلا۔

قارئین کرام اوراہل فکر ونظراس کام کی اہمیت کو سمجھیں کہ اگر قائداعظم کے سامنے اس وقت کوئی مسودہ قانون ہوتا تو نافذ ہو جاتا۔مگر بسا آرزو کہ خاک شدہ کے مصداق وہ برطانوی قانون مجریہ 1860ء آج بھی اقبال کے عقیدتمندوں کا منہ چڑا رہا ہے مگر ہم اسی قانون کے تحت جینے کو ترجیح دیتے ہیں۔

آج بھی اس طرح کے مسودہ قانون کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی 1947ء سے پہلے تھی مگر کرے کون؟ علامہ اقبال نے اسی عظیم کام کے لیے زمین ہموار کرنے کا کام کرنے کی کوشش فرمائی مگر گوہر مقصود ایک صدی بعد بھی دور دور تک حاصل ہونے کے امکانات مفقود ہیں۔

چھٹا باب

علامہ اقبال کا تجویز کردہ
'اجتہاد' کا راستہ
اور
گوہر مقصود کے حصول میں ناکامی پر
آج ہمیں خطبات کی روشنی میں ہی
'اجتہاد' کی ضرورت ہے

علامہ اقبال کے اجتہاد کا بیانیہ
ان کی تحریروں اور واقعات کی روشنی میں

312

علامہ اقبال کے اجتہاد کا بیانیہ
ان کی تحریروں اور واقعات کی روشنی میں

اس بیانیہ کے دو پہلو بالکل سامنے کا معاملہ ہے

1۔ اسلامی قانون کے بارے میں اجتہاد قرونِ اولیٰ اور اس کے مابعد قریب کے زمانے میں زیادہ تر انفرادی سطح پر قدآور شخصیات کے ذریعے ممکن ہوا۔ قدرت کو منظور ہوتا تو علامہ اقبال جیسا عبقری انسان علماء کے جلو میں اس مشکل کام کو کر گزرتے۔ اگرچہ علامہ اقبال کا اس کام میں لیکچرز کا اہتمام، ان کی طباعت واشاعت، ان کے تراجم اور تبصرے بہت اہمیت رکھتے ہیں مگر سب پر فائق چند اہل علم وعلماء کرام کا اس کے بارے میں دلچسپی کا اظہار ہے یہی امر حصولِ مقصد کے لیے تائید کے مثبت اشارے ہیں۔

اس سمت میں گزشتہ ایک صدی میں قیامِ پاکستان کے بعد کیا پیش رفت ہوئی وہ سب ہمارے سامنے اور ماضی قریب کا معاملہ ہے اس کے لیے داخلی رکاوٹیں بھی ہیں اور خارجی رکاوٹیں بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ داخلی رکاوٹوں میں سب سے بڑی رکاوٹ فقہی معاملات میں ایک اُفقی (HORIZONTAL) اور ایک عمودی (VERTICAL) تقسیم کا حد درجے مضبوط ہونا ہے۔

اُفقی تقسیم میں دورِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) کا زمانہ مشہود لہا بالخیر کا حامل ہے اس کے بعد تابعین کا پھر دورِ ملوکیت (مُلکًا عاضًّا) ہے جس کا علامہ اقبال نے خطبہ الٰہ آباد میں تذکرہ فرمایا ہے، اس دور کے حکمران بہرحال تھے تو مسلمان ہی۔ اس کے بعد قحط الرجال کے ساتھ ساتھ مُلکًا جبریًّا یعنی غیر مسلم استعمار کی غلامی کا دور ہے۔ علماء کے نزدیک فقیہ علماء میں بھی

تخصص فی الفقہ اور زمانۂ نبوت کی قربت کے لحاظ سے طبقات ہیں۔اس میں ایک مشہور اصطلاح علماء متقدمین اور علماء متأخرین کی ہے۔

دوسری تقسیم عمودی ہے جس میں اسلام کے مجموعی دین کے اندر اندر اہل سنت کے چار فقہی مسالک و مذاہب ہیں۔ ایک فقہ جعفریہ ہے اس کے علاوہ علماء ظواہر میں ایک قابل احترام طبقہ امام بخاری کا ہم خیال ہے۔ ماضی کی اس فقہی و علمی تفصیل سے یکسر علیحدہ نہیں ہوا جاسکتا ہے۔

2۔ دوسرا پہلو اس ضمن میں بہت اہم ہے کہ ان لیکچرز کے معاملہ میں علامہ اقبال کے لیکچرز، نثر اور شاعری کوئی علیحدہ شئے (ENTITY) نہیں ہے بلکہ اہل فکر و نظر اور علامہ اقبال کے معتقدین اور ناقدین سے گزارش ہے کہ وہ علامہ اقبال کی نثر اور شاعری کو بیک وقت سامنے رکھیں۔ پھر ہر شخص کے خیالات پر عمر کے ساتھ اور وقت (زمانے) کے ساتھ خارجی حالات و واقعات اور بعض مفروضوں کے منطقی نتائج کے سامنے آنے پر اثرات مرتب ہوتے ہیں اور خیالات و افکار میں تبدیلیاں آجاتی ہیں۔عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ علامہ اقبال کا 1920ء کی دہائی کی نثر اور کلام کو 1930ء کی دہائی اور نثر کے ساتھ ملاکر (آج کی ایک اصطلاح میں PAGE پر لاکر) پڑھنا، سمجھنا اور پیش کرنا ضروری ہے۔

اس قضیئے کی تھوڑی وضاحت ضروری ہے۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں

- مثلاً علامہ اقبال کا اجتہاد سے متعلق لیکچر، دسمبر 1924ء کا ہے جس میں علامہ اقبال نے ترکوں کی مثال دی ہے اور اس کی تصویب کا اشارہ دیا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں مصطفیٰ اتاترک ترکی میں نیا نیا آیا تھا اور ملک میں قانونی، انتظامی، نظریاتی تبدیلیاں لا رہا تھا۔اس نے 3 مارچ 1924ء (بمطابق 28 رجب 1342ھ) کو قانون تنسیخ خلافت منظور کرا کے نظامِ خلافت کا باب ترکی آئین و قانون میں مستقلاً بند کر دیا تھا اور مارچ تا دسمبر 1924ء کے تازہ حالات و واقعات کی تفاصیل حاکم سامراج برطانوی سامراج کے غلام علاقے میں دینا نہیں چاہتے تھے۔اس لیے کہ مصطفیٰ اتاترک کو لانے والے وہ خود ہی تھے اور تنسیخ خلافت کا کام بھی سامراج کا منصوبہ تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ عرصے بعد علامہ اقبال کا خود ذہن بدل گیا (زندہ انسان اپنے افکار و

نظریات میں ردّوبدل میں تراش خراش کرتے رہتے ہیں بقول قائداعظم ONLY STONES DO NOT CHANGE یہ حقیقت ہے۔) علامہ اقبال نے ضربِ کلیم میں وہ اشعار کہے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ مجھے پہلے مصطفیٰ اتاترک اور رضا شاہ پہلوی سے کچھ اُمیدیں اور توقعات تھیں مگر وقت نے ثابت کیا ہے کہ دونوں اس کام کے اہل نہیں تھے۔

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں ہے نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

◐ اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ علامہ اقبال کے ان خطبات کے ایک نامور شارح جناب محمد سعید شیخ صاحب ہیں جنہوں نے ان خطبات پر تحقیق کر کے علامہ اقبال کے بولے ہوئے ہر لفظ اور جملے کا حوالہ تلاش کر کے خطبات کے خصوصی ایڈیشن میں دیا ہے۔ یہ بہت بڑی خدمت ہے جو انہوں نے سرانجام دی ہے اپنی کتاب کے شروع میں انہوں نے ایڈیٹر کی طرف سے اس کتاب پر دیے گئے حوالہ جات کے بارے میں ایک تعارفی نوٹ دیا ہے یہ کتاب 1984ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ نے بڑے اہتمام سے چھاپی ہے اس میں صفحہ (xvi) اور (xvii) پر وہ تحریر کرتے ہیں:

Composition of Lecture VI, thus, appears to be spread over a longer period of time than is the case with other Lectures; even as Allama's interest in the 'idea of Ijtihad in the Law of Islam' and thereby in the entire methodology of Muslim Jurisprudence-recurrently visible in the last fifteen years of his life-is much more sustained than his interest in many other subjects, including a good many that he came across in his avid and vast reading of the great Western philosophers.

In a press interview, a little before the second Round Table Conference, the Allama expressed

his intention of writing a book on 'the system of fiqh in the light of modern knowledge', another 'work reconstruction' on the legal aspect of Islam, much more important than its purely theological aspect. To this second work of reconstruction, his present work of reconstruction on the philosophical aspect of Islam, he added with his usual modesty, was 'necessary as a prelude'. The much cherished book: 'The Reconstruction of Legal Thought in Islam' was, however, not written: but the bare fact that the Allama wanted to write it and the great importance that he attached to the writing of it, signifies, perhaps, his will to posterity.

اوپر دیے گئے اہم حوالہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خود علامہ اقبال کے خیالات میں تبدیلی آ گئی تھی۔

اوپر درج عبارات سے پہلے والا پیراگراف اس خطبہ اجتہاد کی تشکیل کے زمانہ کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک طویل غور و فکر کے بعد ہی علامہ اقبال اس لیکچر کو پیش کرنے کے قابل شکل دے سکے تھے۔ اور ایک مدلل قضیئے کے طور پر اہل وطن مسلمانوں کے سامنے رکھا تھا۔

As to the passages which have been quoted in Lecture VI and could be traced to their originals, there are good reasons to believe that all the three passages quoted from Nicolas Aghnides' Mohammedan Theories of Finance (a copy of which was presented to the Allama in March- April 1923), in the latter part of this Lecture, belong to the period of Allama's writing his paper on the 'Idea of Ijtihad in the Law of Islam' in 1924. This also seems to be true of Ziya Gokalp's poems translated by the Allama from Aus der riligiosen

Reformbewegung in der Turkei (1922) a copy of which he did receive in April 1924 from the author, August Fischer, then also the editor of Islamica. In one of his letters to Sayyid Sulaiman Nadvi, the Allama clearly refers to his having made use of Ziya Gokalp's poems in his paper on Ijtihad. There are, however, at least two passages which, with some good measure of certainty, can be said to belong to later dates. I mean the passage in the beginning of Lecture VI from Denison's Emotion as the Basis of Civilization, published in 1928; and, secondly, the passage from Al-Hujjat Allah al-Balighah which, as stated earlier, is to be linked with Allama's letter to Sayyid Sulaiman Nadvi on 22 September 1929.

- علامہ اقبال ایک معتدل مزاج اور جہاندیدہ مسلم سکالر ہیں وہ ایسی نازک علمی باریکیوں کو کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔ آج کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اسلامی اجتہاد میں حدیث کی اہمیت نہیں رہی کہ وہ صرف اپنے وقت اور زمانے کے لیے تھی ایک بڑی جسارت ہے۔ حدیث تو فرامین مصطفیٰ ﷺ ہیں اور قرآن گویا ہے کہ

وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی O اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی O (303-02:52)

”اور نہ وہ (نبی ﷺ) خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں۔ یہ قرآن تو وحی ہے جو ان کی طرف بھیجی جاتی ہے۔“

اسی لیے دین میں وحی متلو اور وحی غیر متلو کی اصطلاح موجود ہے اور اس کے حق میں وقیع مواد ہے۔ اس پر قیاس فرمائیں کہ عام آدمی کی کہی ہوئی کسی بات کو آئندہ چند صدیوں بعد کے لیے ’لازم‘ اور ناقابل تغیر قرار دے دینا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ چنانچہ علامہ اقبال نے اپنے لیکچرز کے بالکل ابتداء میں ہی بات یہاں سے شروع کی ہے۔ خطبات کے PREFACE میں علامہ اقبال

نے لکھا ہے کہ:

In these lectures, which were undertaken at the request of the Madras Muslim Association and delivered at Madras, Hyderabad, and Aligarh, I have tried to meet, even though partially, this urgent demand by attempting to reconstruct Muslim religious philosophy with due regard to the philosophical traditions of Islam and the more recent development in the various domains of human knowledge. And the present moment is quite favourable for such an undertaking. Classical Physics has learned to criticize its own foundations. As a result of his criticism the kind of materialism, which it originally necessitated, is rapidly disappearing; and the day is not far off when Religious and Science may discover hitherto unsuspected mutual harmonies. It must, however, be remembered that there is no such thing as finality in philosophical thinking. As knowledge advances and fresh avenues of thought are opened, other views, and probably sounder view than those set forth in these lectures, are possible. Our duty is carefully to watch the progress of human thought, and to maintain an independent critical attitude towards it.

- قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے خود ماحول میں جاری زمانی تسلسل میں انسان کا مستقبل میں دور تک نہ دیکھ سکنے کی کمزوری کا ذکر فرمایا ہے کہ:

کسی انسان کی موت کی صورت میں اسلامی قانونِ وصیت میں تدریج نظر آتی ہے انسانی طبائع کو اپنی جائیداد کو تقسیم کرنے اور اولاد میں بڑے بیٹے کا والد کی جائیداد پر قابض ہونے کی متداولہ عمل

کے بارے میں سورۃ بقرہ (02-181) میں آیا ہے کہ ابتدائے اسلام میں حکم یہ تھا کہ فوت ہونے والا انسان خود موجود افراد کے سامنے وصیت کرے اور جائیداد کی تقسیم پر ہدایت دے۔ اولاد میں جائیداد کی تقسیم کا اختیار فوت ہونے والے کی صوابدید پر تھا۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے کہ اگر حاضر افراد (یا فرد) میں سے کوئی محسوس کرے کہ فوت ہونے والے نے کسی 'وارث' کے بارے میں جانبداری یا اعراض برتا ہے کسی بیٹے کو زیادہ اور کسی 'وارث' کو ناراضگی کی وجہ سے کم کی وصیت کی ہے تو وہ شخص اس میں مناسب اور معقول تبدیلی کر سکتا ہے۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾

"اگر کسی کو وصیت کرنے والے کی طرف سے (کسی وارث کی) طرفداری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو تو اگر وہ (وصیت کو بدل کر) وارثوں میں صلح کرادے تو اس پر کچھ گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا (اور) رحم کرنے والا ہے"۔

گویا وقت کے ساتھ عام حالات میں کسی قضیئے میں متقدمین کی ایک رائے ہے حالات بدل گئے ہیں تو متاخرین اس میں تبدیلی کے روادار ہیں۔ (وراثت کے تفصیلی احکام نازل ہونے (سورۂ نساء: رکوع 2) کے بعد اب یہ آیات صرف وراثت کے مال میں ایک تہائی حصہ کے بارے میں ہو سکتی ہے جو فوت ہونے والا قانونی وارثوں کے علاوہ دوسرے حضرات یا رفاہ عامہ کے کاموں کے بارے میں کر سکتا ہے۔)

◐ علامہ اقبال کے فکر میں برطانوی سامراج کے پیچھے صیہونیت اور 'یہودی ذہن' کا عنصر فیصلہ کن حد تک مؤثر ہونا جتنا 1930ء کی دہائی میں واضح ہوا وہ پہلے نہیں تھا۔ چنانچہ ضربِ کلیم میں پہلے فرمایا۔

ع فرنگ کی رگِ جاں پنجہ یہود میں ہے

اور ایک جگہ (در اسرار شریعت) فرمایا:

ایں بنوک ایں فکر چالاک یہود
نورِ حق از سینۂ آدم ربود

؎ تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

اور 1936ء میں ابلیس کی مجلس شوریٰ میں صہیونی برطانوی سامراج کی وہ دھجیاں بکھیری ہیں کہ آج کے بہت سے مداحین اقبال اس سطح تک بلند ہو نہیں سکتے۔

؎ ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے، جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے!

کاش مداحین اقبال کا طبقہ اپنے سیرت و کردار میں اس بات کا نقشہ پیش کرے جس سے ابلیس کو خوف آتا ہے۔

؎ ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات!

گویا علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں جو کچھ فرمایا تھا ان خطبات کو علامہ کی اسی دور کی شاعری کے علاوہ دس بیس برس بعد کے خیالات کی روشنی میں ہی دیکھنا اور پرکھنا عقلمندی کا تقاضا ہے۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

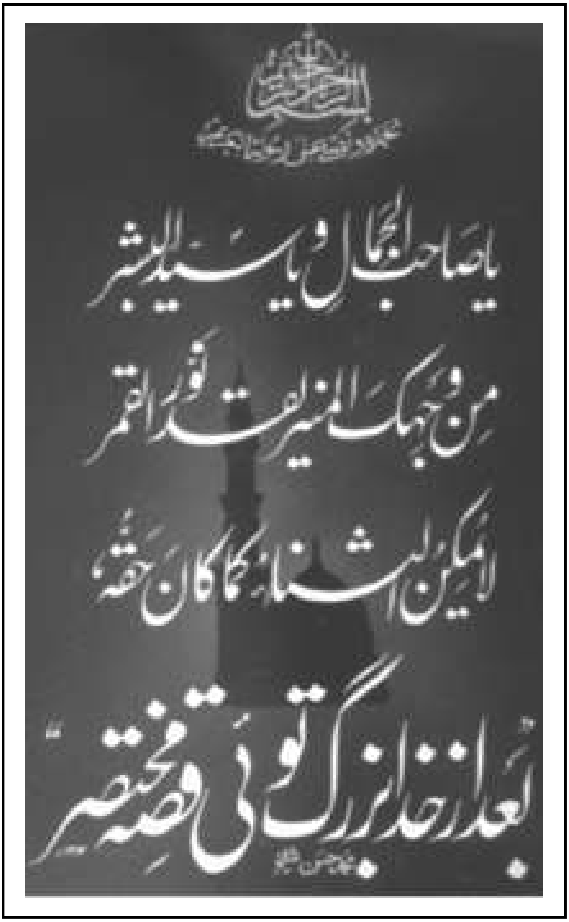
یا صاحب الجمال و یا سید البشر
من وجہک المنیر لقد نور القمر
لا یمکن الثناء کما کان حقہ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

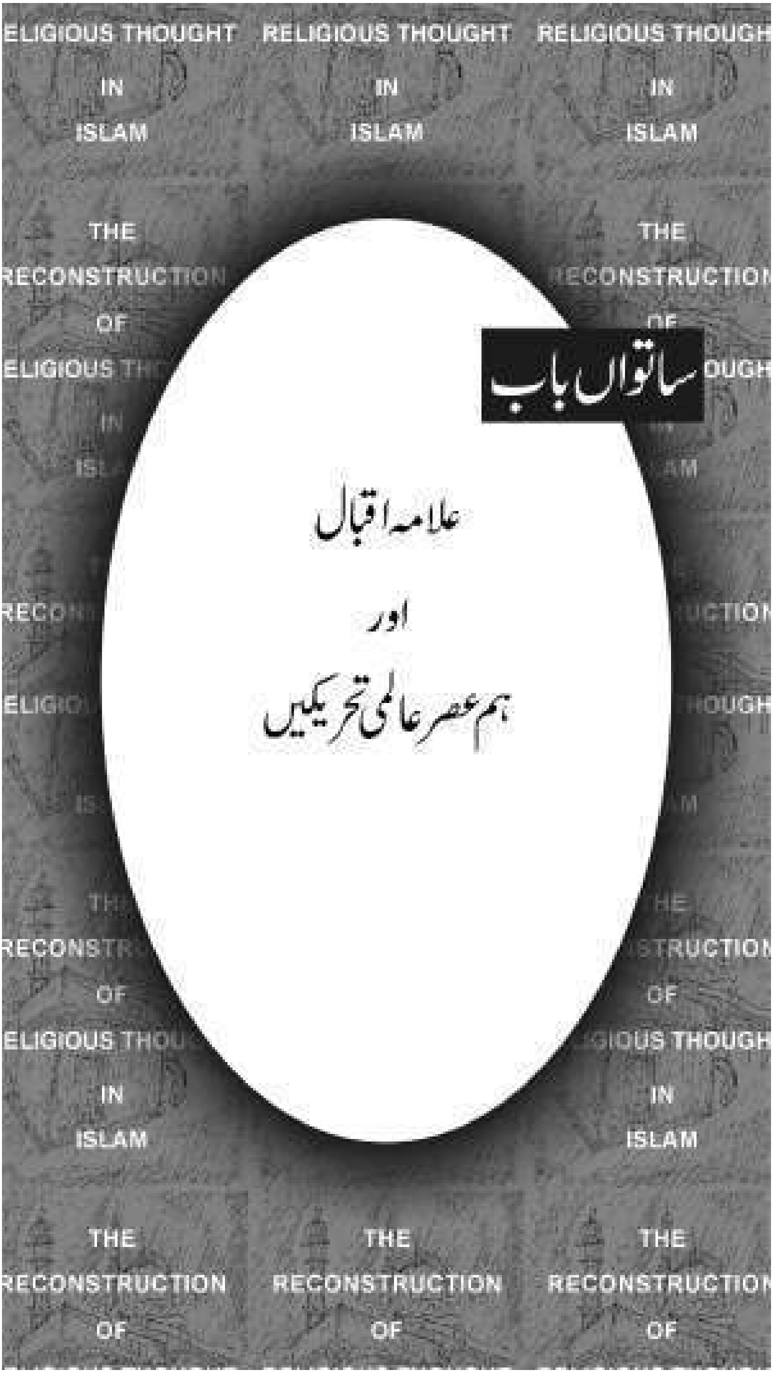

ساتواں باب

علامہ اقبال
اور
ہم عصر عالمی تحریکیں

جنوبی ایشیا کے اہم مسلمان رہنما
___اور ہم عصر عالمی تحریکیں

324

ا۔ قومی رہنمائی اور علاقائی و عالمی حالات

ب۔ برطانوی سامراج کے ماحول میں مسلمان رہنما

ج۔ تحریک محمد بن عبدالوہاب کے اثرات

د۔ روسی معاشی انقلاب اور اس کے بانی کارل مارکس

ہ۔ جرمنی کا ہٹلر اور اس کی نازی پارٹی

و۔ علامہ اقبال اور معاصر مسلم رہنما

جنوبی ایشیا کے اہم مسلمان رہنما
ــــ اور ہم عصر عالمی تحریکیں

(ا) قومی رہنمائی اور علاقائی و عالمی حالات

1۔ انسان ماحول سے متأثر ہوتا ہے اور ماحول کو متأثر کرتا بھی ہے۔ ایک رہنما جہاں اپنی سوچ فکر اور نظریہ سے ایک مجموعہ افراد یا قوم کو متأثر کرتا ہے تو ــــ عین اسی وقت وہ خود جب آئندہ کا لائحۂ عمل تیار کر رہا ہوتا ہے اور فکری سطح پر آئندہ کے حالات کا تانا بانا بن رہا ہوتا ہے وہ ماحول میں دیگر ایسے افراد جو اپنی اپنی قوم کی ذرا فاصلے پر کسی دوسرے زاویے اور نظریے سے رہنمائی کا فریضہ سرانجام دینے میں سرگرم ہوتے ہیں، ان سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

2۔ اس اثر پذیری میں ایک لازمی عنصر علمی سطح کا فرق بھی ہوسکتا ہے اور قوم کی مجموعی صلاحیت، قوت کار اور قومی رویوں کا بھی ہوسکتا ہے۔ قومی سطح پر جاری منفی رجحانات کا شدید ردّ عمل بھی ہوسکتا ہے۔

نتیجتاً عام انسان کی طرح ہر قوم کے مصلحین و رہنما بھی دوسرے رہنماؤں سے اثر پذیری سے مستثنٰی نہیں ہیں بلکہ یہ ایک مثبت صفت اور خوبی ہے کہ اپنے راستے اور فکر کی کوئی کمی، ہلکی سی کجی یا کسی خطرے کو محسوس نہ کر سکنے کے احساس کو یکسر نظر انداز کر کے قوم کو کسی تباہی سے دوچار کر دیا جائے ــــ اس صورت حال سے کہیں بہتر ہے کہ قومی رہنما بھی اپنی سطح پر گرد و پیش کا مطالعہ و ملاحظہ و مشاہدہ کرتے رہیں اور اپنے سفرِ اصلاح و کامیابی کے پیچ و خم سے عقلمندی اور کامیابی

سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے 'منزلِ مراد' تک پہنچ جائیں اور اپنی قوم کو معاصر اقوام کے مقابلے میں کامیاب کر کے دکھا دیں۔

- مادی سطح پر بھی کائنات میں ہر لحظہ، ہر جگہ ایک کشاکش جاری ہے اور دوسری قریبی ہم جنس (افراد، اقوام، مجموعہ افراد، سلطنتوں، ملکوں، زمینداروں، پڑوسیوں، دفتری COLLEGUES نیز کھیل کے میدان میں بھی مخالفت ہی نہیں، اپنی ٹیم کے افراد) میں بھی مسابقت اور آگے بڑھنے کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ مصروف کار اکائیوں کے درمیان یہ 'جہادِ زندگانی' ناگزیر ہے زندگی کا حصہ ہے اور کامیابیوں اور کامرانیوں کا زینہ متصور ہوتا ہے۔

اسی جذبے کو تفہیم کے لیے ایک نام دیا گیا ہے اور وہ ہے STRUGGLE FOR EXISTANCE یا عربی میں جہد للبقاء یا جہادِ زندگانی۔

(ب) برطانوی سامراج کے ماحول میں مسلمان رہنما

آیئے ـــــ راستہ دیکھنے اور دکھانے کے عمل میں کارآمد اس تجرباتی اصول کی ٹارچ کی روشنی میں برصغیر کی گذشتہ دو صدیوں کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں:۔

اٹھارھویں صدی کا وسط ہے، امت مسلمہ دنیا بھر کے قابل لحاظ رقبوں پر حکمرانی کے پھریرے لہرا رہی ہے۔ چھوٹی چھوٹی، معمولی اور قومی و مجموعی رفتار کو فوری متاثر نہ کر سکنے والی مزاحمتی سرگرمیاں ہمیشہ اور ہر دم روئے ارضی پر جاری رہتی ہیں۔ کوئی مملکت اور حکومت اس سے کلیتہً گلوخلاصی حاصل نہیں کر سکتی یا مبّرا نہیں ہو سکتی۔

ذرا ماضی میں دیکھیں ـــــ

- 1492ء میں سقوطِ غرناطہ ہو جاتا ہے۔ اس واقعہ کے عوامل سرگرم ہیں اس 'حادثہ فاجعہ' کے اثرات ایک طرف امت مسلمہ کو متأثر کرتے ہیں اور دوسری طرف اس کے اثرات و عواقب یورپی عوام اور حکومتوں پر مترتب ہوتے ہیں۔
- گزشتہ کئی صدیوں سے اندلس (سپین) میں جاری مسلم حکومت کے امن و آتشی کے دور میں مسلمان اپنے ذہن کے مطابق تجرباتی علوم اور آسمانی علوم کو اپنے قول و عمل سے پھیلانے کے عمل میں مصروف ہیں جس سے یورپی نوجوان (آج کے مشرق و مغرب کی طرح) علم کے

حصول کے لیے غرناطہ اور اشبیلہ کی درسگاہوں کا رخ کرتے ہیں اور علم کے سرچشموں سے سیراب ہوکر وطن لوٹتے ہیں۔ آنکھ کھلتی ہے، جذبہ مجبور کرتا ہے مگر مسیحی مذہب کے غیر منطقی رویے اور مُتحجّر قسم کے سخت غیر منطقی عقائد راستے کی رکاوٹ ہیں سائنس اور سائنسی رویے اپنا راستہ نہیں پاتے۔ سقوطِ غرناطہ کے بعد بنی اسرائیل نے مسیحیت سے ایک نظریاتی جنگ لڑی اور مذہب اور حکومت یا سادہ الفاظ میں دین و دنیا کی جدائی عمل میں آئی۔ اس طرح یورپ میں مذہب کو گھروں تک محدود کر دیا گیا اور حکومت، ریاست، اصولِ حکمرانی اور حکمران طبقات آزاد ہو گئے ایک طرف عمل میں اور دوسری طرف ہر تنقید سے بالاتر۔ مذہب و ریاست کی جدائی، مغربی بالادستی اور ریاستی تشدد کو جائز قرار دینے کے عمل میں ایک ہمالیائی پیش رفت تھی۔

- پھر اسی قوت نے عوامی بیداری کے ماحول میں سائنسی ترقی کی اور فطری اور کائناتی خوابیدہ قوتوں کو مسخر کر کے سائنسی انقلاب برپا کر دیا۔ سائنسی ایجادات کی بہتات ہو گئی۔ انجن ایجاد ہو گیا۔ صنعتی میدان میں بے شمار ترقی سامنے آ گئی۔ یورپ نے سائنسی صنعتی اور عسکری ترقی سے تمام دنیا پر قبضے کا فیصلہ کیا اور سمندروں کے ذریعے اٹھارھویں صدی کے وسط تک تمام سمندروں اور جزیروں اور دور سمندر سے گھرے براعظموں پر یورپی اقوام نے اپنی حکمرانی کے جھنڈے گاڑ دیے۔
- اب خشکیوں اور بری علاقوں پر مسلمانوں کا غلبہ اور حکومت تھی اور افریقہ سے لے کر کاشغر اور دہلی تک کا علاقہ تھا اور ترقی و زمینی وسائل تھے جبکہ سمندروں اور پانیوں پر یورپی اقوام کا غلبہ تھا۔

سترھویں صدی اس کشمکش کی صدی ہے کہ یورپی اقوام سائنسی و صنعتی و عسکری ترقی کی بنیاد پر متمدن برّی علاقوں پر قبضے کے خواب کو حقیقت بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ لہٰذا مسلم حکومت (حکومتیں) عثمانیہ سلطنت کا افریقی حصہ سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے اور برطانیہ یکے بعد دیگرے کامیابیاں حاصل کرتا جاتا ہے۔ 1498ء میں واسکوڈی گامانے جنوبی افریقہ سے بحیرۂ عرب میں آنے کا راستہ معلوم کیا اور یورپی اقوام کا ایک سیلاب خلیج بنگال اور مشرقِ بعید تک پہنچ گیا اور اس نے یہاں اپنے قدم جما لیے۔ جزیرہ نمائے عرب کا جنوبی علاقہ اومان، یمن، خلیج فارس بھی اس

سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

- اس وقت 1750ء کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ جزیرہ نمائے عرب میں ایک مذہبی تحریک اُٹھتی ہے اور چند عشروں بعد ابتدائی کامیابیوں کے نتیجے میں ایک مقامی علاقائی حکمران سے 'مذہب وریاست' کا سا ایک معاہدہ ہوجاتا ہے کہ ہم مشترکہ دینی اسلامی تعلیمات کی اشاعت و استحکام کا کام کرتے ہیں جب بڑی حکومت اور وسیع رقبہ مل گیا تو مذہبی معاملات اور حکومتی معاملات (از قسم نماز، روزہ، عبادات، رسوم ورواج کی اصلاح کا کام ایک فریق کرے اور حکومتی، ریاستی معاملات، صلح وجنگ اور اجتماعی معاملات دوسرے فریق کی ذمہ داری ہوگی اور یہ معاہدہ نسلوں اور صدیوں چلے گا) میں اختیارات ودائرہ کار کا تعین ہوگیا اور کام کی رفتار میں برق رفتاری آگئی۔ چنانچہ تفصیلات میں جائے بغیر ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی کی کامیابیوں کے بعد بیسویں صدی میں یہ تحریک ایک بڑی قوت کے طور پر سامنے آئی اور 1926ء میں عرب میں حرمین شریفین پر کنٹرول حاصل کرکے اپنی حکومت میں شامل کرلیا اور اگلے عشرے میں پورے عرب پر حق حکمرانی حاصل کرکے نمایاں حیثیت حاصل کرلی۔ اس تحریک کے رہنما شیخ محمد بن عبدالوہاب تھے۔

(ج) تحریک محمد بن عبدالوہاب کے اثرات

- اس تحریک میں اسلامی نظریاتی احیاء اور جہاد کا جذبہ تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جب اٹھارھویں صدی کے وسط میں حج اور طلب علم کے لیے حجاز گئے تو ان کی ملاقات شیخ محمد بن عبدالوہاب سے ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہ اس سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ شاہ ولی اللہ کی اجتماعی اور ملّی سوچ میں اس 'قِران' کا بہت اثر ہے۔

- اگلے مرحلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ خانوادۂ ولی اللّٰہی ہی کے ایک فردِ فرید شاہ اسماعیل شہید اور اسی سے فیض یافتہ ایک دوسرے مردِ شہیر سیّد احمد شہید اس سے متأثر ہوکر انگریز کے خلاف جہاد کا اعلان کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ایک جہادی جماعت بناتے ہیں۔ لوگوں کی تربیت اور گھروں سے دور رہنے کے لیے گھروں سے نکلنے کا جذبہ دیتے ہیں اور قریباً 1400 افراد کو لے کر سمندری راستے سے حج کے لیے روانہ ہوجاتے ہیں۔ یہ بات عیاں ہے کہ اس وقت تک بحری سفر کا کنٹرول برطانوی طاقت EIC کے پاس ہی تھا۔ ایک سال کے قیام کے دوران یہاں اس

تحریک کے زعماء کا رابطہ بھی شیخ محمد بن عبدالوہاب سے ہوا اور اس کے مسحور کن اثرات کا اثاثہ ساتھ لے کر یہ لوگ وطن آئے۔ جہاد کا اعلان، افغانستان ہجرت، سکھوں سے جہاد اور بالآخر بالاکوٹ میں شہادت اس تحریکی سفر کے نمایاں سنگ ہائے میل ہیں۔ اس تحریک کی کامیابیوں اور کمزوریوں کا ایک گہرا اثر برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ آزادی پر ہے۔ (یاد رہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی (EIC) کے نام سے انگریز 1857ء تک ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا اور 1761ء میں احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملے کے تجربے کے بعد دہلی پہنچتے ہی انگریز نے ہندو کی ملی بھگت سے بلکہ درخواست پر ہندو قوم کے عسکری ونگ 'سکھ قوت' کو پنجاب، کے پی کے، کشمیر اور کابل تک حکمرانی دے دی تھی تاکہ انگریز حکومت کو افغانستان سے کسی ابدالی، غزنوی یا غوری کا خطرہ نہ رہے اور ہو بھی تو وہ پہلے اس حکومت سے مقابلہ کرے جس کی انگریز مدد کرے گا۔) شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک نے تحریک شہیدین کے رہنماؤں اور شرکاء کو بے حد متاثر کیا اور اس کے اثرات آج تک قائم ہیں۔

- بیسویں صدی میں مسلمان زعماء میں سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد اور پھر سیّد ابوالاعلیٰ مودودی اس تحریک سے شدید متأثر نظر آتے ہیں اور اسی کے نتیجے میں عوامی سطح پر ان کے وابستگان و متوسلین پر گہرے اثرات کے نقوش اور سعودی حکومت اور آل سعود سے قریبی مراسم اسی کا نتیجہ ہیں۔

(د) روسی معاشی انقلاب اور اس کے بانی کارل مارکس

اٹھارھویں صدی میں یورپی اقوام کے عالمی غلبے اور عسکری بالادستی میں استحکام آیا اور سائنسی ترقی اور صنعتی انقلاب کے اثرات بھی تیزی سے پھیل گئے۔

صنعتی انقلاب سے مشینوں کا عمل دخل دفتروں، کارخانوں اور کھیتوں میں اس قدر بڑھ گیا کہ انسان بھی اس پورے منظر نامے میں ایک 'خود کار' مشین ہی بن رہ گیا۔ دوسری طرف اس صنعتی انقلاب کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسانی محنت کا کچھ معاوضہ تو مزدور کو مل جاتا تھا اور دیگر انتظامی کارکنان بھی تنخواہیں وصول کر لیتے تھے مگر مشین کی محنت کا معاوضہ صرف مشین خریدنے پر کچھ سرمایہ صرف کر کے اس کے کئی گنا ثمرات اور فوائد اور منافع اب ایک دائمی چیز نہ سہی لمبے عرصے تک مالک کی جیب ہی میں جاتا تھا پھر سود کی لعنت ....۔ تیسری طرف سرمایہ کاری اور

مادر پدر آزاد سرمایہ داری، جس سے مزدور غریب سے غریب تر اور امیر وصنعت کار امیر تر ہوتا جا رہا تھا۔ انسانوں کی جگہ مشینیں لے رہی تھیں۔

- اس صورت حال کا ایک اجتماعی ردّ عمل جو مغربی معاشرے میں دیکھنے میں آیا وہ یہ ہے کہ سرمایہ داری کے خلاف ایک باغیانہ طرز فکر وعمل کی تحریک اُٹھی اور دوسری طرف مزدوروں کے حقوق کے حق میں آواز اٹھانے کی تحریک اُٹھی۔ اگرچہ یہ تحریکیں دو الگ نقطۂ نظر کی حامل تھیں مگر مقاصد کے اشتراک نے ان دونوں تحریکوں کے رہنماؤں کو اکٹھا کر دیا۔ چنانچہ مزدور تحریک نے سرمایہ دار اور سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ اس تحریک کے رہنما عملی میدان میں تو اور تھے مگر نظریاتی سطح پر کارل مارکس (وفات 1883ء)، اینجلز (وفات 1895ء)، لینن (وفات 1929ء) اور دیگر بیسیوں رہنماؤں نے اس انسان دوست تحریک کی آبیاری کی ہے۔ 1917ء میں بالآخر روس میں بلشویک انقلاب آ گیا جسے مختصراً روسی انقلاب کہتے ہیں اور لینن اس کا پہلا رہنما تھا۔ یہ تحریک اور انقلاب کامیابی کے قریب پہنچا تو مخالفین نے اس انقلاب پر سیکولر، مذہب دشمن، وحی دشمن اور عیسائیت دشمن کا لیبل لگا دیا۔ قابل افسوس بات یہ ہے کہ چونکہ اس انقلاب اور تحریک کا براہِ راست واسطہ صرف عیسائی دنیا سے تھا جس میں عقل ومنطق کا کوئی عمل دخل نہیں، جامد عقیدہ تثلیث وکفارہ ہے اس کے خلاف ہونے کی وجہ سے مغربی سرمایہ دارانہ ذہن نے اس کو مذہب کے خلاف کر دیا اور نتیجتاً مشرق میں یہ فلسفہ و نظریہ اسلام سے نبرد آزما ہو گیا۔

- اس تحریک نے بھی جنوبی ایشیا میں بہت سے مسلم اور غیر مسلم لیڈروں کو متاثر کیا یا مسلمان رہنماؤں کو متاثر نہیں کیا تو بعض مسلمان رہنما اس کی مخالفت میں نمایاں ضرور ہو گے۔ بیسویں صدی میں بہت سے مذہبی مسلمان رہنما دینی جماعتوں کے سربراہ، وکلاء، سیاسی رہنما، شاعر، ادیب، خطیب اس تحریک اور روسی انقلاب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس ساری کوشش کا ایک بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب نے روسی انقلاب اور اس کے حمایتیوں کو اسلام کے مدمقابل کر دیا اور ان کی آپس میں نظریاتی جنگ کو ہوا دی۔ اہل علم جانتے ہیں کہ اس روسی انقلاب اور تحریک سے کون کون سے مسلمان رہنما متاثر ہوئے، ہمیں یہاں اس سے اتنی ہی دلچسپی ہے کہ

علامہ اقبال نے اس تحریک اور اس کے بانی مارکس اور انقلاب کے بانی لینن کا تذکرہ ضرور کیا ہے مگر متاثر نہیں ہوئے بلکہ اس کی حقیقت اور مغربی سازش کو پہچان گئے تھے۔

- علامہ اقبال نے اسلام میں قرآن کی اہمیت کو اجاگر کیا کہ حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ایک کتاب دی تھی قرآن، پھر اسی قرآن (سورۂ جمعہ 62) کے ذریعے اسلام پھیلا اور دنیا میں خلافت کا نظام آیا، جس نے دنیا کو ایسا متاثر کیا کہ مسلمان جہاں جہاں گئے آج تک وہاں باقی اور موجود ہیں۔ چنانچہ علامہ اقبال اپنی نظم 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' میں مارکس کا نام لیے بغیر اس کی انسان دوست اور محنت کے حق میں اور سرمایہ داری کے خلاف کوششوں کو سراہتے ہیں اور ایک کتاب کے ذریعے انقلاب کا فکر مسلمانوں کو دیتے ہیں کہ قرآن کو پڑھو اور اس کے ذریعے دنیا میں اسلامی انقلاب لاؤ۔ دیکھو مارکس نے ایسے ہی کر دیا تھا۔ ع نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک انسان کی لکھی ہوئی اس کتاب نے انسانیت کو متاثر کیا اور نظریہ کے ذریعے انقلاب برپا کر دیا۔ قرآن مجید کے بعد اگر کوئی ایسی کتاب ہے تو وہ 'داس کیپٹل' ہی ہے۔

- لینن 1924ء میں فوت ہو گیا وہ بظاہر مذہب دشمن اور اسلام دشمن تھا مگر اس واقعے کو بھی علامہ نے مسلمان غلام ابن غلام قوم کو جگانے کے لیے اور سود کی مذمت کے لیے استعمال کیا ہے۔ اپنی نظم 'لینن، خدا کے حضور میں' میں علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ لینن اللہ کے حضور حاضر ہوا تو اُس نے کہا اے اللہ تو کس کا رب ہے؟ مسلمانوں کا؟ وہ تو ہمارے غلام ہیں

اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدم خاکی کہ جو ہے زیر سماوات؟
رعنائی تعمیر میں ، رونق میں ، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

علامہ اقبال نے مارکس، لینن وغیرہ کے استعاروں سے بھی اسلام کی تعلیمات کو سامنے لانے یعنی سرمایہ داری اور سرمایہ پرستی کی لعنت کو ختم کرنے پر زور دیا ہے۔

ہ جرمنی کا ہٹلر اور اس کی نازی پارٹی

گزشتہ صدی کی تیسری دہائی میں جرمنی کے ہٹلر کی ایک تحریک اُٹھی جس نے تمام جرمنی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور دنیا بھر کے ACTIVISTS اور تحریکوں کو متاثر کیا۔ جنوبی ایشیا میں مسلمانوں میں مشہور انقلابی شخصیت جناب علامہ عنایت اللہ المشرقی کی ہے جو اس تحریک کے ملٹری ڈسپلن سے بہت زیادہ متاثر تھے اور انھوں نے خاکسار تحریک برپا کی جس نے قربانیوں کی لازوال داستانیں رقم کی اور وہ تحریک آج بھی پاکستان میں موجود ہے۔ علامہ اقبال، ہٹلر کی اس تحریک سے بالکل متاثر نہیں ہوئے جرمنی اور جرمن قوم سے عقیدت کے باوجود علامہ اقبال نے ہٹلر کے بارے میں کوئی جملہ نہیں کہا۔ واللہ اعلم

و علامہ اقبال اور معاصر مسلم رہنما

- علامہ اقبال اپنے معاصر بہت سے دینی وقومی رہنماؤں کے برعکس مغربی اور ایشیائی تحریکوں سے رابطے اور مطالعے کے باوصف متأثر نہیں ہوئے۔ انھوں نے قوم کو اپنے ذہن اور اسلام و اسلامی تاریخ و تعلیمات (جیسا کہ انھوں نے سمجھا) کے مطابق دعوت دی، جاگنے اور غلامی سے نکلنے کا لازوال جذبہ دیا، دشمنوں میں گھری قوم کو ایک آزاد وطن دلایا اور اس میں اسلام کو

غالب قوت بنانے کے گر سکھائے۔

● قوم نے علامہ اقبال (اور ثانیاً قائداعظم محمد علی جناح) کے نظریات وفرمودات اور نصیحتوں سے کیا سیکھا اور اوران پر کتنا عمل کیا؟ وہ ایک الگ ISSUE ہے۔ علامہ اقبال کے فکر میں حیاتِ تازہ کا جو پیغام تھا وہ آج بھی مؤثر ہے اس لیے کہ وہ دین اسلام کی تعلیمات کا ایک جدید انداز ہے۔ ع نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے میری
آج اگر قوم مرچکی ہے اور علامہ اقبال جیسے قومی محسن وملّی رہبر سے بے وفائی پر آمادہ ہوچکی ہے تو اس کے اسباب وعلل کچھ اور ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں عقل وشعور کی نعمتوں سے مالا مال کردے تاکہ صحیح وغلط افکار کی چھانٹ کرسکیں اور اسلامی وغیر اسلامی نظریات کو پرکھ سکیں اور ایسا جذبہ عمل دے جو اُمت مسلمہ کو ایک جگہ ایک نقطے (ISSUE) پر جمع کردے تاکہ دنیا وآخرت میں سرخرو ہوسکیں۔

● آج ایک صدی بعد حالات کا فیصلہ ہے کہ ماضی کی ایک صدی میں صحیح ترین رہنمائی علامہ اقبال نے دی ہے اور آج بھی انہی کے فکر کی روشنی میں اُمت مسلمہ اور اہالیانِ پاکستان کے مسائل اس پر عمل درآمد کے ذریعے ہی ڈھل سکتی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

رندانِ فرانسیس کا میخانہ سلامت
پُر ہے مئے گلرنگ سے ہر شیشہ حلب کا
ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا؟
مقصد ہے ملوکیتِ انگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں نارنج کا یا شہد و رطب کا!

حصّہ سوم

آٹھواں باب جنوبی ایشیا کے مسلمان
اور علامہ اقبال 335

نواں باب تمنا مختصر سی ہے مگر.... 363

دسواں باب عالمی حالات ـــ پاکستان کا مستقبل
اور مسلکی قیادتوں کا امتحان 371

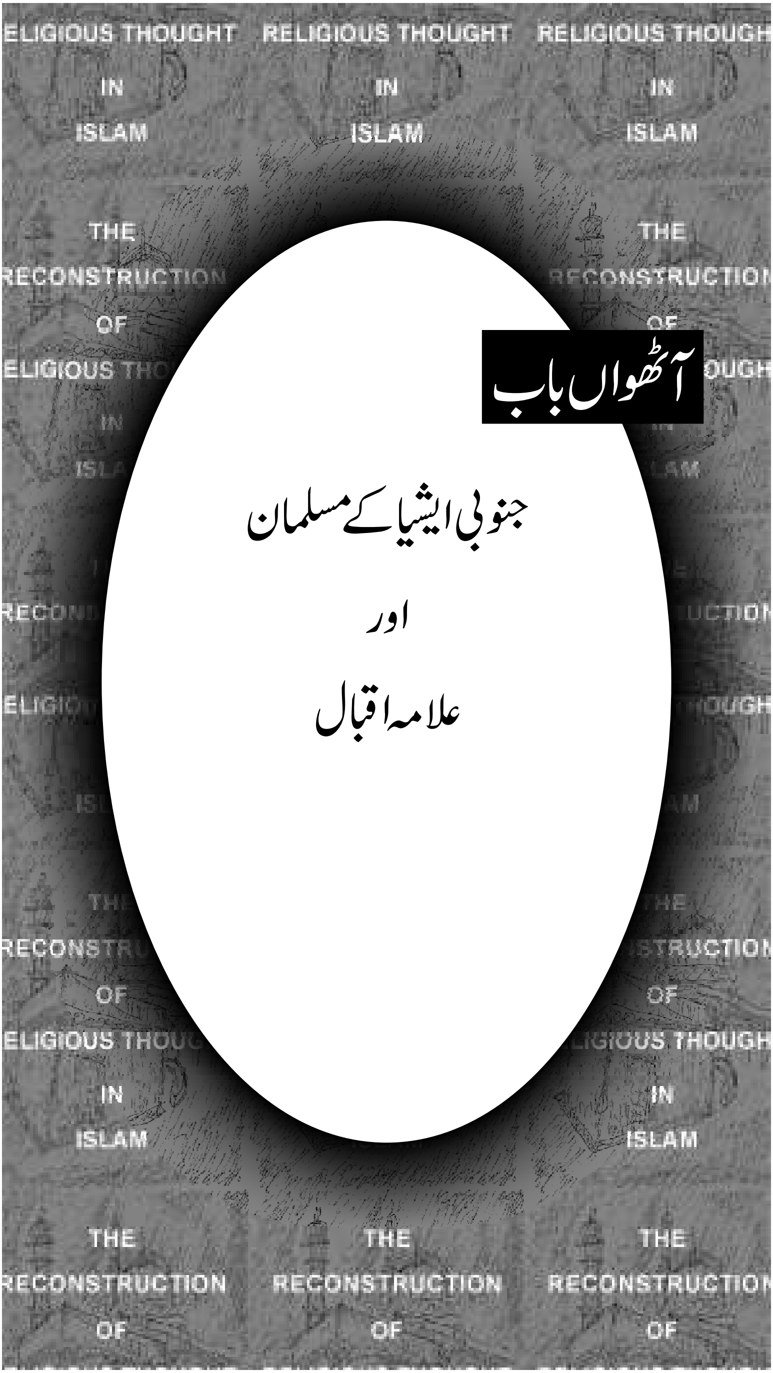

آٹھواں باب

جنوبی ایشیا کے مسلمان
اور
علامہ اقبال

جنوبی ایشیا کے اہم مسلمان رہنما
___اور ہم عصر عالمی تحریکیں

338

1۔ اسلام کا دورِ اوّل دورِ نبوت و دورِ خلافت راشدہ

2۔ دور خلافت راشدہ__و__دور صحابہ رضی اللہ عنہم

3۔ مدینہ النبی ﷺ سے رہائش چھوڑ کر تبلیغ اسلام کے لیے
از خود ہجرت کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

4۔ اصحابُ النبی ﷺ___نبوت کے نقش قدم پر

5۔ جنوبی ایشیا میں اسلام کی آمد

6۔ حاصل کلام

جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا دینی و فقہی خمیر اور علامہ اقبال کا فکر

1 اسلام کا دورِ اوّل دورِ نبوت و دورِ خلافت راشدہ

خالص عربی اسلام یا نظریاتی اسلام کا سب سے اچھا اور HI-QUALITY دور یقیناً دورِ نبوت کا 23 سالہ دور ہے۔ اس میں 13 سال کے مکی دور کی دعوتی زندگی کو علیحدہ سمجھیں تو 10 سالہ دورِ نبوت جو مدینے میں گزرا، جہاں آپ ﷺ کے ساتھ آپ پر ایمان لانے والوں کی ایک معتدبہ تعداد تھی، اس دور میں مسلمانوں پر خارجی اور داخلی لحاظ سے بڑا مشکل وقت تھا۔ آپ ﷺ کی اعلیٰ قیادت کے ساتھ آپ کے ساتھیوں کا ناقابل تسخیر جذبہ فدویّت تھا جس نے کامیابیوں کے بند دروازے کھولے۔ ایسی ہی کامیابیاں اللہ تعالیٰ قومِ موسیٰ یعنی بنی اسرائیل کو بھی ایک وقت میں دینا چاہتا تھا جب بنی اسرائیل کو فلسطین پر حملہ کر کے فتح کرنے کا حکم ہوا۔ لیکن قومِ بنی اسرائیل نے انکار کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت یوشع بن نون نے بہت سمجھایا، فتح کا وعدۂ خداوندی یاد دلایا، مگر بے سود۔ قرآن مجید کے بقول، قوم نے کورا جواب دے دیا کہ اے موسیٰ! آپ جہاد کے لیے جاؤ اور اپنے رب کو ساتھ لے جاؤ اور جہاد کرو جب فتح ہو جائے تو ہمیں بلا لینا۔ اس پر اس قوم پر صحرائے تیہ کی چالیس سالہ خانہ بدوشی کی سزا آ گئی۔ اس رویے کے برعکس اصحابِ محمد ﷺ، جنہوں نے آپ ﷺ کے پسینے کی جگہ گردنیں کٹا دیں اور جو صحابہ باقی رہے وہ (قرآن مجید گواہی دے رہا ہے سورۂ احزاب 33) منتظر شہادت ہیں کہ ہماری باری کب آتی

ہے۔ اسی لیے دورِ خلافت راشدہ اور دورِ نبوت باہم متصل دور ہیں اور قرونِ مشہود لہا بالخیر میں سرفہرست ہیں۔

دورِ نبوت اور دورِ خلافت راشدہ میں قانون اور قانون سازی کا کام بڑا اجچا تُلا اور محفوظ ترین ہاتھوں میں تھا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی مشہور روایت اس پر سند ہے۔ اور قیادت کو عوام پر اعتماد تھا اور عوام کو قیادت پر اعتماد تھا۔ اس پر مستزاد ایک دوسری مشہور حدیث بھی موجود ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دورِ خلافت راشدہ کے فیصلوں کی پہلے سے تصویب فرمائی اور ان پر مابعد کے ادوار میں عمل درآمد کو یقینی بنایا۔

وَسَتَرَوْنَ مِنْ بَعْدِي اخْتِلَافًا شَدِيدًا، فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي، وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ، عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، (ابن ماجہ، عن عرباضؓ)

''......اور تم میرے بعد بہت اختلافات دیکھو گے لہٰذا تم لازم پکڑنا میری سنت کو اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو، اس کو دانتوں کے ذریعے پکڑ لو'۔

(اس حدیث سے ایک اور بات کا اشارہ ملتا ہے کہ خلفاء راشدین سب ہدایت یافتہ (مہدی) اور ہدایت دینے والے تھے اور خلیفہ راشد ہونا اور 'مہدی' ہونا لازم وملزوم ہیں گویا خلفائے راشدین بھی 'مہدیّین' (مہدی) تھے اور قربِ قیامت میں جو مہدی مکے سے ظاہر ہوگا وہ خلیفہ راشد ہی ہوگا (واللہ اعلم) گویا راشدیت اور مہدویت ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔

اس مبارک دور میں علوم نبوت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ٹھنڈے سائے میں علومِ شریعت اور علومِ انسانی کی ٹھوس اور مبنی بر حقیقت بنیادیں رکھی گئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت شاقہ سے حجۃ الوداع میں چالیس ہزار تربیت یافتہ صحابہ یا ایک لاکھ 24 ہزار جانثاران آپ کے جلو میں تھے۔ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی خطبات ارشاد فرمائے جن کا مجموعہ خطبہ حجۃ الوداع کہلاتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا حاصل ہے اور انسانیت کی رہنمائی اور حصولِ عظمت کا نشان ہے۔

کسی انسان کی ترتیب دی گئی تعلیمات کہاں؟ اس نبویؐ تعلیم کے شاہکار (مغربی اصطلاح میں MAGNACARTA) کا مقابلہ کہاں۔ مغرب نے اس خطبہ کو انسانیت کے لیے ایک عظیم پیغام تو مان لیا مگر اس کے ساتھ آسمانی وحی و ہدایت اور ایک خالق و مالک و رب کا تصور

لازمی ہے جو مغربی فلاسفر اور مغربی کارپردازوں کو قبول نہیں۔ مغربی علوم کی بنیاد ہی شیطانی وابلیسی نقطۂ نظر پر ہے یعنی سیکولر، لبرل، خدابیزار، وحی دشمن، علم دشمن اور انسان دشمن نظریات پر ہے۔

آپ ﷺ نے اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھادیا تھا کہ اے میرے جانثارو! مجھ سے دین کے بارے میں معلوم کرلو شاید کہ تمہاری اور میری ملاقات دوبارہ اس جگہ نہ ہو۔ (اور ایسا ہی ہوا کہ ذوالحجہ کے بعد محرم 11ھ صفر 11ھ اور ربیع الاوّل میں آپ ﷺ نے خالق حقیقی کی طرف مراجعت فرمائی۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وازواجہ وعلیٰ جمیع المومنین والمومنات

ایک سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں دنیا میں نہ رہوں میں قرآن (قرآن اور عترت یا قرآن اور سنت) تمہارے درمیان چھوڑے جارہا ہوں اگر ان کو مضبوطی سے پکڑوگے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔

وَقَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ، كِتَابُ اللّٰهِ،

(مسلم، عن جابرؓ)

''میں نے تم میں ایسی چیز چھوڑ دی ہے کہ اگر اس کو مضبوطی سے پکڑلو تو اس کے بعد تم کبھی گمراہ نہیں ہوگے، وہ کتابُ اللہ ہے''۔

اور ساتھ یہ اَبدی پیغام بھی دیا جو صحابہ کی شان رفیع اور عظمت ابدی کا پتہ دیتا ہے جس نے اس پر جتنا عمل کیا اتنا ہی مقام پا گیا۔ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ سے یہ سوال بھی کیا کہ اللہ کی طرف سے ایک دین، ایک قرآن اور ایک پیغامِ ہدایت میری طرف آیا تھا میرے ذمے اس پیغام کو تمہیں پہنچانا تھا، سنو! کیا میں نے اس پیغام کو تم تک پہنچادیا؟ سب صحابہؓ نے بیک زبان کہا تھا: جی ہاں، آپ نے وہ پیغام ہم تک پہنچادیا اس پر ہم گواہ ہیں۔ آپ نے یہ پیغام صرف پہنچایا ہی نہیں بلکہ پہنچانے کا حق ادا کردیا، امانت کا امانت دار کو پہنچانے کا حق ادا کردیا۔

انسانیت کے نام پیغام کو انسانیت میں سے لوگ چھانٹ کر، ان کی تربیت فرما کر، ان کے سامنے عملی نمونہ پیش کر کے ایسا حق امانت ادا کیا ہے کہ ابلیسیت اور شیطنت سر پیٹ رہی ہے اور ناطقہ سر بہ گریباں ہے کہ قرآن اور محمد ﷺ کی تعلیمات کی موجودگی میں ہمارا مستقبل تاریک ہے۔

اس خطبہ حجۃ الوداع کے آخر میں جو الفاظ ہیں وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت کا آئینہ دار ہیں۔ یہی پہلو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا عوامی اور تبلیغی پہلو ہے کہ اب دنیا میں نبوت کا دروازہ بند ہے اب اس پیغام کی تبلیغ دنیا کی ہر زبان اور ہر علاقے میں قیامت تک ادا کرنا ہے اور یہ فریضہ صحابہ کی قسمت میں اللہ تعالیٰ نے لکھا اور انہوں نے اس کا حق ادا کر دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمع نے اس ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو پلے باندھا اور زندگی کا مشن بنا کر اس پر عمل کیا۔ ارشاد ہوا

فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ

پس اے لوگو! اے میرے ساتھیو! جو باتیں آپ نے مجھ سے سنی ہیں اب یہاں موجود ہر شخص اس بات کا جواب دہ ہے کہ وہ اس شخص تک یہ باتیں پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں ہے۔

2 دورِ خلافت راشدہ ـــ و ـــ دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم

سیّدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام و مرتبہ سمجھنے اور اس پر انسان کی عظمت اور پھر ان کے ایک اُمتی ہونے، اُن کی خاک پا ہونے پر فخر کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ایک 'بہت بڑا' دل چاہیے۔ وہ دلِ بینا جو زندہ بھی ہوتا ہے۔ جس میں ضمیر بھی زندہ ہوتا ہے تصوف کی زبان میں اسے دل جاری ہونا بھی کہتے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح روح کی ہے، روح کا مقام انسان کا دل ہی ہے، روح عالم امر میں سے ہے اور ایک جہانِ دگر ہے جس کی باریکیوں اور رمزوں کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ اس روح کی زندگی کے کچھ اثرات دل پر جب پڑتے ہیں تو انسان کی سوچ اس کے مطابق ہو جاتی ہے جس کا ذکر ایک حدیث میں آیا ہے کہ

أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً: إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ (بخاری عن النعمان بن بشیرؓ)

''سنو! جسم میں گوشت کا حصہ ہے: جب وہ درست ہو جائے سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور جب وہ خراب ہو جائے سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ سنو! وہ دل ہے۔''

روح پاک ہے تو خیالات پاکیزہ ہوتے ہیں۔ روح کے دل اور اس کی کیفیات پر اثرات نمایاں ہوتے ہیں، اگر آدمی زندہ ضمیر اور باضمیر ہوتا ہے تو دین پر چلنا اس کے لیے آسان کر دیا جاتا ہے۔ اگر انسان نے اپنے طرز عمل اور دنیا پرستی یا ضمیر کے خلاف کرتے کرتے

اپنی روح کو 'مردہ' کرلیا ہے یعنی اب 'روح' کے اثرات دل پر مثبت نہیں رہے بلکہ دل میں منفی، ابلیسی اور شیطانی خیالات آتے ہیں تو انسان اسی کے مطابق زندگی بسر کررہا ہوتا ہے۔ روح زندہ ہو تو دل زندہ ہوتا ہے ضمیر زندہ ہوتا ہے انسان کی کیفیات ایمانِ حقیقی والی ہوتی ہیں۔ ذرا کمزور ایمان والے شخص یا عام آدمی (LAY MAN) یا عام مسلمان کے لیے ان کیفیات کا اِدارک بہت مشکل اور تقریباً ناممکن تو نہیں (ہم اس کی حقیقی صلاحیتوں سے ناواقف ہیں وہ صرف اللہ خالق ہی جانتا ہے) لیکن انگریزی میں کہتے ہیں NEXT TO IMPOSSIBLE ضرور ہے۔

● اس کی سادہ مثال سکول، کالج یا کسی بڑے دفتر کے عام عملے اور اس دفتر کے اعلیٰ افسر اور اس کے معاون افسران سے دی جا سکتی ہے۔ ہائی سکول کا ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل اساتذہ کی تعلیمی اسناد کا حامل ہوتا ہے، تعلیمی و تدریسی تجربہ رکھتا ہے۔ بہت سے دیگر اساتذہ کا ہم عمر اور ہم کلاس ہوسکتا ہے اس کے اپنے دفتر سکول وغیرہ میں اس کا کوئی کلاس فیلو بھی ٹیچر ہوسکتا ہے مگر اسی سکول کے ایک عام ٹیچر اور سکول کے سربراہ کی ذمہ داریوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ نہ صرف فرق وتفاوت ہے بلکہ عام ٹیچر تو کیا سینئر اساتذہ اور ڈپٹی ہیڈ ماسٹر یا وائس پرنسپل کے لیے سمجھنا مشکل ہے۔ کسی سکول کا عام استاذ یا سینئر استاذ سکول آتا ہے اپنے تدریسی ٹائم ٹیبل کے مطابق کلاس لیتا ہے اور گھر چلا جاتا ہے وہ فارغ وقت میں اخبار پڑھتا ہے لائبریری جاتا ہے۔ ضروری ہوا تو SHORT LEAVE لے کر تھانے / کچہری / بازار کا ذاتی کام یا کسی دوست کا کام کر کے آجاتا ہے وہ صرف اپنے سبجیکٹ (SUBJECT) یا کلاس کا ذمہ دار ہے وہ کبھی گھر بیٹھنے موسم کی خرابی یا طبیعت کی ناسازی کا عذر کر کے چھٹی بھی کر لیتا ہے لیکن اسی ادارے کا ہیڈ ماسٹر / پرنسپل کی ڈیوٹی کیا ہے؟ اس کی مصروفیات، ذمہ داریاں، دردِ سر (HEADACHES) کیا ہیں؟ یہ باتیں وہ کبھی سوچتا ہے نہ غور کرتا ہے بعض جونیئر اساتذہ کا ادارے کے سربراہ کے بارے میں یہ تاثر ضرور ہوتا ہے کہ وہ دیر سے آتا ہے اکثر دفتر سے باہر رہتا ہے اس کو عام استاذ سے زیادہ سہولیات ملی ہوئی ہیں وہ کبھی اعلیٰ سطح کی میٹنگوں یا پنجاب سطح کے معاملات میں کوئی عمل دخل رکھتا ہے۔ یہ ظاہر کا فرق اس پرنسپل کے عہدے کی کشش ہوتی ہے مگر ذمہ داریوں کا احساس کوئی نہیں کرتا۔ یہی حال دیگر سرکاری افسران اور وزراء کا پرائم منسٹر کے بارے میں ہوتا ہے۔ غرض کسی کام کی جگہ پر کسی

کارخانے، سکول، کالج میں ذمہ داریوں کے حساب سے فرق پر لوئر گریڈ کے لوگوں اور سینئرز کے بارے میں اس سے ملتے جلتے خیالات رکھتے ہیں۔

اس مثال پر ذمہ داریوں کے احساس اور ان کی ادائیگی کی سوچ کا ہے اور دین میں بھی اپنے سے اوپر والے کی ذمہ داریوں اور فکرمندیوں کا صحیح احساس وادراک بہت مشکل اور ناپید ہے۔

آج کا عام مسلمان ایک باعمل مسلمان کی مشکلاتِ عمل کو نہیں سمجھتا۔ اللہ کے دوستوں کا معاملہ اور عوام کا معاملہ بھی اسی طرح کا ہے پھر مسلمانوں میں عمل کے حساب سے نمایاں اور LEADING ROLE ادا کرنے والے اشخاص کے مسائل، تفکرات، بال سفید کر دینے والی پریشانیوں کا فہم وادراک ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

- آج کے مقتدا دینی اور قومی رہنمائی کے منصب پر فائز ذمہ دار لوگ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی یہ درجے کا فرق ہے۔ ورنہ کام تو وہی ہیں جو سب کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ کفار ـــــ حضرات انبیا کرام علیہم السلام پر معاذ اللہ، یہی فقرے چست کرتے آئے ہیں کہ یہ نبی ہماری طرح کا آدمی ہے کھاتا پیتا ہے بچے ہیں بیوی ہے اور وہی کھاتا ہے جو ہم کھاتے ہیں پھر یہ ہم سے اعلیٰ کیسے ہو گیا آخر اس کی پیروی اور ہر بات کیوں مانی جائے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ وہ پیغمبر کا مقام اور مرتبہ نہیں سمجھتے تھے۔

اگر وائس پرنسپل، پرنسپل کی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتا تو اسی پر قیاس کر لیجئے مختلف شعبوں میں کام کرنے والوں کے فہم وادراک کی سطح ایک مزدور ایک سیٹھ کا جو تصور ذہن میں رکھتا ہے وہ انہی ذمہ داریوں کے ادراک کے فرق کا نتیجہ ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی درجہ بندی

- انسانی زندگی کے بے شمار شعبے (WALKS OF LIFE) ہیں اور بعض اوقات یہ شعبے اور محکمے یا مصروفیات ایک دوسرے کے متضاد محسوس ہوتی ہیں لیکن انسان اس کو محسوس کرے یا نہ کرے اپنی زندگی کی گاڑی کو کھینچ رہا ہوتا ہے۔
- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مصروفیات کے اعتبارات سے بھی تقسیم کی جا سکتی ہے اور ذمہ داریوں کے اعتبار سے بھی۔ مثلاً صحابہ کرامؓ میں صاحب ثروت صحابہ بھی تھے اور اصحابِ صفہ

بھی۔ کتنا فرق ہے حضرت عثمان، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، صاحب ثروت صحابہ رضی اللہ عنہم میں اور حضرت علی، حضرت بلال، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابوذر غفاری اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہم میں جو اصحابِ صفہ تھے۔ جنگ لڑنے اور جنگوں کی کمان کرنے کے پہلو سے بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں درجہ بندی تھی پھر انتظامی صلاحیتوں اور انتظامی حکومتی ذمہ داریوں کو نبھانے کے اعتبار سے بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں فرق وتفاوت تھا۔

الغرض انسانی طبائع کے فرق کی طرح صحابہ کرامؓ کی طبائع اور صلاحیتوں کا فرق تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی صحابہ کو انتظامی عہدہ دے دیا اور کسی کو فرمایا تو کمزور ہے ان عہدوں کی بڑی مسئولیت ہے، ان کی عہدوں کی تمنا نہ کرو۔ مگر ان سب تقسیموں پر فائق تقسیم ہے جو امت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کی بنیاد پر کی گئی ہے اور وہ آج تک قائم ہے (اور ان شاء اللہ قائم رہے گی)

i عام مسلمانوں سے باعمل مسلمان 'صالحین' کا درجہ ہے۔

ii ان صالحین میں ایمان کے لحاظ سے کئی درجات ہوں گے ان میں ایسے بھی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اپنا دوست کہتا ہے۔

iii دینی فرائض (ذمہ داریوں) کی ادائیگی پر اُمت میں تقرب بالفرائض اور تقرب بالنوافل کا تصور ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق تقرب بالفرائض یعنی دینی ذمہ داریوں میں سے فرائض دینی (فقہی فرائض) سے بھی اور کاروبار، رہن سہن، معاشرت میں بھی کچھ پابندیاں ہیں ان سے بھی عہدہ برآ ہونا یہ کام اچھے مسلمان ہونے کی دلیل ہے۔

تقرب بالفرائض (پورے دین پر قائم رہنا، دین کو پھیلانا اور دین قائم کرنے کے لیے تن من دھن لگا دینا) اہم فرائض ہیں جن کی ادائیگی پر ہی انسان آخرت میں کامیاب ہوسکتا ہے۔

- پھر اُمت میں مجموعی طور پر جماعت صحابہؓ کو تمام امت پر مجموعی طور پر فضیلت ہے تمام امت کے اولیاء اکٹھے بھی ہوں تو ایک صحابیؓ کی شان کو نہیں پہنچ سکتے پھر امت میں کسی صحابی سے فیض پانے والوں کا درجہ ہے اور پھر ان تابعی حضرات سے فیض پانے والے تبع تابعی کا مقام ہے۔

پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی درجہ بندی ہے۔

i فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے والے فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والوں سے بہت بہتر ہیں۔

ii پھر درجہ ہے ان صحابہ کا جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مل کر فتح مکہ کا سفر کیا تھا ان کی تعداد 10000 بیان ہوئی ہے اتنی بڑی تعداد اور اتنے خالص اور حقیقی ایمان والے حضرات اس سے پہلے اس روئے ارضی پر کبھی جمع نہیں ہوئے ان اصحابِ محمد ﷺ کا درجہ ہے۔

iii اس سے اوپر درجہ ہے 1400 وہ خوش نصیب جنھوں نے حضرت محمد ﷺ کی خوش خبری اور ایما پر سفر عمرہ کیا ہے وہ اصحاب الشجر ہ کہلاتے ہیں اس عمرے کا سفر اس پس منظر میں ہوا کہ جنگ خندق میں کفار و مشرکین کا اتحادی لشکر مدینہ پر حملہ آور ہوا مگر حضرت محمد ﷺ کی جنگی تدبیر ★ (خندق کی کھدائی) پر کفار پریشان بھی ہوئے اور بددل بھی۔ وہ بددل ہو کر مکہ لوٹے کہ اتنی بڑی مہم جوئی کے باوجود مسلمانوں کو بڑا نقصان نہیں پہنچا سکے ان حالات میں مسلمانوں کا صرف 1400 کی تعداد میں عمرہ کے لیے اسلحہ کے بغیر مکہ پہنچ جانا شیر کی کچھار میں جانے کے مترادف تھا جنگ اور قتل و غارت کا خطرہ تھا مگر صحابہ کرام نے جان نثاری کا جذبہ دکھایا اور آپ ﷺ کے کہنے پر بیعت علی الموت کر لی۔ اس بیعت کا قرآن پاک (سورۃ الفتح) میں شاندار انداز میں ذکر کیا گیا ہے اسلام اور حضرت محمد ﷺ کے لیے اسی وارفتگی اور جانثاری کے جذبے کی بنا پر ان اصحاب الشجر ہ کا دین میں اعلیٰ مقام ہے۔

(★ یاد رہے کہ کہا جاتا ہے کہ یہ تجویز حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے دی تھی مگر تاریخی حقائق بتاتے ہیں کہ جب حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فارس چھوڑا تھا وہ ان کا نوعمری کا دور تھا، تجربہ کار ہونے کی عمر نہیں تھی۔ پھر تاریخ اس میں بھی خاموش ہے کہ اس سے پہلے یا اس کے بعد کبھی ایران میں فوجی حملوں میں دفاعی طور پر خندقیں کھودی گئی ہوں۔)

iv پھر درجہ ان 700 اصحاب محمد ﷺ کا جنھوں نے جنگ اُحد کے دن جنگ میں حصہ لیا جانی نقصان کے باوصف حضرت محمد ﷺ کے ساتھ وفاداری نبھائی جبکہ کافر 3000 مسلح افراد تھے پھر بھی مسلمانوں کا حوصلہ بلند تھا اور کافر مسلمانوں کو کوئی بڑا نقصان (DENT) پہنچائے بغیر نامراد لوٹ گئے۔

v پھر اس سے اوپر درجہ یہ 313 اُن اَصحابِ محمد ﷺ کا درجہ ہے جنہوں نے بدر کے دن جنگ میں عزیمت وشجاعت کی داستانیں رقم کر دیں۔ مسلمانوں کے پاس صرف دو گھوڑے، ستر اونٹ، 8 تلواریں 70 نیزے اور باقی صحابہ کے پاس درختوں کی ٹہنیاں اور ڈنڈے تھے اور دشمن ایک ہزار مسلح افراد کی فوج کے ساتھ آیا تھا۔ پھر بھی دشمن 70 لاشیں چھوڑ کر بھاگا جبکہ 70 قیدی بنا لیے گئے مسلمانوں کا جانی نقصان صرف 13 آدمی میدان جنگ میں شہید ہوئے اور ایک صحابی زخمی تھے جو واپسی پر انتقال کر گئے۔ کل چودہ شہادتیں ہوئی۔ اسی جنگ میں ابوجہل سپہ سالار جنگ بھی جہنم رسید ہو گیا۔

vi پھر درجہ ہے ان خوش نصیبوں کا جنہوں نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی۔

vii پھر درجہ ہے جنہوں نے ہجرتِ حبشہ کی ہے۔

viii پھر درجہ ہے عشرہ مبشرہ یعنی ان دس خوش بخت صحابہ رضی اللہ عنہم کا جنہیں رسول اللہ ﷺ نے اسی زندگی میں جنت کی بشارت دی۔

ix پھر انہیں عشرہ مبشرہ میں سے چار منتخب روزگار شخصیتوں کا درجہ ہے جو یکے بعد دیگرے خلافت کے منصب جلیلہ پر فائز ہوئے یعنی خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم۔

x پھر ان خلفائے راشدین میں درجہ بندی ہے ان کی ترتیب خلافت کے موافق یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں چوتھے نمبر پر ہیں، تیسرا نمبر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہے، دوسرا درجہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہے اور عشرہ مبشرہ میں بھی پہلا اور امت مسلمہ میں بھی پہلا درجہ یعنی رسول ﷺ پر ایمان لانے والوں میں افضل ترین انسان حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ اسی لیے جمعہ کے عربی خطبوں میں یہ الفاظ کہے جاتے ہیں افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق ابوبکر صدیقؓ۔

- ان اصحابِ محمد ﷺ میں حکمران بھی ہیں سپہ سالار بھی ہیں والی و گورنر بھی ہیں مبلغ بھی ہیں اصحاب صفہ بھی ہیں وغیرہ۔

3 مدینۃ النبی ﷺ سے رہائش چھوڑ کر تبلیغ اسلام کے لیے از خود ہجرت کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

- مکہ معظّمہ سے آپ ﷺ کی ہجرت اور فتح مکہ کے بعد بھی مکہ کو مسلمانوں کا سیاسی مرکز

نہ بنانا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُوراندیشی اوراصولِ جہاں بانی کی نفسیات سے واقفیت کی بنیاد پر ہی تھا تاہم مسلمانوں کے حق میں یہ فیصلہ آج تک ایک نشانِ رحمت ثابت ہوا ہے۔

- اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کو اپنا دارالحکومت بنایا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے ثلاثہ حضرات ابوبکر، عمر فارق وعثمان غنی رضی اللہ عنہم نے بھی مدینہ میں ہی رہ کر امور خلافت چلائے۔ تاہم بعض وجوہات کی بنا پر خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنا دارالحکومت کوفہ لے گئے پھر جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے صلح کرلی تو انہوں نے اپنا دارالحکومت دمشق کو قرار دیا جہاں کے وہ گورنر تھے۔

- بادشاہوں اور حکومتوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ بادشاہ اور راجے مہاراجے اپنے مخالفین کے مرکز اور دارالحکومت پر ہی حملہ کرتے ہیں اور کامیابی کی صورت میں اس کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ قتل عام، لوٹ کھسوٹ اور تباہی کا منظر سامنے ہوتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی قرار دی جاسکتی ہے کہ خلافت راشدہ کے ابتدائی 25 سال بعد ہی جب مسلمانوں کی حکومت کمزور پڑی تو مسلمانوں کا دارالحکومت بھی مدینے سے منتقل ہوکر کوفہ اور بعدازاں دمشق چلا گیا جس سے مکہ مکرمہ کے بعد مدینہ منورہ بھی دشمنوں کے حملوں اور حکمرانوں کی باہمی رقابتوں اور رنجشوں کی رزم گاہ بننے سے محفوظ رہا اور حرمِ مکی کے ساتھ حرمِ مدنی بھی امن کا گہوارا ثابت ہوا۔

- خلافت راشدہ اوراس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تین وجوہات کی بنا پر مدینہ سے دوسرے علاقوں میں رہائش منتقل کی ہے۔

i خلیفہ وقت کی طرف سے کسی منصب اور عہدہ پر متعین ہونے کی بنا پر وہ صحابی اپنی فیملی اور برادری سمیت وہاں چلے گئے بلکہ ان کے دوست احباب بھی وہیں منتقل ہوگئے۔

ii بعض صحابہؓ نے تعلیم دین اور تعلیم القرآن کی ضرورت کی تحت ازخود یا حکمرانوں کے کہنے پر وہاں نقل مکانی کی ہے۔

iii بعض صحابہ نے تحصیل علم اور تبلیغ دین کے لیے بھی مدینہ سے دوسرے علاقوں اور شہروں کا رخ کیا ہے۔

- حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے اور آخری پیغمبر تھے۔ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے نبی آخرالزماں ہونے کی بنا پر بہت سی خصوصی شانوں سے بھی نوازا ہے جیسے قرآن مجید جیسی کتاب دے کر اس کی حفاظت کا انتظام کر دیا کہ یہ کتاب اب قیامت تک کے لیے ہدایت رہے گی (کسی نئی آسمانی وحی اور ہدایت کی کسی صورت میں ضرورت ہی نہیں رہی)۔

آپ ﷺ کو ایک 'اُمت' دے دی جس کے ذمے تبلیغ دین و اشاعت قرآن کا فریضہ لگا دیا تا کہ دنیا کے ہر گوشہ اور ہر کونہ میں اسلام کی تعلیمات کا چرچا رہے اور انسانیت کی امانت انسانوں تک پہنچتی رہے۔

- آپ ﷺ کامل و اکمل ہونے کی بنا پر اور قیامت تک کے حالات کے پیش نظر اور تجرباتی علوم کی پیش رفت کی روشنی میں پوری دنیا کے لیے نبی بنائے گئے۔

دوسرے انبیا کرام علیہم السلام قرآن مجید کے مطابق صرف اپنی قوم سے خطاب کرتے گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت شعیب علیہم السلام نے 'یَا قَوْمِ' کے الفاظ سے قوم کو خطاب فرمایا ہے جبکہ حضرت محمد ﷺ نے **یَا اَیُّھَا النَّاس** کے الفاظ سے خطاب کیا ہے گویا آپ ﷺ کی اُمت دعوت کل نوعِ انسانی ہے، آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بھی اور اب قیامت تک، اس تک دین پہنچانا اصلاً اللہ تعالیٰ کا منشا ہے ذمہ داری حضرت محمد ﷺ کی لگائی گئی اور عملاً آپ ﷺ کی امت نے اس دین کو چہار دانگ عالم میں پہنچایا بلکہ اب بھی پہنچا رہی ہے اور قیامت تک یہ عمل جاری رہے گا۔ کہا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ سے پہلے جتنے انبیا و رُسل علیہم السلام تشریف لائے وہ علاقائی یعنی ریجنل انبیاء تھے اور اپنی قوم اور قبیلہ کی طرف مبعوث ہوئے تھے جیسے حضرت عیسیٰؑ یا بنی اسرائیل' سے خطاب کر رہے ہیں گویا وہ حضرت یعقوبؑ کی اولاد کی طرف رسول تھے۔ اور اس بات کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ ان کی تعلیمات بھی علاقائی، صرف ایک قبیلہ کے لیے اور کسی مخصوص رنگ و نسل کے لوگوں کے لیے تھی۔

- حضرت محمد ﷺ پر ختم نبوت کے بعد جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ ذمہ داری سنبھالی اور ادا کرنے میں مصروف ہو گئے تو ان کی مشابہت عملی اعتبار سے سابقہ انبیا کرام علیہم السلام کے ساتھ ہو گئی

کہ ان کی دعوت قرآن مجید ہی کی ہے مگر اس کی فقہی و عملی تفصیل علاقائی ہے اور اس علاقے کے رواج، عرف اور مزاج کے مطابق ہے۔ جہاں تک اسلام کے فقہائے عظام نے اس ضرورت کا احساس کیا اور اس پر عمل درآمد ممکن ہوسکا۔ بالفاظ دیگر صحابہ کرام کی تعلیمات میں فقہی معاملات میں عرف کا لحاظ رکھا گیا تا کہ لوگوں میں اجنبیت اور اوپرا ہٹ کا احساس جنم نہ لے سکے۔

دورِ خلافت اور اس کے بعد اسلام تین اطراف میں ہی پھیلا ہے۔ ایک جزیرہ نمائے عرب سے مشرق کی جانب، دوسرے ملک شام اور اس کے اوپر کے علاقوں میں عالم عیسائیت کی طرف اور تیسرے مغرب کی طرف اسکندریہ، مصر، لیبیا سے مراکش اور اندلس تک۔

مشرق میں اسلام کی توسیع و اشاعت کے دو گوشے تھے:۔ ایک گوشہ وہ تھا جو آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں عرب تاجروں سے میل جول اور اچھے کردار کی وجہ سے بھارت کی جنوب مشرقی ریاستوں یا انڈونیشیا ملائیشیا کے تاجر حضرات ایمان لے آئے اور وہاں اسلام پھیلا۔ دوسرے گوشہ کا ہمارا اشارہ عرب اور کوفہ کے مشرق میں ایران اور پھر ایران سے خراسان اور افغانستان ہے یہیں سے اسلام آج کی روسی ریاستوں سمرقند، ترمذ، بخارا وغیرہ کے علاقوں میں پہنچا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی تبلیغِ اسلام کی مساعی سے اسلامی حکومت کی توسیع کے ساتھ ان علاقوں میں اسلام پھیلتا چلا گیا۔ عرب سے مغرب کی طرف مصر ہے۔ مصر فتح ہوا تو وہاں اسلام بھی پھیلا اور سوڈان، حبشہ تک پھیل گیا۔ پھر مغرب میں لیبیا، الجزائر، تیونس، مراکش اور سارا مغربی افریقہ اور پھر وہاں سے شمال کی طرف طارق بن زیادؒ کے ذریعے اندلس میں اسلام پہنچا۔

عرب سے مغرب، شمال اور مشرق میں اسلام پھیلنے کا عمل بھی انبیائے کرام علیہم السلام کی علاقائی تعلیمات سے بالکل مشابہ ہے۔ ایران، خراسان، افغانستان اور پھر وہاں سے خیبر کے راستے ہند میں اسلام کی فقہی تعلیمات آئیں اور دہلی میں حکومت بننے پر پورے ہند میں کوفہ سے نکلنے والے علمی سوتوں (SOURCES) ہی کی برکات تھیں ہماری مراد فقہِ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ یا فقہ حنفی ہے۔

الغرض دوسری صدی ہجری آنے تک عرب سے باہر ایران، افغانستان اور ہند میں فقہ حنفی پھیلی ہے۔ جبکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا خلافت راشدہ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے

قرب تھا وہ ان کا خیال رکھتے تھے ان کے علمی اثرات اور تلامذہ نے شمال کا رُخ کیا ہے وہاں ان کے خیالات و تصورات نے ایک نیا جہان پیدا کر دیا۔ علیٰ ھٰذا القیاس کچھ علاقے جہاں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد پہنچے ہیں وہاں ان کی سوچ نے ڈیرے ڈال دیے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی فکر نے بھی اپنی ایک جگہ پیدا کر لی تھی۔

- مختلف علاقوں میں جن اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ہوا ہے وہاں انہیں کی فکر اور انداز فکر نے جگہ پیدا کر لی ہے۔ یوں ابتدائی صدیوں میں ہی مختلف اطرافِ عالم میں فقہ اسلامی کے بنیادی طور پر چار مسالک بہت نمایاں اور واضح طور پر سامنے آ گئے ہیں۔

ان مسالک میں فقہ حنفی کے ساتھ دو خصوصی معاملات پیش آ گئے ہیں تو اس فقہ کو عوامی فقہ بننے میں دیر نہیں لگی۔ پہلا موقع فقہ حنفی کا امتیاز (ہمارے نزدیک) یہ رہا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (پیدائش 80ھ، وفات 150ھ) ایک تاجر تھے، لوگوں سے تاجرانہ تعلقات رکھتے تھے، ان کے ذہن رسا نے عام مسلمان کی فقہی معاملات سے رہنمائی کے لیے ایک معقول راہ اپنائی ہے۔ انفرادی رہنمائی اپنی جگہ بہت اہم ہے اور دنیا میں ہر بڑا کام کسی ایک شخصیت کے نام سے ہی پہچانا جاتا ہے چاہے دینی اعتبار سے ہو یا دنیاوی اعتبار سے۔ انہوں نے یہ کام اکیلے نہیں کیا بلکہ مشورہ کے لیے ایک چالیس رکنی بورڈ بنایا ہے۔ اسے مجلس اور بزم کا نام دیں یا اسمبلی یا سینیٹ کا نام دیں یہ ضمنی معاملہ ہے مگر امام ابو حنیفہ کے نزدیک فیصلے انفرادی سطح پر نہیں ہوتے تھے بلکہ ایک بڑا فورم تھا جس کے ممبران نامزد تھے اور وہ ان معاملات میں اپنے طور پر تیاری کر کے آتے تھے، مسائل پیش ہوتے تھے ان کی مختلف آراء آتی تھیں مختلف تنقیدی سوالات کیے جاتے تھے۔ اس میں بعض سوالات حقیقی ہوتے تھے اور فقہی معاملات کے مختلف گوشے سامنے لانے کے لیے یہ مایہ ناز رہنمایانِ قوم امت مسلمہ کے مستقبل کی تعمیر میں مصروفِ عمل رہے ہیں۔ یوں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ کو عوامی فقہ بنانے میں اس علماء کونسل کی تشکیل کو بڑا عمل دخل ہے۔

- فقہ حنفی کی تشکیل میں ایک عوامیّت پائی جاتی ہے اسی وجہ سے اس فقہ کو پہلے بھی عوامی پذیرائی ملی اور اس کی تشکیل میں آج کے تصورِ اقبال کے طور پر اجتماعی اجتہاد (اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ) کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس میں مسلم حکومت کے مسائل کے جواب موجود ہیں۔ ایک

باریک فرق صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے دور میں یہ تھا کہ دور نبوی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ اور قریبی ساتھیوں کو عوامی اعتماد بھی حاصل تھا اور عام مسلمانوں کی گردنیں ان کے سامنے جھکی رہتی تھیں ان کے فیصلے قبول کیے جاتے تھے اوران کی صحت اور مسائل کی صحیح عوامی نشاندہی کو ان کی پذیرائی میں بڑا عمل دخل ہے۔ ایک فقہی اور اجتماعیت انسانی کا گوہر نایاب جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے پالیا تھا کہ بہت اہم ہے کہ دوسری صدی ہجری کے ابتدائی سالوں میں حکومتی اور ریاستی سطح پر دور بنواُمیہ کا آخری زمانہ ہے اور یہ اس خاندانی حکمرانی کے ڈوبتے سورج کا آخری پہر ہے جب سورج تیزی سے روبہ غروب ہوتا ہے۔ امام صاحب کی نگاہِ دوررَس نے اس حقیقت کو پالیا تھا کہ اب آگے جو سیاسی دور آئے گا جس کے خدو خال فطرت تراش رہی تھی کہ اب انسانیت (اور مسلمان امت بھی) دور صحابہ کی وحدت سے ایک داخلی تقسیم کی طرف جارہی تھی پہلے ایک تقسیم علماء دین اور عمائدین ریاست کی تقسیم ہے۔

- انسانی اجتماعیت کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ دور خلافت راشدہ کے بعد جو حکمران آئے وہ خاندانِ بنواُمیہ کا ایک طبقہ تھا۔ اور دوسرا طبقہ ان علمائے دین کا تھا جو علم دین حاصل کرکے اس کو اپنے اور اپنے متعلقین میں خلوص سے پھیلانے اور عمل کرنے پر نگاہیں مرکوز کیے ہوئے تھا۔ حکمرانی ایک خاندان میں چلی گئی اور مخلص اہل علم حکومتوں سے لاتعلق ہوگئے۔ پھر ان اصحابِ علم و فضل میں بھی ایک تقسیم سامنے آگئی کہ ایک طبقہ علماء حکومت وسیاست سے تعلقات رکھنے کی بنا پر دونوں میں ہم آہنگی اور بقائے باہمی (CO-EXISTANCE) کو اسلام کے حق میں بہتری کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور علماء و مصلحین کا دوسرا طبقہ حکومت کے حق میں بات ہو یا حکمرانوں کے خلاف بات حق کی کرنی چاہیے اسی میں اسلام کی خدمت اور 'زندگی' خیال کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر دوسری صدی ہجری کے حالات و واقعات کو سمجھنے میں ایک بنیادی کلید کی حیثیت رکھتا ہے

وَهَلْ اَفْسَدَ الدِّيْنَ اِلَّا الْمُلُوْكُ
وَ اَحْبَارُ سَوْءٍ وَ رُهْبَانُهَا

علماء کا ایک طبقہ وقت کے حکومتی ایوانوں سے ربط وضبط کی بنا پر اور حکومتی مصالح کا جا بے جا لحاظ کی وجہ سے علمائے سوء کہلاتا ہے۔

● دوسرا پہلو جس نے ہمارے فقہی مسالک میں سے فقہ حنفی کے عوامی بننے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے وہ دورِ بنوعباس میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فقہی کام کی قدردانی کی بنیاد پر اس فقہ کو سرکاری قانون کا درجہ حاصل ہونا ہے۔ اس حقیقت کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ 132ھ (750ء) میں جب دورِ بنوعباس کی داغ بیل پڑی تو حکومت کے مسائل میں سے ایک بہت بڑا مسئلہ 'عدلیہ' کی تشکیل کا مرحلہ تھا۔

زمانہ (اور زمانے کے حالات و واقعات) انسان کا سب سے بڑا استاذ ہے جو انسان کو بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔ جن ہاتھوں میں بنوعباس کا اقتدار تھا اور تاریخ اپنے جس مقام پر تھی (عہد نبوت سے ڈیڑھ صدی بعد کا زمانہ صحابہ اور تابعین کا دور گذر چکا تھا) اُس سے حکمرانوں کے لیے اب ایک فیصلہ کن مرحلہ یہ تھا کہ سلطنت اسلامیہ تین براعظموں پر پھیلی ہوئی ہے، دور ابھی اونٹوں اور گھوڑوں پر سفر کا ہے، حکومتی انتظام و انصرام روزِ اوّل سے ضروری ہے لہٰذا حکومتی سطح پر ایک 'قانون' درکار ہے اور اس وقت وسائل و ذرائع علم بہت محدود تھے (جبکہ آج کے ONLINE دور میں علم انسان کے سامنے دست بستہ کھڑا ہے کمپیوٹر کا بٹن دباؤ تو ہر قسم کی معلومات حاضر ہے) یہ ممکن نہیں تھا کہ بغداد، دمشق اور ماوراء النہر میں بیٹھے کسی جج کو قرآن مجید کا ایک نسخہ اور احادیث کے چند متداول نسخے (جو وقت کے ساتھ ساتھ اب صحاح ستہ کہلاتے ہیں) دے دیے جائیں کہ جو معاملہ سامنے آئے اس میں سے اس کا حل نکال کر فیصلہ کر دو۔ اس صورت میں مختلف مقامات پر بلکہ ایک ہی شہر کے دو جج دو مختلف فیصلے کرنے میں آزاد ہیں۔ جبکہ حکومتی استحکام اور عوامی سطح پر انصاف کی جلد فراہمی کی خاطر آج بھی اور 1200 سال قبل بھی جج کے لیے ایک مرتب شدہ قانون (CODIFIED LAW) درکار ہے جس سے وہ صرف درپیش مسئلہ کو کسی دفعہ (CLAUSE) کے تحت کر کے فیصلہ سنا دے۔

خوش قسمتی سے یہ کام امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قانونی مزاج اور مؤمنانہ فراست سے، بہت پہلے ہی محسوس کر کے، ایک علماء کی کونسل کے ذریعے، سرانجام دینے کی ابتداء کر رکھی تھی اور ایک قابل لحاظ حد تک حکومتی ضرورتوں کو کفایت کرتا تھا (اور آج کے دورِ جدید کے تقاضوں کے اجتماعی اجتہاد سے بھی قریب ترین ہے)۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو خلیفہ وقت نے

حکومت کے قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا تھا جس کا امام صاحب نے بر بنائے مزاجِ شاہاں انکار کر دیا تھا کہ حکمران مجھ سے اپنی مرضی کے فیصلے کرانا چاہیں گے اور میں ایسے نہیں کر سکوں گا لہٰذا میں یہ عہدہ قبول نہیں ہی نہیں کرتا۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ کو قید کر دیا گیا اور انہوں نے جیل جانا قبول کر لیا۔ ان کی وفات 150ھ میں قید خانے میں ہوئی اور وہیں سے ان کا جنازہ اٹھا۔

آج کے دور میں عدلیہ اور پارلیمنٹ علیحدہ ریاستی ستون ہیں اور انتظامیہ الگ ہے۔ ان حالات میں اس عوامی فقہ کے ابتدائی نفاذ اور سیکولر مغربی قانون سے اسلام کی طرف آنے کا آغاز ایک مبارک قدم ہوگا۔

حکومتی ضرورت اور انصاف کی فراہمی کی خاطر حکمرانوں نے کس کس سے رابطہ کیا ہوگا معلوم نہیں مگر امام صاحب کے شاگرد قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے مصالح اُمت کے تحت یہ عہدہ قبول کر لیا اور یوں فقہ امام ابوحنیفہ اس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی حکومت کا سرکاری مذہب اور قانون بن گیا۔

● اس بات میں کلیتاً مشابہت ہے کہ علامہ اقبال آزاد مسلمان ریاست کے لیے قانون کی ضرورت محسوس کرتے تھے مگر بوجوہ وہ کامیاب نہ ہوسکا کہ ایک مرتب قانون (جدید دور کی ضرورت کے مطابق) مہیا کر سکیں۔ قائداعظم کے سامنے 14 راگست کو یا اس سے پہلے اگر کوئی (اسلامی فقہ) قانون (سول اور کریمنل) کا مسودہ پیش کر دیا جاتا تو وہ فوراً لاگو ہوسکتا تھا۔

اسی طرح قارئین کرام کے لیے یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ بنواُمیہ کی حکومت کو گرانے کے لیے 132ھ سے پہلے جو کوششیں ہوئیں اور سیاسی معرکہ آرائی ہوئی ہے اس میں بنوعباس یعنی حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پوتوں اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے پوتوں کی مشترکہ کوششوں کا عمل دخل ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد بھی اس جدوجہد میں شریک رہے ہیں۔ یہ بات بڑی قابل فہم ہوتی اگر بنوعباس، حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ کو نافذ کر دیتے (وہ ان کے اتحادی تھے اور سابقہ حکومت کو گرانے اور اقتدار کے حصول کے لیے سیاسی اکھاڑ پچھاڑ میں برابر کے شریک تھے) مگر ہم تاریخی طور پر دیکھتے ہیں کہ بوجوہ ایسا ممکن نہ ہوسکا۔ (یا تو حضرت جعفر صادق نے اپنا فقہی سرمایہ حکمرانوں کے حوالے نہیں کیا

یا انہوں نے مانگا ہی نہیں یا تیسری ممکنہ صورت یہ ہے کہ فقہ جعفریہ اتنی وقیع نہیں تھی کہ تین براعظموں پر پھیلی حکومت کی عدالتی وقانونی ضرورتیں کماحقہ پوری کر سکے۔ واللہ اعلم)

- بنوعباس کا دور حکومت 524 سال ہے۔ 132ھ تا 656ء (بمطابق 750ء تا 1258ء) ان پانچ صدیوں میں فقہ حنفی نے ایک عظیم سلطنت کی قانونی اور عدالتی ضرورتیں پوری کی ہیں۔ پھر سلطنت مغلیہ ہے اور سلطنت عثمانیہ ہے جو بنوعباس سے بھی کہیں بڑی سلطنت اور عصر حاضر کی سلطنت ہے جبکہ مغربی برطانوی استعمار جوان تھا اور اس کے اثرات اس سلطنت پر غیر مرئی طور پر اور نظریاتی سطح پر پڑ رہے تھے۔

ہمارے اہل سنت کے فقہی وعدالتی سرمایہ میں جو چار فقہی مسالک ہیں ان کے بانیان کے نام تاریخی ترتیب کے ساتھ حسب ذیل ہیں:

امام ابوحنیفہ (نعمان بن ثابت) رحمۃ اللہ علیہ 88ھ-150ھ بمطابق 699ء-767ء

امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ 93ھ-179ھ بمطابق 712ء-795ء

امام شافعی (محمد بن ادریس) رحمۃ اللہ علیہ 150ھ-204ھ بمطابق 767ء-820ء

اما احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ 164ھ-240ھ بمطابق 780ء-855ء

اہلسنّت میں ان چار سے الگ اہل ظاہر علماء امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی تعبیرات کے قائل ہیں۔

امام بخاری 194ھ-256ھ بمطابق 810ء-870ء

شیعہ مسلک کے مسلمانوں کے لیے فقہ جعفریہ کے بانی حضرت جعفر صادق (83ھ-148ھ بمطابق 702ء-765ء) ہیں۔

- جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا دوسری صدی کے آتے آتے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اسلامی اور دینی سرمایۂ علم اور اخلاص وخلافت وتمکّن فی الارض تین حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور یہ تقسیم وقت کی ضرورت اور انحطاطِ علمی وعملی کا منطقی تقاضا تھا:

(۱) حکمران (۲) علماء (علماءِ حق وعلماء سوء) (۳) صوفیاء (رہبانِ سوء اور مخلص صوفیا)

- دورِ بنوعباس میں سلطنت کے استحکام اور امن کے زمانے میں غیر مسلم اقوام سے رابطے (INTERACTION) سے جو خرابیاں مسلمانوں میں در آئیں ان میں یونانی فلاسفہ کے

ازکاررفتہ فرسودہ سیکولراور لادین خیالات ونظریات بھی تھے جو یہود (بنی اسرائیل) نے خود پروان چڑھائے اوران کو بڑھاوا دیا۔ کئی فلسفیانہ کتابوں کے عربی میں تراجم ہوئے جس سے اسلامی عقائداور مابعدالطبیعات (METAPHYSICS) میں طرح طرح کی موشگافیوں نے جنم لیا جس کو سنبھالنے کے لیے اہلِ حق علماء اور مخلص صوفیاء نے آگے بڑھ کر اسلام اور اسلام کی مابعدالطبیعاتی تعبیرات کی تشریح کی اوران کو تحریری شکل میں لاکر اسلام کے قلعے پر اس ابلیسی حملہ کا دفاع کیا ہے چنانچہ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ فطرتِ انسانی کے عین مطابق کئی صدیوں کے تعامل سے دو معتدل نقطہ ہائے نظر وجود میں آ گئے۔ فقہی اختلافات میں کبھی کبھی ٹکراؤ کی طرح اس نظریاتی سطح پر بھی امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے خیالات اور تعبیرات کا فرق ہے مگر بحمداللہ دونوں تعبیرات کو امت مسلمہ مانتی اور تسلیم کرتی ہے لیکن دونوں کا احترام بھی کرتی ہے۔ ان دو تعبیرات کا نام دو کتابوں کے حوالے سے ہی متعارف ہے۔ i۔ عقیدہ طحاویہ ii۔ عقیدہ واسطیہ

چنانچہ تاریخ کے اس عرصے یعنی دورِ بنوعباس میں ہم دیکھتے ہیں کہ دین اسلام کے وسیع تر دائرے کے اندر ان تعبیرات کی بنیاد پر ایک تقسیم ہے جو ایک حقیقت ہے جس کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے اس کا نہایت حسین امتزاج قابل فخر بھی ہے چنانچہ ہمارے نزدیک دین اسلام کی تعبیرات کے حوالے سے چوتھی صدی ہجری کے بعد آج تک جو شخصیت بھی اپنی خدمات، تحقیق، تدریسی، اصلاحی وانقلابی وجہادی کام کی نسبت سے مشہور ہوئی ہے اس کو چار فقہی مسالک میں سے ایک مسلک اور عقائد کے میدان میں دو تعبیرات میں سے ایک کو چننا پڑا ہے۔

اس حسین امتزاج کی مثال ہمارے نزدیک حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (561ھ) کی ہے جو فقہی مسلک کے لحاظ سے حنبلی مسلک کے پیرو ہیں مگر عقیدہ میں عقیدہ طحاویہ کے ماننے والے ہیں۔ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ، مسلک کے اعتبار سے علمائے اہل حدیث یا امام بخاری کے مسلک پر ہیں چنانچہ ان کی مشہور کتاب 101 احادیث کا مجموعہ ان کے فکر کا آئینہ دار ہے۔ مگر عقیدے کے لحاظ سے عقیدہ طحاویہ کے ماننے والے اور امام غزالی کے قریب ہیں۔

5 جنوبی ایشیا میں اسلام کی آمد

یوں تو جنوبی ایشیا میں وادئ سندھ بشمول افغانستان پہلی ہجری میں ہی اسلام کے

مراعات حاصل کر کے کو خوشحال تھیں۔ اس لیے لوگ ان صوفیاء کی تعلیمات کو سنتے اور اسلام کو قبول کر لیتے تھے۔ ان صوفیاء میں بابا فرید الدین گنج شکر، شیخ عثمان علی ہجویری، حضرت معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہم وہ ہستیاں ہیں جو عین کفر کے گڑھ میں جا کر بیٹھیں اور مخالفین اسلام کے ماحول میں اسلام کی تبلیغ کی۔ اللہ نے ان کی مدد فرمائی اور اسلام پھیلا۔ یہاں کے عوام کے ذہنوں میں صوفیاء کا اسلام اور فقہ حنفی کے اثرات بہت گہرے ہیں۔

یہاں پر قرآن اور حدیث کی تعلیمات بہت بعد میں پہنچی ہیں۔ امام بخاری نے 860ء کے لگ بھگ بخاری شریف تالیف فرمائی، اس زمانے میں کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں لوگ کتابوں کے حافظ بن جاتے تھے مگر کتابوں کو خریدنا صرف امراء و بادشاہوں کے بس میں تھا۔ قرآن مجید کے ہاتھ کے نسخے آج کے حساب سے لاکھوں روپے کے ہوتے تھے۔ یہ تو آج پریس کی برکت ہے کہ کتابیں سستی اور عام ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں حدیث کی تعلیم کا آغاز 1600ء کے لگ بھگ کیا۔ بخاری شریف کا کوئی نسخہ بادشاہ کے کتب خانے میں ہوگا مگر عوامی سطح پر اس مجموعہ احادیث کی کتاب کو دہلی پہنچنے میں 800 سال لگ گئے۔

اب چاہے ہمارے قابل احترام سلفی بھائی (یا شافعی و حنبلی مسلک کے بھائی) یہاں کے مسلمانوں کو از سر نو مسلمان کرنا چاہیں تو بھلے آگے بڑھیں میدان کھلا ہے کلمہ پڑھایئے مگر یہاں کے مقامی مسلمانوں کی نفسیات اور خمیر بنا انہی اکائیوں سے ہے یعنی حنفی مسلک اور صوفیاء کرام کی تعلیمات سے۔

جنوبی ایشیا میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ 1300ھ تک نہ ہونے کے برابر ہے۔ 1300ھ کے لگ بھگ یہاں تصانیف سے امام ابن تیمیہ اور ان کے کام کا تعارف ہوا۔ ویسے ہی ہر انسان میں نئے خیالات اور نئی چیزوں کا اپنانے کا ایک شوق پایا جاتا ہے۔ یہاں دیگر شعبوں کی طرح تصوف اور گدی نشینوں کے رویوں اور زندگیوں میں اسلام مخالف اور دین مخالف عنصر بڑھ گیا تھا جہالت اور اندھی تقلید سے ایک طبقہ تصوف سے نفرت کرتا تھا انہوں نے آگے بڑھ کر امام ابن تیمیہ کی تعلیمات کو قبول کیا ہے۔ اس پر اس وقت اضافہ ہو گیا جب بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی میں حجاز میں آل سعود کی حکومت قائم ہوئی۔ اس حکومت نے خود بھی بالا رادہ اور اپنے

مراعات حاصل کر کے کو خوشحال تھیں۔ اس لیے لوگ ان صوفیاء کی تعلیمات کو سنتے اور اسلام کو قبول کر لیتے تھے۔ ان صوفیاء میں بابا فرید الدین گنج شکر، شیخ عثمان علی ہجویری، حضرت معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہم وہ ہستیاں ہیں جو عین کفر کے گڑھ میں جا کر بیٹھیں اور مخالفین اسلام کے ماحول میں اسلام کی تبلیغ کی۔ اللہ نے ان کی مدد فرمائی اور اسلام پھیلا۔ یہاں کے عوام کے ذہنوں میں صوفیاء کا اسلام اور فقہ حنفی کے اثرات بہت گہرے ہیں۔

یہاں پر قرآن اور حدیث کی تعلیمات بہت بعد میں پہنچی ہیں۔ امام بخاری نے 860ء کے لگ بھگ بخاری شریف تالیف فرمائی، اس زمانے میں کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں لوگ کتابوں کے حافظ بن جاتے تھے مگر کتابوں کو خریدنا صرف امراء و بادشاہوں کے بس میں تھا۔ قرآن مجید کے ہاتھ کے نسخے آج کے حساب سے لاکھوں روپے کے ہوتے تھے۔ یہ تو آج پریس کی برکت ہے کہ کتابیں سستی اور عام ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں حدیث کی تعلیم کا آغاز 1600ء کے لگ بھگ کیا۔ بخاری شریف کا کوئی نسخہ بادشاہ کے کتب خانے میں ہوگا مگر عوامی سطح پر اس مجموعہ احادیث کی کتاب کو دہلی پہنچنے میں 800 سال لگ گئے۔

اب چاہے ہمارے قابل احترام سلفی بھائی (یا شافعی و حنبلی مسلک کے بھائی) یہاں کے مسلمانوں کو از سر نو مسلمان کرنا چاہیں تو بھلے آگے بڑھیں میدان کھلا ہے کلمہ پڑھائیے مگر یہاں کے مقامی مسلمانوں کی نفسیات اور خمیر بنا انہی اکائیوں سے ہے یعنی حنفی مسلک اور صوفیاء کرام کی تعلیمات سے۔

● جنوبی ایشیا میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ 1300ھ تک نہ ہونے کے برابر ہے۔ 1300ھ کے لگ بھگ یہاں تصانیف سے امام ابن تیمیہ اور ان کے کام کا تعارف ہوا۔ ویسے ہی ہر انسان میں نئے خیالات اور نئی چیزوں کا اپنانے کا ایک شوق پایا جاتا ہے۔ یہاں دیگر شعبوں کی طرح تصوف اور گدی نشینوں کے رویوں اور زندگیوں میں اسلام مخالف اور دین مخالف عنصر بڑھ گیا تھا جہالت اور اندھی تقلید سے ایک طبقہ تصوف سے نفرت کرتا تھا انہوں نے آگے بڑھ کر امام ابن تیمیہ کی تعلیمات کو قبول کیا ہے۔ اس پر اس وقت اضافہ ہو گیا جب بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی میں حجاز میں آل سعود کی حکومت قائم ہوئی۔ اس حکومت نے خود بھی بالا رادہ اور اپنے

کاموں سے بھی عقیدہ واسطیہ کی اشاعت کی۔

تصوف کے میدان میں اہل تصوف میں بدعت وغیرہ کا ردّ اہل سنت اور حنفی علماء بھی کرتے آئے ہیں، مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کام کیا ہے مگر تصوف میں کچھ باطنیوں کی روایات کا داخل ہو جانا اور شریعت پر عمل میں کوتاہی کی وجہ سے سرے سے نفس تصوف سے ہی بدکنا یہ اہل علم کو زیب نہیں دیتا۔ اس برائی کی اصلاح کی ضرورت ہے اور وہ اہل دین و دانش کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال امام غزالی و ابن عربی کے عقید تمند ہو کر بھی مروّجہ تصوف اور گدی نشینوں پر جو تنقید کرتے ہیں ویسی شاید علماء نے کبھی نہیں کی۔ عقلاً بھی یہی بات قرین قیاس ہے کہ غلطی کی اصلاح کرنا ضروری ہے اور امر بالمعروف ایک فریضہ ہے۔ موٹر وے اور ہائی وے پر دو چار بڑے ایکسیڈنٹ ہو جائیں تو اس کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ چونکہ موٹر وے پر ایکسیڈنٹ ہو رہے ہیں لہٰذا موٹر وے بند کر دیا جائے بلکہ حادثات کی روک تھام کی جائے۔

اسی طرح تصوف کی خرابیاں دور کرنے کا میدان کھلا ہے۔ خود اہل سنت اور اہل تصوف بھی یہ کام کر رہے ہیں۔ آئیں امام ابن تیمیہ کے ماننے والے بھی یہ کام کریں مگر تصوف کے خلاف صف آرا ہو جانا اور اس شعبے کا ہی انکار کر دینا ہمارے نزدیک اپنے آپ کو آج کے مغربی و سیکولر افکار کے قریب کرنے کے مترادف ہے۔ اعاذنا اللہ من ذالک

جنوبی ایشیا کے مسلمان اس لحاظ سے بڑے فراخ دل ہیں اور سینہ کشادہ رکھتے ہیں۔ اسلام کے اندر اختلاف رائے رکھنے والوں کو برداشت کرتے ہیں۔ یہاں امام ابن تیمیہ کا موقف پھیلائیں تصوف کے خلاف تحریک چلائیں الیکشن میں حصہ لیں آزادی ہے اختلافات کے باوجود شیر و شکر ہیں۔

عقل تقاضا کرتی ہے کہ امام ابن تیمیہ کے ماننے والے اپنے علاقوں میں بھی اتنی ہی فراخ دلی دکھائیں۔ ریاض میں علامہ اقبال کے افکار کے فروغ کا کام ہو، اس کے اجلاس ہوں سیمینارز ہوں مگر یہ بات شاید WISHFULL THINKING سے آگے نہ بڑھ سکے۔

پاکستان میں اس کے برعکس آپ امام ابن تیمیہ کے معتقد ہیں اس کا آپ برملا اظہار کریں الیکشن میں حصہ لیں کہ اے امام ابو حنیفہ کے ماننے والو اور تصوف کے متوالو! ہمیں ووٹ دو

ہم کامیاب ہوکر آپ کے ربیع الاوّل کے جلوس بند کردیں گے مزارات گرادیں گے عرس بند کردیں گے عوام اس پر کشادہ دلی دکھاتے ہیں ووٹ شاید نہ دیں مگران کی سادہ لوحی پر حیران ضرور ہوتے ہیں۔ عوامی سوچ کے برخلاف کسی موقف کو پھیلاتے رہنا کہ کبھی تو اکثریت میں بدل جائے گا اور بات ہے اور اقلیت میں ہوکر اکثریت کے مذہبی نظریات کی نفی کے لیے الیکشن کی سیاست میں حصہ (جس میں گنتے ہی بندوں کو ہیں) لینا اور اکثریت کی امید رکھنا کہ ہم کبھی اقتدار میں آجائیں گے۔ ایک عجوبہ سے کم بات نہیں ہے۔

جنوبی ایشیا میں اجتماعی سطح پر شیعہ مسلک بابر کے عہد تک نہ ہونے کے برابر تھا ہمایوں کو جب شیر شاسوری نے شکست سے دوچار کردیا تو کسی کے مشورے سے ایران چلا گیا وہاں سے چند سالوں بعد ایک فوج لے کر آیا اور شیر شاہ سوری کے بیٹے سے جنگ میں کامیاب ہوکر دہلی کا تخت دوبارہ حاصل کرلیا۔ یوں ایران سے آئے فوجی وفوجی ہان کمان کے لوگ ہمایوں کی مونچھ کا بال بن گئے اور ملک کے طول وعرض میں جاگیریں حاصل کیں اور آج تک ایک موثر حیثیت میں چلے آرہے ہیں۔ سرکار دربار تک رسائی اس سے اضافی ہے۔ جہانگیر کی بیوی نور جہاں شیعہ تھی۔ اورنگ زیب صحیح المسلک اہل سنت مسلمان تھا مگر اس کے دونوں بیٹوں کے اتالیق شیعہ تھے۔ اورنگ زیب کی وفات پر اس کے دونوں بیٹے شیعہ ہوگئے۔ برطانوی دور میں بھی انہیں مراعات ملتی رہیں اور پاکستان بننے کے بعد بھی بلاشبہ ایک موثر طبقہ کے طور پر ملک کا حصہ ہیں۔ بلکہ صوبائی وفاقی بیوروکریسی، پولیس، کے علاوہ ہر سلیکشن بورڈ، انٹرویو کمیٹی، مذاکراتی ٹیم کا حصہ ہوتے ہیں۔ اہل سنت انگریز کے آنے پر نالاں تھے پھر بینکنگ کا نظام آیا تو سود کی وجہ سے اہل سنت اس نظام سے دور رہے حتیٰ کہ اس کی ملازمت سے بھی گریز کرتے رہے مگر شیعہ مسلک کے لوگ نہ معلوم کیوں بینکنگ کے شعبہ میں ایسے گھسے کہ شیر مادر ہے۔ یکے بعد دیگرے پاکستان بننے سے پہلے اور بعد بینکنگ کے شعبہ پر چھاگئے بہت دیر سے اہلسنّت مسلک کے کچھ لوگ اس طرف متوجہ ہوئے مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ اسی طرح ساری دنیا کی طرح مغربی بالادستی کے دور میں سینما، فلمیں فلم انڈسٹری، ناچ گانا میوزک میں بھی اہل سنت نے کراہت محسوس کی مگر شیعہ مسلک کے لوگ اس شعبہ میں بھی بلا کراہت گھس گئے اور غالب اکثریت میں ہوگئے۔ ہمیں ان سے کوئی مسابقت نہیں

کرنی اور نہ ان سطور میں اہل سنت عوام کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ ان شعبوں میں گھسیں اور شیعہ مسلک کے بھائیوں کو پیچھے کر دیں بلکہ ایک حقیقت کے طور پر بات سامنے رکھ دی ہے۔ سود ایک لعنت ہے حرام ہے اور بینک اس حرام کاری کے اڈے ہیں۔ چاہے اہل سنت یہ کام کریں یا شیعہ یا یہود۔ خباثت خباثت ہے چاہے تھوڑی ہو یا ڈھیروں میں ہو۔

6 حاصل کلام

علامہ اقبال کی ذہنی تشکیل (INTELECTUAL FABRIC)

باقی زعماءِ قوم اور رہنمایانِ قوم کے بارے میں جاننا کہ کون کس تحریک سے متاثر ہے اور کون کس مسلک سے ہے یہ عوام کا کام ہے اور ہر مسلک کے وابستگان کا۔ البتہ یہاں علامہ اقبال کے بارے میں ہم برملا کہتے ہیں کہ وہ تحریک محمد بن عبدالوہاب سے متاثر ہوئے نہ مارکس و اینجلز کی تصانیف سے، نہ ہٹلر کی نازی پارٹی کے منشور سے نہ امام ابن تیمیہ سے، نہ تحریک خلافت سے نہ بحالیٔ خلافت کی تحریک سے کہ نظریاتی حکومت مانگنے سے نہیں ملتی، بزورِ شمشیر حاصل کی جاتی ہیں۔ وہ تعلیماتِ اسلامی کے قدردان تھے، قرآن مجید کے عاشق تھے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں بے پناہ محبت اور وارفتگی کی حد تک عشق تھا، وہ حنفی المسلک تھے، پیر جماعت علی شاہ کے معتقد، غازی علم الدین شہید کے قدردان اور تصوف کی دنیا میں غزالی و رومی و ابن عربی کے خوشہ چین۔ البتہ تصوف میں بے جان جذبوں اور نیند آور نظریات و افکار سے دور تھے، نظریۂ خودی کے تحت اپنی انائے صغیر کو جگانے مثبت کام کرنے باضمیر ہونے اور اس کے تقاضے پورے کرنے کے خود بھی روادار تھے اور اس کے مبلغ بھی تھے ان کا پورا فلسفہ ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزے بے خودی'' میں عیاں ہے۔ وہ ملت اسلامیہ کے عصر حاضر میں حدی خواں تھے اور اسلام کے شاندار مستقبل کے نقیب اور مرغِ سحر تھے وہ اپنے کلام کی بانگ درا سے اُمت کو جگا کر ایک منظّم قوم کی صورت میں سوئے قطارِ کشم کے داعی تھی تھے اور عالمی ملت اسلامیہ کی تشکیل میں علمی سطح انہی آفاقی تصورات کا اسلام بھی تقاضا کرتا ہے یعنی قرآن وحدیث کا تقاضا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن مجید میں ہے کہ "اِلٰی کَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا" آپ تمام انسانیت کے لیے بشیر و نذیر بن کر آئے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات آفاقی ہیں مگر

عملاً انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کی طرح آج کے مسلمان زعماء بھی اپنے علاقے اور ماحول کے عرف اور ذہنی سطح کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اقبال جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے خاص دینی وفکری خمیر کے پس منظر میں ہی اصلاحِ احوال کی بات کرتے ہیں۔

دوسرے ہم عصر رہنماؤں اور بعد کے بہت سے رہنماؤں کے برعکس علامہ اقبال کو جو عوامی پذیرائی ملی وہ اُن کے اسی عوامی دینی وفقہی خمیر کی سطح پر کیے گئے تجزیے کی بنیاد پر ہے۔ جس میں فقہ حنفی اور غزالی و رومی کے مذہبی و روحانی تصورات کی حقیقی عکاسی ہے۔ علامہ اقبال کے اردو کلام میں انہیں کے صوفیانہ اور روحانی تجربہ کی بنیاد پر مردِ مومن کا تصوراتی خاکہ ہے جو انھوں نے پیش کیا۔ یہ تیر کی طرح سیدھا عوام کے دل میں جالگا بغیر کسی جماعت اور تنظیم کے یہ شاعر حیدرآباد دکن سے کشمیر اور کابل تک دلوں کی آواز بن گیا۔ مزید براں جنوبی ایشیا سے باہر بھی جن ممالک میں علامہ اقبال کے تصورات اور شاعری کو پذیرائی ملی وہ رومی وغزالی کے نظریات و حنفی فقہی تصورات کے قریب تھے جبکہ وہ مسلم ممالک جہاں علامہ ابن تیمیہ کے افکار کا چرچا ہے وہاں نہ پہلے اور نہ اب علامہ اقبال کی پذیرائی ہے۔

صرف یہی نہیں، مغربی دنیا نے علامہ اقبال کے اسی نظریۂ خودی (جو روح کے علیحدہ فعّال تصوّر یعنی تصوّف اور غزالی و رومی کی تعلیمات کے قریب ہے) کو دبانے اور اسلام کے روحانی تصورات کا راستہ روکنے کے لیے علامہ اقبال کی شخصیت کو دبایا ہے اور باقاعدہ منصوبہ کے ساتھ مسلمان عوام کے ذہن وقلب سے محو کرنے کی سرتوڑ کوشش کی ہے تا آنکہ 'مریض مر چکا ہے' کی رپورٹ پر علامہ اقبال کی یومِ پیدائش اور یومِ وفات کی علامتی چھٹی بھی ختم کر دی گئی کہ نہ عوام میں کوئی اقبالی تڑپ ہے نہ اقبالیاتی اداروں میں کوئی استعفاء دینے والی شخصیت ہے جو اس پر احتجاج کرے۔ جبکہ علامہ ابن تیمیہ کے تصوف مخالف افکار اور روح کا جداگانہ علیحدہ تشخص کا فلسفہ چونکہ آج کے مغربی فلسفہ کے قریب ہے اور اس کا مغربی علوم سے کہیں ٹکراؤ نہیں ہے، سعودی عرب سے کبھی ڈاروِن ازم اور فرائڈ ازم کے خلاف حقیقی اسلامی بنیادوں پر اعلیٰ علمی سطح کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی اور روح کے جداگانہ فعال تصور کے بغیر مغربی افکار کا پرزور ابطال ممکن ہی نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

کوئی فرد واحد ہو یا مسلمانوں کی کوئی علاقائی اجتماعیت (اس کی رہنمائی کے لیے) جہاں وہ کھڑے ہیں ان حالات سے نکلنے کے طریق کار پر بات شروع ہوگی اور منزل مقصود کی طرف جائے گی، REALISM سے بات شروع ہوگی اور IDEALISM پیش نظر رہے گا۔ کل روئے ارضی پر ہر علاقے اور ہر مسلک ومشرب کے مسلمان یہی ذہن لے کر اسلام کے مستقبل کے لیے کام کریں تو تمام مسلمان بالآخر ایک نقطے پر آ کر جمع ہو جائیں گے۔

اس باریک نقطے کو سمجھنے کے لیے ایک مثال سے شاید کچھ باشعور فعال لوگوں کے دل میں بات اتر جائے۔ اُمت مسلمہ روئے ارضی پر پھیلی ہوئی ہے اس کی مثال ایک بہت بڑے تالاب کی ہے جو خشک پڑا ہے اس میں عالمی سطح پر بے شمار افراد، تنظیمیں، جماعتیں، ادارے، حکومتیں کچھ نہ کچھ اپنا حصہ ڈال رہی ہیں مگر گزشتہ پون صدی کی کوششوں سے آنکھوں سے کوئی کامیابی نظر نہیں آ رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی کام کی رفتار کو تیز کرنا ضروری ہے۔ اس بڑے تالاب کی تہہ میں اختلافات اور اناؤں کے کھڈے بھریں گے اور پانی برابر ہوگا تو پھر جلدی سے یہ تالاب بھر جائے گا اور مسلمان بھی اور دنیا بھی امت مسلمہ کی بیداری اور عالمی رول کو اپنے آنکھوں سے دیکھیں گے۔ حالات سے بددل نہیں ہوتے بلکہ زیادہ EFFORT درکار ہے۔ آیئے سب مسالک کے لوگ اسلام کی خاطر اور غلامی کی باقی موجود نشانیوں کو مٹانے کی خاطر اسلام کے قانون کی طرف پیش قدمی کریں اور اس میں کامیابی حاصل کرلیں تو یہ کامیابی 1947ء کی آزادی سے زیادہ خوشی کا دن اور واقعہ ہوگا۔ ع ایں دعا از من از جملہ جہاں آمین باد
اس سے آسمانوں پر اللہ خوش ہوگا اور بانیانِ پاکستان کی روحوں کو سکون میسر آئے گا۔

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لا یخلف المیعاد دار

نواں باب

تمنا مختصر سی ہے مگر....

پاکستان میں نفاذِ اسلام
کے امکانی عملی اقدامات

366

1۔ قائداعظم اور RECONSTRUCTION

2 قراردادِ مقاصد اور 31 علماء کے 22 نکات

3 دیر آید درست آید

4 اسلام کے نفاذ کے اقدامات

5۔ چند ترتیب وار اقدامات

پاکستان میں نفاذِ اسلام کے امکانی عملی اقدامات

1 قائداعظم اور RECONSTRUCTION

- پاکستان کے قیام کے فوراً بعد قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان میں ایک سرکاری محکمہ تشکیل دیا تھا: DEPARTMENT OF ISLAMIC RECONSTRUCTION۔ یہ نام بھی غالب امکان ہے کہ علامہ اقبال کے خطبات سے ہی اخذ کیا گیا تھا۔ اس ادارے کے سربراہ علامہ محمد اسد نو مسلم تھے جن کو پاکستان کی شہریت دی گئی، پہلا پاکستانی پاسپورٹ دیا گیا اور کراچی میں کام کرنے کا موقع دیا گیا۔ اس وقت کراچی ہی پاکستان کا دارالحکومت تھا۔

- اس محکمہ کو قائداعظم کی رحلت کے بعد بند کر دیا گیا۔ اس محکمہ کے کام کی تفصیلات علامہ اسد نے اپنی کتاب 'ROAD TO MECCA' کے دیباچے میں اشارات میں دی ہیں اور اسی ادارے میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین بھی علامہ محمد اسد کے معاون کے طور پر متعین ہوئے تھے۔ اس ادارے کے ختم ہونے کے طویل عرصے بعد اقبال اکیڈمی قائم ہوئی جس کے ڈاکٹر محمد رفیع الدین سربراہ مقرر ہوئے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے خلافت کے ادارہ کے مکمل خاتمے (مارچ 1924ء) کے چند سال بعد مصر میں بحالی خلافت کے سلسلے میں کام کا آغاز ہوا، ابھی تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ پہلے یہ کام سعودی عرب اور پاکستان بننے کے بعد پاکستان منتقل ہوا عالمی سطح پر مسلمانوں کو پاکستان کے قیام سے اسلام کے شاندار مستقبل کی بڑی اُمیدیں وابستہ ہوگئی تھیں۔ دو عالمی

کانفرنسیں ہوئیں بعض غیبی اشاروں پر یہ کام پاکستان میں بند ہوگیا اور سعودی عرب نے اس مشن کو 'گود لے لیا'۔ اسی جذبے نے بعد میں اسلامی کانفرنسوں کا روپ دھارا۔ پہلی عالمی مسلم سربراہ کانفرنس 1969ء میں رباط میں ہوئی دوسری کانفرنس لاہور میں (1974ء میں) ہوئی پھر اس کام کو بھی بعض وجوہات کی بنا پر سعودیہ نے اپنے ذمے لے لیے۔ اس پر آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس وجود میں آئی۔ اس کا ہیڈ کوارٹر بھی جدہ میں تعمیر ہوا۔ بات ختم ہوگئی۔ گویا یہ جدہ میں مرکز کی تعمیرات OIC کا ایک خوبصورت مقبرہ ثابت ہوا ہے۔

2 قراردادِ مقاصد اور 31 علماء کے 22 نکات

- عوامی دباؤ کے تحت لیاقت علی خان کی حکومت نے مارچ 1949ء میں قراردادِ مقاصد منظور کر لی۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ پھر حکومت کے مطالبے پر ملک بھر کے 31 سربرآوردہ علماء نے 22 نکات پر مشتمل متفق علیہ تحریر حکومت کے حوالے کر دی جس میں قرآن وسنت کے مطابق ملکی نظام کو چلانے کے اقدامات کا ذکر تھا۔ (اس کا متن ضمیمہ جات میں دیکھیں)

- اگرچہ علماء نے علامہ اقبال کے نظریۂ اجتہاد پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا کہ اب اجتہاد انفرادی فتویٰ سے نہیں بلکہ اجتماعی ہوگا یعنی امکانی حد تک پارلیمنٹ ذریعے۔ اس ناراضگی کے نتیجے میں ہماری پارلیمنٹ یا قومی اسمبلی تو کھلم اجتہاد نہ کر سکی کہ جس سے اسلام کے اصولِ حکمرانی، اسلام کا عدل اجتماعی اور دیوانی وفوجداری قانون منظور ہو کر نافذ ہوجاتا مگر علماء نے انفرادی سطح پر بھی کوئی قابل قدر اور محسوس کیا جانے والا کارنامہ سرانجام نہیں دیا کہ یہ ہے اسلامی قانون کی عصر حاضر میں قابل نفاذ شکل ہے۔ نہ اس کے لیے کوئی تحریک چلائی گئی۔ جمہوریت اور انتخابات اور دیگر مطالبات کے لیے تحریکیں چلیں جس میں علماء نے نمایاں کردار بھی ادا کیا مگر تحریک نہیں چل سکی تو صرف اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے...... فیا حسرتا۔

3 دیر آید درست آید

'دیر آید درست آید' کے مصداق اس شمارے میں یہ سعی کی گئی ہے اور بات کو پورے استدلال اور تاریخی حوالوں کے ساتھ مبرہن کر دیا گیا ہے کہ اب بھی وقت ہے کہ پاکستان کو اس کے مقصد قیام کی طرف موڑا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کی ناقدری پر اس قوم

(مسلمانانِ جنوبی ایشیا) پر عذاب آ جائے اور پھر سپین کی طرح یہاں بھی (اعاذنا اللہ من ذالک) مسلمانوں کا خاتمہ ہو جائے اور اسلام کے نفاذ کے امکانات مستقبل قریب میں بالکل ہی ختم ہو جائیں یا کسی اور اسلامی ملک میں منتقل ہو جائیں۔

4 اسلام کے نفاذ کے لیے اقدامات

اسلام کا عصر حاضر میں نفاذ بہت بڑا مرحلہ ہے اور یقیناً یہ کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن ناممکن بھی نہیں۔ ناممکن اس لیے نہیں کہ قرآن و حدیث کے دلائل اور تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ قربِ قیامت میں اسلام دوبارہ غالب ہوگا پہلے کسی ایک ملک میں پھر وسعت پذیر ہو کر پوری دنیا (GLOBE) پر غالب ہو جائے گا۔ لیکن یہ معاملہ صرف تن آسانی، دنیاوی آسائشیں، مراعات اور تساہل پسندی کے ساتھ دین (اسلام) کو غالب کرنے کی ذمہ داریوں کے لازمی اور فرض ہونے کے احساس کے فقدان (کہ یہ ہماری ذمہ داری ہے بھی یا نہیں) کے ساتھ کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اسی احساسِ خبیثہ کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری مروّجہ اصطلاحات میں بیوروکریسی (BEAUROCRACY)، ڈیموکریسی (DEMOCRACY) کی طرح پنجابی زبان کے لفظ 'اللہ کریسی' (ALLAH-CRACY) کا ایسا خمار (PSEUDO SATISFACTION) کا غیر حقیقی احساس ساری قوم کے اعصاب پر سوار ہے کہ اسلام اور اسلامی قانون کے غلبے کے اس کام کو کوئی OWN کرنے اور اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیار ہی نہیں۔

اوپر مذکور تفاصیل کی روشنی میں نفاذِ اسلام کے لیے سب سے پہلا اور بڑا کام مسلمانوں (علماء وعوام) کے دلوں اور ذہنوں پر طاری ایک گہرے جمود کو توڑنا ہے۔ اس جمود کی وجہ سے تساہل اور تن آسانی کا دور دورہ ہے بلکہ منفی طور پر ہمارا رجوع اُخروی زندگی کی بجائے اب صرف دنیوی زندگی کی طرف ہو گیا ہے۔ اس جمود کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

i دورِ نبوت ﷺ اور دورِ خلافت راشدہ سے دُوری

ii مغرب کا عروج اور مسلمانوں کا زوال

iii اُمت مسلمہ پر یورپی اقوام کا عسکری غلبہ اور مسلمانوں کی کہیں ایک صدی اور کہیں دو صدیوں کی غلامی کے منحوس اثرات (اور یورپی اقوام یعنی دشمنانِ اسلام کا مقصد ہمیں تقسیم

درتقسیم کر کے آپس میں لڑانا تھا اور اب بھی ہے)۔

اب بقول علامہ اقبال (نظم طلوعِ اسلام 1923ء)

تو رازِ کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل! اُچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ ونسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم! اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

ان سطور کے ذریعے جو مختصر سی تمنا علماء کرام کے سامنے عرض ہے وہ یہ ہے کہ ہمیشہ بڑے کو پہل کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔ گھر کا معاملہ ہو یا برادری کا، سیاسی ہو یا کاروباری یہی انداز ہے۔ لہٰذا گذارش ہے کہ عرف عام میں جسے بریلوی مکتب فکر کہتے ہیں اس کے علماء کرام کو اس سلسلے میں پہل کرنی چاہیے کہ وہ ہمت کر کے اوّلاً ــــــ اپنے مکتب فکر کے داخلی اختلافات کو سلجھائیں منت سماجت سے کام لیں مصطفوی ﷺ مشن کا واسطہ دیں بہر صورت غالب اکثریت کو ایک قیادت اور جھنڈے کے تحت جمع کر دیں۔ یہ اتفاق ایک مشن پر اتفاق ہے اور مصالح امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے پیش نظر اتفاق ہے۔

ثانیاً ــــــ اب اس مکتب فکر کا ایک نمائندہ وفد معروف دیوبندی مکتب کے اکابرین سے ایک جذبے اور مشن کے ساتھ کئی ملاقاتیں کرے۔ دیوبندی مکتب فکر کے علماء وصوفیاء ومبلغین اس مشن کے لیے پہلے ایک جھنڈے تلے جمع ہوں پھر اس مکتبہ فکر کے علماء بریلوی علماء سے اپنے اختلافات کو سلجھانے کی کوشش کریں۔ بے غرض ہو کر کام کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی مدد ضرور اس مشن میں ہمارے ساتھ شامل ہوگی۔

ثالثاً ــــــ پھر بریلوی مکتبہ فکر اور دیوبندی مکتب فکر کے اکابرین ایک مشترکہ نمائندہ

وفد تشکیل دیں جو عرفاً اہل حدیث مسلک کے اکابرین سے ملے۔ ان کے سامنے بھی یہی صورت واضح کرے۔ پہلے اہل حدیث مسلک کے علماء کرام خود باہمی اختلافات بھلا کر ایک قیادت پر اتفاق کریں۔ یہ اکٹھے ہونا صرف ایک بڑے مشن اور نصب العین کے لیے ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نیتوں پر اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ (آمین)

پھر بریلوی مکتبہ فکر اور دیوبندی مکتبہ فکر کے نمائندہ وفد مسلک اہل حدیث کی متفقہ قیادت سے ملیں اور ان کے سامنے یہی رکھیں کہ ملک میں سیکولر اور لادین کی بجائے اسلامی قانون کے نفاذ پر ایک قدم آگے بڑھائیں، تھوڑی قربانی دیں۔ جیسے قیامِ پاکستان کے وقت سے سیکولر نظام عدل کو قبول کر رکھا ہے اسی طرح سیکولر نظام عدل سے کہیں بہتر مسلمانوں کے چاروں مسالک کی فقہ میں سے فقہ حنفی کو ملک میں نافذ کرنے کی مہم میں ساتھ دیں۔ اس سلسلے میں آپس کے باہمی تحفظات کو تحریراً لکھا جائے اور ان کے حل کے لیے اقدامات پر اتفاق پیدا کیا جائے اور یہ کام اللہ تعالیٰ کی مدد سے ممکن ہوگا اور یقیناً پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔

اسی طرح ملک میں کئی جماعتیں کام کر رہی ہیں (مثلاً تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی، تنظیم اسلامی، تحریک اسلامی، دعوت اسلامی وغیرہ) ان جماعتوں میں سے اگر کوئی اپنے مسلک کے ساتھ ضم ہو جائے اور اس کی قیادت پر اتفاق کر لے تو فبہا، ورنہ ان کے اکابرین سے بھی اسی طرح گفتگو کی جائے اور اس سلسلے میں ایثار و قربانی اور دعاؤں اور صلوٰۃ الحاجۃ سے کام لیا جائے۔

رابعاً ـــــ یہ عناصر جمع ہو جائیں تو یہ اہل سنت حضرات کا مبارک اجتماعی اتحاد جو حقیقی بنیادوں پر صدیوں بعد چشم فلک دیکھے گی۔ اب ضرورت ہوگی اہل سنت کے اکابرین کا نمائندہ وفد یا اکابرین، شیعہ مسلک کے اکابرین سے ملیں۔ شیعہ مسلک کے اکابرین سے بھی یہی درخواست کریں کہ پہلے وہ اپنے اندر اتحاد و اتفاق پیدا کریں اور ایک قیادت پر اعتماد کی فضا پیدا کریں۔ اس کے لیے متعدد ملاقاتیں کرنا پڑیں گی اس متفقہ قیادت کے باہمی مذاکرات ہوں اپنے تحفظات سامنے رکھیں اور اپنے مسلکی معاملات کا مستقبل زیر گفتگو لائیں۔ ان مسائل کو بعد پر نہ ٹالیں بلکہ باہمی گفت و شنید سے ابھی حل کریں۔ اور اگر یہاں بھی ان سطور میں عرض کیے گئے نصب العین کے لیے اختلافات اور ذہنی تحفظات کی برف پگھل جائے اور دل قریب آ جائیں

تو یہ اُمت محمدیہ ﷺ کے لیے ایک بہت بڑا تحفہ ہوگا۔ عصر حاضر کے علماء کا ایک کارنامہ ہوگا جو یقیناً سنہری حروف میں لکھا جائے گا اور مقصد کے حصول میں مددگار رہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید بھی شامل حال ہوگی پھر منزل دور نہیں ہوگی بلکہ پاکستان کے عوام قیامِ پاکستان کے مقاصد کے حصول کی خاطر آخری مرحلے میں داخل ہوجائیں گے۔

ان سطور کے ناکارہ راقم کو یہ امید واثق ہے کہ اگر ہمت کی جائے اور بریلوی مکتب فکر کے علماء پہل کریں تو ختم نبوت ﷺ کی طرح اس مسئلہ پر بھی یہ اتفاق عین قرین قیاس ہے۔

اصولاً تو کسی مسلک کے علماء ربانیین اس کام کا بیڑا اُٹھائیں تو بھی یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے مگر بڑی جماعت اور بڑا مکتب فکر اس مشن کو آگے بڑھائے تو منزل قریب ہوسکتی ہے۔

ہم یہاں بریلوی مکتب فکر میں کسی قدر آور شخصیت کا نام تجویز کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کہ وہ یہ کام کریں اور نہ یہ ہمارا مقام ہے تاہم جو ہمت ور شخصیت یہ بازی کھیل جائے وہ یقیناً بہت بڑا انسان ہوگا اور دنیا اس کی عظمت کو تسلیم کرے گی اللہ تعالیٰ بھی اس پر مہربان ہوگا۔ کوشش کرنے میں مضائقہ نہیں، کامیابی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ہر رہنما یہ کوشش کرے اور اپنے حصے کا کام کرے تو قطرہ قطرہ دریا ہوسکتا ہے۔ فیض شاعر نے کسی ایسے ہی نیک مقصد کے پیش نظر کہا ہے

؎ یہ بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنے، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

پھر یہ کام ضروری نہیں کہ پہلے ہی مرحلے اور پہلی کوشش میں نتیجہ خیز ہوجائے یہ کام تو ایسا کام ہے کہ کوشش جاری رکھیں (اللہ نہ کرے 950 سال بھی لگ جائیں تو نقصان کا سودا نہیں ہے)۔

اس سلسلے میں یہ درخواست یا مشورہ مجھ جیسے انسان کو زیب نہیں دیتا مگر مصطفوی ﷺ مشن اور مصالح امت کے پیش نظر یہ ایثار بھی کام آجائے تو زہے نصیب۔ اکابرین ایک دوسرے کو منانے کے لیے اگر اس مشن میں اپنی ٹوپی اور عمامہ دوسرے کے قدموں میں ڈال کر بات منوا سکیں تو ضرور منوائیں۔ اپنے آقا حضرت محمد ﷺ کا یہ قول مبارک پیش نظر رہے

مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ (مشکوٰۃ)

''جو شخص اللہ کے لیے تواضع اختیار کرے گا اللہ اس کو رفعت عطا فرمائے گا''۔

یہ پہلا مرحلہ عوامی اور غیر سرکاری سطح پر حل ہو جائے تو اب اجتماعی اور سرکاری سطح پر کرنے کے کئی مراحل ہیں جو آگے آ رہے ہیں۔

ہماری ناقص رائے میں درج ذیل ممکنہ اقدامات اور بڑے فیصلے حکومتی اور عوامی سطح پر کیے جائیں تو ہمارے ملک عزیز میں اسلام کے نفاذ کی راہ ہموار ہو سکتی ہے نیز ان اقدامات کے فیصلے اور ان فیصلوں کو عوام کی آواز بنانے کے لیے میڈیا پر ان کی نہ صرف تشہیر کی جائے بلکہ ریڈیو، ٹی وی، انٹرنیٹ پر ایسے پروگرام پرائم ٹائم میں دیے جائیں جس سے قومی وملّی جذبہ بیدار ہو اور ملک میں اسلام کے نفاذ کی ایک پیاس، طلب اور تحریک پیدا ہو، تاکہ عوامی دباؤ کے تحت ہی سہی حکمران اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لانے پر آمادہ ہو جائیں۔

5 چند ترتیب وار اقدامات

(ا) 1۔ ملک کے مقتدر 31 علماء کے 22 نکات کی متفقہ دستاویز کو مدنظر رکھتے ہوئے ملک میں نفاذ اسلام کے لیے ایک ریفرنڈم کرایا جائے کہ:

''کیا آپ علامہ محمد اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح کے بنائے ہوئے پاکستان میں اسلام کے نفاذ کے حق میں ہیں؟ جواب ہاں کی صورت میں ہو تو 31 علماء کی نمائندگی کی بنیاد پر ہر مسلک کے متناسب نمائندگی کے اصول پر 155 علماء کرام اور وکلاء کی ایک مجلس قانون ساز تشکیل پائے گی۔ یہ قانون ساز مجلس صرف نفاذ اسلام کے بارے میں تنفیذ کے لیے معینہ بنیادی فیصلے کرے گی اور اس کی مدت صرف 3 سال ہو گی جو قومی سطح پر ریفرنڈم ہی سے بڑھائی جا سکے گی۔

2۔ اس مدت (3 سال یا زیادہ) میں عوام میں یہ شوق پیدا کیا جائے اور اس کی تشہیر کی جائے کہ دینی مدارس کے کامیاب طلباء LLB کریں اور وکلاء LLB کے بعد حقیقی طور پر داخلہ لے کر درس نظامی کریں تاکہ اسلامی تعلیمات کی اہمیت اور عصر حاضر کے تقاضوں اور علمی وراثت کا امتزاج سامنے آ سکے۔

3۔ طے کر دیا جائے کہ آئندہ سینٹ، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے ممبران بننے کے صرف ایسے ہی لوگ اہل ہوں گے جو دینی مدارس کا درسِ نظامی اور LLB کی VALID سندات

کے حامل ہوں گے۔ لوکل گورنمنٹ میں بھی ہر سطح پر چیئرمین صرف قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کی اہلیت والا ہی بن سکے گا۔

4۔ ریفرنڈم کے نتیجے میں 3 سال کے لیے جو اسلامی قومی شوریٰ بنے وہ اصولی طور پر سیاسی سطح، معاشی سطح اور سماجی سطح پر بنیادی فیصلے کرے تاکہ وہ فیصلے آئندہ اسمبلیوں کے لیے رہنما ثابت ہوں اصولی طور پر یہ طے کیا جائے کہ ملکی سطح پر قانون (PUBLIC LAW) ایک ہی ہوگا جو سب مسالک کے لیے ہوگا۔ عائلی معاملات میں نکاح نامہ میں فریقین کا مسلک درج کیا جائے اور طے کردیا جائے کہ اس نکاح کے فیصلے کس مسلک کے مطابق ہوں گے۔

ریفرنڈم کے ذریعے بننے والی اسلامی قومی شوریٰ ملکی نظامِ تعلیم کے اہداف مقاصد طریق تعلیم اور نصاب کو یکسر بدل کر اسلامی اور نظریاتی بنانے کے فیصلے کرے اور وہ فوری طور پر نافذ العمل ہوں۔

ب۔ اوپر حصہ (الف) میں جو اقدامات تجویز کئے گئے ہیں اگر اس طرح کے اقدامات ممکن نہ ہوں تو متبادل صورت مندرجہ ذیل اقدامات ناگزیر ہوں گے۔

- بیسیویں صدی کے آغاز سے ہی دنیا جمہوریت کی طرف جا رہی ہے اور قیامِ پاکستان میں جمہوری زبان میں ہی ریفرنڈم کے ذریعے مسلمانوں کی تعداد (آبادی) کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا اور پاکستان میں گذشتہ 73 سالوں سے جمہوری نظام ہی جاری وساری ہے وفاق، صوبے اور لوکل باڈیز سب جمہوریت ہی کے مرہونِ منّت ہیں۔
- اگر مسلمانانِ پاکستان جمہوری اقدار کی پاسداری کریں تو تمام مسالک کے علماء بیٹھ کر طے کرلیں اور باہمی افہام وتفہیم کے ساتھ مندرجہ ذیل اقدامات پر اتفاق رائے پیدا کرلیں۔

1۔ ملکی وفاقی سطح کے تمام قوانین اکثریتی فقہ (75% سے زیادہ ملکی آبادی) کے مطابق ہوں گے۔ دوسرے مسالک کے لوگ عائلی قوانین اور دیگر نجی معاملات میں اپنی اپنی فقہ کے مطابق کرنے میں آزاد ہوں گے (جیسے برادر ملک ایران میں ملکی قانون اکثریتی مسلک کے مطابق ہے) جس کا فیصلہ ملکی قانون کے تحت ہی ہوگا اور فیملی لاز وغیرہ کے بارے میں مخصوص عدالتیں قائم کی جائیں گی۔

2۔ یہ بات پہلے سے ہی طے کر دی جائے کہ ملکی قانون کو قرآن وسنت کے مطابق بنانے کے لیے سپریم کورٹ لیول پر ایک عدالتی بینچ بنے گا جس کے ججوں کا معیار طے ہو پھر طریق کار طے کر لیا جائے کہ کسی قانون کے بارے میں قرآن وحدیث کے دلائل ہوں تو اس طریق کار کے مطابق خصوصی عدالتی بینچ میں اس کو چیلنج کیا جائے اور علماء کرام کی فنی وفقہی بحثوں کے بعد اگر طے ہو جائے کہ موجودہ قانون قرآن وحدیث سے متصادم ہے تو اسمبلی اس کے مسودہ کو جلدی سے جلدی قانونی شکل دینے کی پابند ہوگی کہ طے شدہ مدت میں اس قانون کو پاس کرے اس طرح 5-10 سال کے عرصے میں علماء کے 22 نکات کے منشا کے عین مطابق ہو سکتے ہیں (برعکس موجودہ صورت حال کے 1951ء کے 22 نکات میں سے اب تک 69 سال میں کوئی ایک قانون بھی قرآن وسنت کے مطابق نہیں کیا جا سکا)۔ اگر علماء ذرا دل بڑا کریں انگریز (سیکولر اور لادین) قانون بمقابلہ شریعت اسلامی کی برکات کو سامنے رکھیں تو بات آسان اور قابل عمل ہے ورنہ موجودہ طریقہ سے یہ انگریزی قانون مزید ایک صدی میں بھی اسلامی شریعت کے مطابق نہیں بن سکتا۔

دسواں باب

عالمی حالات
ـــــ پاکستان کا مستقبل
اور مسلکی قیادتوں کا امتحان

عالمی حالات ـــــ پاکستان کا مستقبل
اور مسلکی قیادتوں کا امتحان

374

عالمی حالات ــــ پاکستان کا مستقبل اور مسلکی قیادتوں کا امتحان

● قیامِ پاکستان کے پون صدی بعد تاریخ کا بہاؤ عالمی حالات کو کدھر لے کر جا رہا ہے وہ اہل نظر مسلمانوں کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس وقت عالمی صہیونی استعمار گزشتہ چھ صدیوں کے درجہ بدرجہ عروج کے بعد 'موت وحیات' کی کشمکش سے دوچار ہے۔ عالمی استعمار کی گلوبل حیثیت، دنیا بھر میں مختلف ممالک میں جنگیں اور تصادم، مختلف نظریات سے نظریاتی جنگیں، کمزور اقوام کو صرف دبانا ہی نہیں، موت کے گھاٹ اتار دینا، اپنی بقا کو عالمی سطح پر نمبر 1 پوزیشن پر برقرار رہنے کے لیے سیاہ کو سفید ظاہر کرنا اور سفید کو سیاہ قرار دینا اس غالب وقاہر مغربی استعمار اور اس کی تہذیب کے درندوں کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

● گزشتہ صدی میں دو عالمی جنگیں اسی استعمار کی خود طے کردہ پالیسی کے نتیجے میں شروع ہو کر اور دائیں بائیں ہچکولے کھا کر ختم ہوئیں، بظاہر امن کا زمانہ آ گیا۔ ان دونوں جنگوں کے دونوں فریق ایک بڑے ذہن کے عیار و چالاک ارادوں اور منصوبوں کی غمازی کرتے تھے۔ جنگ کا بگل بجا کر ـــ افراتفری پیدا کر کے راستے پر مٹی اڑا کر کمزور اقوام کے لیے حالات دگرگوں کر کے ـــ اپنا مطلب نکال لے جانا یا اپنا اُلو سیدھا کر لینا نتیجتاً جس کو پیچھے دھکیلنا تھا اس کو پیچھے کر دیا جس کو آگے لانا تھا اس کو وکٹری سٹینڈ (VICTORY STAND) پر لا کھڑا کیا۔ جو ہم خیال اور مفید طلب مہرہ تھا وہ کامیاب جو ناپسندیدہ تھا وہ غائب وخائب وخاسر۔

یہ نتیجہ ہے پہلی جنگ عظیم 1914ء-1918ء اور دوسری جنگ عظیم 1939ء-1945ء تک کی جنگوں کا۔اس دوسری جنگی افراتفری کے نتیجے میں مغرب کو ایک طرح حتمی عروج ملا اور کل روئے ارضی پر آہستہ آہستہ اس کے سیکولر و لبرل افکار پھیل گئے UNO کے نام سے اس نے پانچ طاقتیں دنیا کی قسمت کے فیصلوں کے لیے مستقل ارکان کے طور پر فرعون بنا کر بٹھادیں۔عالمی دربار کے یہ بت تھے جس کے پس پشت صہیونی ذہن بے شمار ترقی بذیر ممالک کی قیادتوں کو شطرنج کے مہروں کی طرح آگے پیچھے کر کے چالیں چل رہا تھا۔

- دوسری جنگ عظیم خاص طور پر مسلمانوں کو عالمی سطح پر پیچھے دھکیلنے کا عمل تھا مزید برآں اس مقصد کے لیے مغرب نے کوشش کر کے مسلمان ملکوں میں ابلیسی قیادتوں کی سرپرستی کی جو مغرب کے مفاد میں دیا گیا ایجنڈہ کو اپنے الیکشن کا منشور بنائیں اور اس کو پورا کریں۔ترقی کے نام پر UNO کے دیے گئے امکانات اور تجویز کردہ اصلاحات کو بروئے کار لائیں جب تک مسلمان ملک کے حکمران مغربی ایجنڈا آگے بڑھاتے نظر آتے تھے وہ کامیاب ہیں حالات پر امن ہیں معیشت ٹھیک ہے کرنسی ریٹ بھی ٹھیک ہے جیسے ہی کسی عوامی دباؤ یا کسی حکمران کی مذہبی اور اسلامی حس جاگتی نظر آئی بس آناً فاناً حالات پلٹا کھا گئے اپوزیشن سڑکوں پر آ گئی پڑوسی ممالک نے فوج سرحدوں پر پہنچا دی مغربی امداد روک دی گئی فوجی امداد بند ہوگئی ملٹری اور سول معاملات میں ضروری اشیاء کی فراہمی منقطع۔لہٰذا حکمران سے استعفیٰ دلوایا یا جلاوطن کر دیا یا مروا کر ـــــ نئے الیکشن ـــــ نیا دور ـــــ نیا زمانہ ـــــ ترقی کا سورج طلوع ہونے کی نوید کے ساتھ نئے غدار ابن غدار مہرے ملکی انتظام وانصرام پر لگا دیے گئے۔

- موجودہ عالمی منظرنامے میں مغرب کو اپنی بقا کی فکر دامن گیر ہے۔صہیونی مافیا نے زمینی وسائل کا قدرتی توازن بگاڑ دیا ہے۔اب دنیا کا امیر ترین طبقہ اس دنیا کے مستقبل سے ناامید ہے بلکہ موسمیاتی، ماحولیاتی اور خام مال کی عدم دستیابی پر مایوسی کا شکار ہے۔

- ایسے ماحول میں صہیونی استعمار کے اعلیٰ دماغ خود بھی اور اپنے ساتھ دنیا کی امیر ترین اشرافیہ کی رقم لوٹنے کے لیے چاند اور مریخ پر بستیاں بسانے کی تیاری کر کے ایڈوانس بکنگ کے نام پر ڈالر کے بہاؤ کا رخ اپنی طرف کر لیا ہے تاکہ دنیا کی تباہی کی صورت میں وہ خود ضرور بچ جائیں

(اگرچہ ایسا ہوگا نہیں)۔ قانون قدرت اور آسمانی بادشاہ مداخلت کر کے ایسے حالات پیدا کر دے گا کہ نہ مغربی بالادست حکومتیں بچیں گی، نہ صہیونی مافیا بچے گا، نہ اس کے حمایتی بچیں گے، نہ اس کے گن گانے والے بچیں گے۔ نہ مغرب کی بالادستی کے دور میں اس سے مفاد اٹھانے والے بچیں گے رہے نام اللہ کا۔ غریب ممالک شاید بچ جائیں۔ کچھ مسلمان ممالک بھی شاید بچ جائیں۔

- مسلمان ممالک اس لیے بچیں گے کہ ابھی دنیا میں اسلام ایک زندہ قوت کے طور پر ابھرے گا۔ دنیا اس تیسری عالمی جنگ سے نکلے گی تو ایک روحانی تعمیر نو ہوگی اسلام کا عالمی دور ہوگا اسلام کی تعلیمات اور حضرت محمد ﷺ کی رحمتہ للعالمینی کی برکات کی فراوانی کا دور ہوگا۔ ہر انسان آسودگی محسوس کرے گا اور نیکی بھلائی خداترستی، روحانیت کی طرف لپکے گا۔ برائی کو بہت دور دھکیل دیا جائے گا برائی کے مواقع خلافت راشدہ کے دور مبارک کی طرح بہت کم رہ جائیں گے۔

ان حالات میں مسلکی وگروہی مفاد کے بجائے اسلامی امکانات اور اخوت کو مدنظر رکھیں۔ عالمی حالات کو مدنظر رکھیں ہمیں آپس میں لڑانے کے مغربی منصوبوں کو مدنظر رکھیں اور دشمنوں کو ہماری صفوں میں گھس کر فساد برپا کرنے یا باہمی خانہ جنگی کا موقع نہ دیں۔

- اس ضمن میں سب سے بڑھ کر یہ بات پیش نظر رکھیں ہمیں اسلام کی خاطر اور ملک پاکستان میں اسلامی نظام اور شریعت کے نفاذ کی خاطر قربانی دینی ہے جس سے ہماری دنیا اور آخرت دونوں کا بھلا ہوگا اگر ہمارے مناسب طرز عمل سے باہمی یگانگت اور CO-EXISTANCE کا جذبہ پیدا ہوجائے اور ملک خداداد میں اسلامی احکامات اور شریعت آجائے تو ہماری ان کوششوں سے دنیا میں امن وسکون ہوگا اور آخرت میں جو درجہ ملے گا وہ اللہ کا انعام ہوگا اور بہت بڑا انعام اور دائمی بدلہ ہوگا۔

- ایک فرمان میں جناب رسالت مآب ﷺ نے فرمایا:

لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَیُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا (ترمذی، عن انسؓ)

''وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے''۔

یہ فرمانِ رسالت اگرچہ گھریلو ماحول میں فیملی و برادری کے اصاغر واکابر کی بات ہے

تاہم یہی فرمان رسالت کلیتہً صادق آتا ہے آج کے پاکستان کے ماحول میں تمام مسلک کے علماء اور اکابرین پر۔ چھوٹے مسلک کے لوگ تعداد میں کم سہی (مرتبے میں کسی کا مقام ہے وہ قیامت کے دن انفرادی ہوگا) بڑے مسلک کے لوگوں کو عزت دیں کہ یہ تعدا میں زیادہ ہیں۔ اور بڑے مسلک کے لوگ تعداد میں چھوٹے مسلک کے لوگوں سے نرمی وشفقت اور دل کی کشادگی کا مظاہر کریں رویے ظاہر کریں کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ باہمی احترام اور محبت وشفقت کا رشتہ رکھتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ عوامی سطح پر بھی اس بات کے اثرات پھیل جائیں اور امت مسلمہ ایک امت اور برادری کے طور پر دنیا میں دوبارہ عزت نہ پا جائے۔

آنے والے حالات کے پیش نظر کہ دنیا کدھر جا رہی ہے اور عالمی سطح پر حالات جس جنگ کی طرف جا رہے ہیں اس جنگ کے مناظر کیا ہوں گے اور اس جنگ کی تباہی کتنی ہوگی ہمیں اسلام کی خاطر، امت مسلمہ کی خاطر اور ملک کی خاطر یہ ایثار و قربانی دکھانی ہوگی کہ ہمارے ملک میں اسلامی قانون آجائے اور اس موجودہ مغربی قانون کی نحوست سے نجات مل سکے۔ اس نیک کام میں ہم میں سے جس کا جتنا حصہ (CONTRIBUTION) ہوگا وہ اللہ کے ہاں اتنا ہی مقام پایا جائے گا۔ دنیا میں آئندہ عالمی جنگ میں مشرق وسطیٰ اس کا مرکز ہوگا۔ عرب علاقہ اس کی زد میں ہوگا۔ اس کے ملحقہ مشرقی ومغربی وشمالی علاقہ جات بھی کسی حد تک یقیناً متاثر ہوں گے۔

کافروں اور یہود اور ان کے حواریوں کے لیے تو یہ صورت حال یقیناً عذاب ہوگی لیکن عربوں کے لیے بھی یہ عذاب ہی کی ایک شکل ہوگی۔ عربوں کے لیے عذاب کی شکل اس لیے کہ گذشتہ ایک صدی میں جزیرہ نمائے عرب اور مشرقِ وسطیٰ وشمالی افریقہ میں عربوں کو اللہ نے اتنی عزت دی ہے اتنا پیسہ دیا ہے کہ ان سے سنبھالنا مشکل ہے دنیا میں عزت ہے وقار ہے آسودگی ہے مگر نہیں ہے تو صرف قرآن مجید کا مادری زبان میں ہونے کے باوجود اس کا پڑھنا، عمل کرنا بھی مفقود ہے حکومتی وریاستی سطح پر اسلام کے احکام کی پیروی یا اسلام کا غلبہ مائیکروسکوپ کے ساتھ بھی نظر نہیں آسکتا۔ لہٰذا عصر حاضر میں عرب اقوام اللہ کے عذاب کا شکار ہیں اور دن بدن عذاب کا گھیرا ان عرب اقوام کے گرد تنگ ہوتا نظر آرہا ہے۔ حالات حاضرہ کے جاننے سے بھی اور قرآن و حدیث کے مطالعہ سے بھی ایک عذاب اس وقت امت مسلمہ کو گھیر رہا ہے۔

امت مسلمہ کے حالت عذاب میں ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تم FATF کے معیار پر ابھی تک پوری کیوں اترے اور IMF کے قرضوں کی شرائط پوری کیوں نہیں کر رہے۔ بھارت سے مذاکرات کیوں شروع نہیں ہو رہے بلکہ عذاب کی وجہ یہ ہے کہ تم نے مسلمان ہوتے ہوئے اور وسائل ہوتے ہوئے جان بوجھ کر اسلام کے احکام سے گریز کیا اور آسمان مغرب سے اتری ہر بات کو (چاہے قرآن کے احکامات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو) ماننا اپنے آپ پر فرض سمجھا اور مغرب کی تابعداری میں چوکس و بیدار رہے جبکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری تم پر بہت گراں تھی کہ کبھی عمل کا ارادہ ہی نہیں کیا۔ ترمذی شریف کی حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ: مِنِ اقْتِرَابِ السَّاعَةِ هَلَاكُ الْعَرَبِ یعنی قربِ قیامت میں (ایسے حالات پیدا ہوں گے کہ) سارے عرب ہلاک کر دیے جائیں گے۔

یہ بات ہم بڑے دکھ کے ساتھ اور نہ چاہتے ہوئے بھی لکھ رہے ہیں کہ عربوں کے عالم عرب کے بعد ''مسلمانانِ پاکستان'' جو اپنے ملک کو ملک خداداد پاکستان کہتے تھے اور اقبال و قائداعظم کو رہنما مانتے ہیں مگر اس ملک میں مجوّزِ پاکستان کی تعلیمات ہیں کہاں۔ مغربی تعلیمات تہذیب اور کلچر سے تمہیں عشق مگر اسلامی تعلیمات، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور علامہ اقبال سے محبت کے دعوے سراسر دھوکا ـــــ یہ باتیں ہم مسلمانوں کے قول عمل کے تضاد کی چغلی کھاتی ہیں ہمارا ذہنی سفر کسی اور جانب ہے مگر دعویٰ یہ ہے کہ ہم ریاست مدینہ بنانے جا رہے ہیں۔

عالم اسلام میں عربوں کے بعد مسلمانانِ پاکستان اللہ کے مجرم ہیں اور عذاب میں گرفتار ہیں عربوں پر اور طرح کا عذاب ہیں ہم قرضوں کی معیشت کے ذریعے عصر حاضر کے فرعون و قارون وہامان کے چنگل میں غلامی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ مغرب (صہیونی استعمار کے نمائندے امریکہ اور UNO کی یہی خواہش ہے کہ ہم قرضوں کے دباؤ تلے ہی دم گھٹ کر مر جائیں۔

پاکستان پر عذاب کوڑا ابھی سب کے لیے برابر نہیں ہے۔ پاکستان کے لیے دہلی اور اس کے قرب و جوار سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین اس بات کے مجرم نمبر ایک ہیں کہ جس کام کے لیے انہوں نے اور ان کے آباء واجداد نے ہجرت کی تھی وہ کام پون صدی بعد بھی نہیں ہوا یہی مہاجرین ہیں جنہوں نے خود جوانی میں یا ان کے باپ دادا نے پاکستان کے حق میں نعرے

لگائے تھے۔ پاکستان کا مطلب کیا ؟ لا الہ الا اللہ ۔اور اس کے لیے ہجرت کی جانی قربانیاں دیں۔جنہوں نے قربانیاں دیں وہ اپنا اجر اللہ کے ہاں پا چکے اور جنہوں نے اس مقصد جلیلہ کو بھلا کر دنیا بنائی، پلازے بنائے کارخانے بنائے جائیدادیں بنائیں وہ اللہ کے ہاں جوابدہ ہوں گے اور آج اللہ کے عذاب کی گرفت میں بھی ہیں۔

پاکستان کے عوام میں مہاجرین کے بعد مقامی حضرات بھی دوسرے درجے میں مجرم ہیں اگر ’مہاجرین بھائی‘ یہ کام نہیں کر رہے تو انصار (مقامی) کو کرنا چاہیے اور اس کام کا جذبہ ہی نہیں کہ پاکستان میں اسلام غالب ہونا چاہیے، اللہ کے دین کا قانون نافذ ہونا چاہیے،سود ختم ہونا چاہیے،عریانی فحاشی فلمی صنعت کے حیا سوز مناظر اور اس کے کردار امریکہ سے زیادہ برے مناظر یہاں پیش کر رہے ہیں۔اللہ کی نافرمانی اور بے حیائی کے میدان میں پاکستان کے مردوزن میں مقابلہ ہے کہ کون کتنا بے غیرت ہے اور کون کتنا بے شرم ہے کہ ہم اس میدان میں پیچھے نہ رہ جائیں۔

یہاں پہنچ کر مہاجرین اور مقامی حضرات کا فرق ختم ہو جاتا ہے اور اس حمام میں سب ننگے بن جاتے ہیں۔ دیہاتوں میں شاید بے حیائی کا تناسب اربن (شہری) علاقوں سے کم ہو مگر مجموعی طور پر پاکستان کا معاشرہ اس لحاظ سے انتہائی مکروہ منظر پیش کر رہا ہے حکمران اور میڈیا اور امریکی امداد (اور یورپی امداد) سے چلنے والی NGO's بے لگام آگے دوڑ رہی ہیں اور عورت مارچ کی مکروہ شکل میں جو منظر 8 مارچ کو پاکستان میں دکھائے گئے تو کرونا کا عذاب آ گیا۔اب ذرا کرونا میں کمی آئی ہے اور دوبارہ بے حیائی کی سرگرمیاں بحال ہوئی ہیں تو ملک بھر کے مردو خواتین فلمی ستارے،گلوکار ڈرامہ نگار کیا گل کھلائیں گے؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

ملک میں اجتماعی توبہ کی کوئی آواز نہ اٹھی تو ملک عزیز میں اللہ کے عذاب کو کرکٹ سٹار انڈین فلمی صنعت کے فنکار و گلوکار نہیں ٹال سکتے۔ ہمارے ملک کے وزیر اعظم ماشاء اللہ بڑے ہمدردانہ لہجے میں کرکٹ کی سرگرمیاں شروع ہونے پر اللہ کا شکر ادا کرتے نظر آتے ہیں فلمی صنعت، ڈرامہ کی صنعت، شادی ہالوں کی رونقوں کی بحالی پر بھی اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر مساجد کی سرگرمیوں کی بحالی کس حد تک ہوئی اس کا ذکرِ خیر ان کی زبان پر کبھی نہیں

آیا۔لگتا ہے کہ وہ عالمی کرونا امداد دینے والے اداروں کو یہ تاثر دے رہے ہیں کہ الحمداللہ مساجد اور مدارس کی سرگرمیاں بند ہیں ہماری امداد بڑھائی جائے۔ واقفانِ کار جانتے ہیں حالیہ کرونا کی آڑ میں دینی مدارس اور اسلامی اوقاف پر ایٹم بم سے بھی بڑا بم گرا دیا گیا ہے کہ جس اوقاف کے منتظم اس اوقاف کی رقم کی تفصیلات (کہ یہ وقف کیسے بنا ہے اور رقوم دینے والے نام پتہ ایڈریس، کاروبار ٹیکس نمبر نہیں دیں گے وہ وقف حکومت ضبط کر لے گی اور منتظم کو کروڑوں روپے جرمانہ کیا جائے گا۔ یہ آج کی ریاست مدینہ کا نقشہ ہے اور اوپر جو مضمون آ رہا ہے یہ اسی عذاب کا ایک رخ ہے کہ مسلمانانِ پاکستان کے لیے اللہ تعالیٰ اس مغربی عذاب FATF کی شرائط کے تحت قرضوں اور معیشت کا عذاب بھیج رہا ہے۔ الامان الحفیظ۔

● پاکستان کے قیام کے مقاصد پورے نہ ہونے پر اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب آ گیا تو موجودہ نسل شاید اس کو دیکھ کر توبہ کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو بلکہ آئندہ نسل مغرب کے نمائندوں (فلمی ستاروں اور کرکٹ سٹارز) کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیں گے پاکستان کے اسلامی نظریہ، فکر اقبال اور اسلام کے قانون کے نفاذ کے فقدان کو دیکھ کر عذاب ہی کا خطرہ ہے جس کے لیے یہ خصوصی اشاعت سامنے لائی جا رہی ہے کہ اربابِ حل وعقد سوچیں علماء کرام غور فرمائیں مسالک کے نمائندے سوچیں کہ ہم ذاتی انا اور مسلکی انا کی آڑ میں مغربی استعمار کے کالے رومی منحوس قانون مجریہ 1860ء کے تحت سانس لے رہے ہیں اور خوش ہیں۔ یہ منحوس برطانوی عدالتی قوانین غیر ملکی آقاؤں کی کرکٹ کی طرح کی ایک یادگار ہے جس کو 73 سال سے ملک میں مسلکی اَنا کی خاطر ہم 'قبول' کیے بیٹھے ہیں جس سے جتنی جلدی ہو سکے جان چھڑانے کی ضرورت ہے۔ بقول شاعر:

باطل کے اقتدار میں تقویٰ کی آرزو
کتنا حسین فریب ہے جو کھا رہے ہیں ہم

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق، اپنا شعار اب بھی
چمن میں آ سکتی ہے پلٹ کر، چمن سے روٹھی بہار اب بھی

ضمیمہ جات

1. قانونِ اسلامی کے مستقل مآخذ (ڈایاگرام)
2. 31 علماء کرام کے متفقہ 22 نکات
3. کلامِ اقبال

قانونِ اِسلامی کے مستقل مآخذ

1

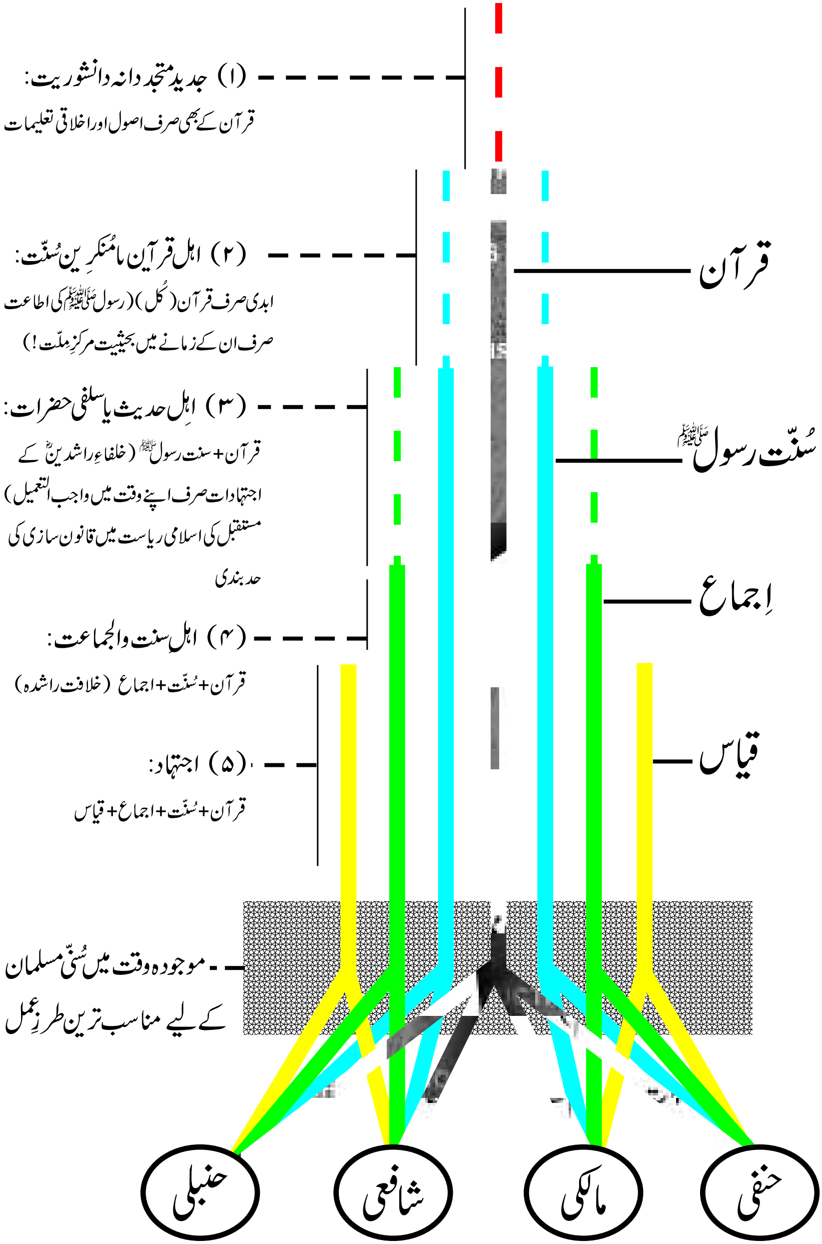

2

31 علماء کرام کے
متفقہ 22 نکات

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را — گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را!!

پاکستان میں

اسلامی ریاست — یا — نظامِ خلافت

کے قیام کے لئے عملی پیش رفت ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو

قراردادِ مقاصد

کی منظوری کے ذریعے ہوئی ——— اور اگلے ہی سال یعنی ۱۹۵۰ء میں

دوسرا عظیم معجزہ

رونما ہو گیا یعنی تمام فرقوں اور مسلکوں کے ۳۱ سربرآوردہ علماء کا

ملکی دستور کے بائیس بنیادی اصولوں پر کامل اتفاق ہو گیا۔

اس کے بعد سے اب تک جو کچھ ہوا وہ ایک تلخ داستان ہے جس کے دہرانے سے کچھ حاصل نہیں ——— اب حالیہ ملکی انتخابات کے بعد پاکستان کی بانی جماعت مسلم لیگ کو جو نئی زندگی ملی ہے' سب کو مل جل کر کوشش کرنی چاہئے کہ اس سے پھر "ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا!" والی کیفیت پیدا ہو جائے۔

دستور اسلامی کے بائیس متفق علیہ نکات اور ان پر دستخط کرنے والے اکتیس علماء کرام' رحمہم اللہ وجزاہم اللہ عن جمیع المسلمین احسن الجزاء کے اسماء گرامی اس دو ورقے کی صورت میں "تحریک خلافت پاکستان" کی جانب سے پیش خدمت ہیں!

۲۲ نکات کا مکمل متن درج ذیل ہے

۱۔ اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العزت ہے۔

۲۔ ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہو گا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے گا، نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جائے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

۳۔ یہ ملک کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ ان اصول و مقاصد پر مبنی ہو گا جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطہ حیات ہے۔

۴۔ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہو گا کہ قرآن و سنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے، منکرات کو مٹائے اور شعائر اسلامی کے احیاء و اعلاء اور مسلمہ اسلامی فرقوں کو ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری تعلیم کا انتظام کرے۔

۵۔ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہو گا کہ وہ مسلمانان عالم کے رشتہ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کرے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیت جاہلیہ کی بنیاد پر نسلی، لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملت اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔

۶۔ مملکت بلا امتیاز مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہوگی جو اکتساب رزق کے قابل نہ ہوں یا نہ رہے ہوں، یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعی اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

۷۔ باشندگان ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعت اسلامیہ نے ان کو عطا کیے ہیں۔ یعنی حدود قانون کے اندر تحفظ جان و مال و آبرو، آزادی مذہب و مسلک، آزادی عبادت، آزادی ذات، آزادی اظہار رائے، آزادی نقل و حرکت، آزادی اجتماع، آزادی اکتساب رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی اداروں سے استفادے کا حق۔

۸۔ مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کے سند جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمی موقع صفائی و فیصلہ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

۹۔ مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ ان ہی کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

۱۰۔ غیر مسلم باشندگان مملکت کو حدود قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی

تعلیم کی پوری آزادی ہوگی اور انہیں اپنے شخصی معاملات کے فیصلے اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

۱۱۔ غیر مسلم باشندگانِ مملکت سے حدود شریعت کے اندر جو معاہدات کیے گئے ہوں ان کی پابندی لازمی ہوگی اور جن حقوق شہری کا ذکر دفعہ نمبر ۷ میں کیا گیا ان میں غیر مسلم باشندگانِ ملک اور مسلم باشندگانِ ملک برابر کے شریک ہوں گے۔

۱۲۔ رئیس مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدین، صلاحیت اور اصابت رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔

۱۳۔ رئیس مملکت ہی نظم مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جزو کسی فرد یا کسی جماعت کو تفویض کر سکتا ہے۔

۱۴۔ رئیس مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی یعنی وہ ارکان حکومت اور منتخب نمائندگانِ جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔

۱۵۔ رئیس مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ دستور کو کلاً یا جزواً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

۱۶۔ جو جماعت رئیس مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہی کثرت رائے سے اسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

۱۷۔ رئیس مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔

۱۸۔ ارکان و عمال حکومت اور شہری کے لئے ایک ہی قانون و ضابطہ ہوگا اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گی۔

۱۹۔ محکمہ عدلیہ، محکمہ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

۲۰۔ ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی جو مملکت اسلامی کے اساسی اصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

۲۱۔ ملک کے مختلف ولایات و اقطاع مملکت واحدہ کے اجزاء انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی، لسانی یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں بلکہ انتظامی علاقوں کی ہوگی، جنہیں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مرکزی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا مگر انہیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔

دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

اس بائیس نکاتی دستاویز کو اتفاق رائے سے تیار کرنے والے علماء کرام جو مختلف فقہی مکاتب سے تعلق رکھتے ہیں کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔ مولانا سید سلیمان ندوی	۲۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
۳۔ مولانا بدر عالم	۴۔ مولانا احتشام الحق تھانوی
۵۔ مولانا شمس الحق افغانی	۶۔ مولانا عبدالحامد بدایونی
۷۔ مولانا مفتی محمد شفیع	۸۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی
۹۔ مولانا خیر محمد	۱۰۔ مولانا مفتی محمد حسن
۱۱۔ پیر محمد امین الحسنات	۱۲۔ مولانا محمد یوسف بنوری
۱۳۔ حاجی محمد امین	۱۴۔ مولانا عبدالصمد سربازی
۱۵۔ مولانا اطہر علی	۱۶۔ مولانا حبیب الرحمن
۱۷۔ علامہ راغب احسن	۱۸۔ پیر ابو جعفر محمد صالح
۱۹۔ مولانا محمد علی جالندھری	۲۰۔ علامہ داؤد غزنوی
۲۱۔ علامہ جعفر حسین مجتہد	۲۲۔ علامہ کفایت حسین مجتہد
۲۳۔ مولانا محمد اسماعیل	۲۴۔ مولانا حبیب اللہ
۲۵۔ مولانا احمد علی	۲۶۔ مولانا محمد صادق
۲۷۔ مولانا عبدالحق	۲۸۔ مولانا شمس الحق فرید پوری
۲۹۔ مولانا مفتی صاحب داد	۳۰۔ مولانا ظفر احمد انصاری

۳۱۔ پیر ہاشم جان سرہندی

شائع کردہ

تحریک خلافت پاکستان

۲۔ حکومتِ الٰہی

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام
نے غلام او را نہ او کس را غلام

بندۂ حق مردِ آزاد است و بس
ملک و آئینش خداداد است و بس

رسم و راہ و دین و آئینش ز حق
زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر

وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ
در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف
وصل و فصلش لَا یُرَاعِیْ لَا یَخَاف

غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود
زور ور بر ناتواں قاہر شود

زیرِ گردوں آمری از قاہری است
آمری از مَا سِوَی اللہ کافری است

قاہرِ آمر کہ باشد پختہ کار
از قوانیں گردِ خود بندد حصار

جُرّۂ شاہیں تیز چنگ و زود گیر!
صعوہ را در کارہا گیرد مشیر

قاہری را شرع و دستورے دہد
بے بصیرت سرمہ با کورے دہد!

حاصلِ آئین و دستورِ ملوک
دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک!

وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ
مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ!

حقہ بازاں چوں سپہرِ گرد گرد
از امم بر تختۂ خود چید نرد!

شاطراں ایں گنج ور آں رنج بر
ہر زماں اندر کمینِ یک دگر

فاش باید گفت سرِّ دلبراں
ما متاع و ایں ہمہ سوداگراں!

دیدہ ہا بے نم ز حبِّ سیم و زر
مادراں را بارِ دوش آمد پسر

وائے بر قومے کہ از بیمِ ثمر
می برد نم را ز اندامِ شجر!

تا نیارد زخمہ از تارش سرود
می کشد نا زادہ را اندر وجود!

گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ
من بجز عبرت نگیرم از فرنگ!

اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو
دامنِ قرآں بگیر آزاد شو!

علامہ اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی (صفحہ 659)

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاکبینے، جانِ بیتابے!

صلی اللہ علیہ وسلم

فِی مَدحِ النَّبیِّ

زیں کہکشاں تا لا مکاں[1]

بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِہٖ

ہمہ نور[2] کرد ایں خاکداں

کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ

خُلقش[3] ہمے قرآن گشت

حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ

با رب[4] چوں باشی ہم زباں

صَلُّوْا عَلَیْہِ وَآلِہٖ

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے اَشعار پر تضمین

1 النجم 09:53 ۔ 2 المائدة 15:05۔

3 مسند احمد، عن عائشہ رضی اللہ عنہا۔

4 الاحزاب 56:33

سلام بر سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم

صبا بسوئے مدینہ روکن، ازیں دُعا گو سلام برخواں
بگرد شاہ مدینہ گرد و بصد تضرّع پیام برخواں

بباب رحمت گہے گزرکن بباب جبریلؑ گہے جبیں سا
سلامِ ربّی علیٰ حبیبیؐ گہے بباب السلام برخواں

بنہ بچندیں ادب طرازی، سرِ ارادت بخاکِ آں کو
صلوٰۃ وافر بروحِ پاک جناب خیرالانام برخواں

اے بادِ صبا! مدینہ کی طرف رُخ کر اور اس دُعا گو کی طرف سے سلام لے جا۔ شاہِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب حاضر ہوکر، انتہائی عاجزی کے ساتھ یہ پیام پیش کر۔ کبھی بابِ رحمت سے گزر اور کبھی بابِ جبریل پر پیشانی رکھ۔ کبھی بابُ السلام سے میرے حبیب پر میرے ربّ کا سلام پیش کر۔ اسی ادب کے ساتھ اس کوچے کی خاک پر سرِ ارادت رکھ کر۔ بہت سا درود جنابِ خیرالانام صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ پاک کو پیش کر۔

خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

Vol 14

CPL No: FD 30/07
HIKMAT-E-BAALGHA
NOVEMBER 2020

No 11

مقامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا ﷺ وجود الکتاب!
گنبد آبگینہ رنگ تیرے ﷺ محیط میں حباب!
عالمِ آب و خاک میں تیرے ﷺ ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تو ﷺ نے طلوعِ آفتاب!
شوکتِ سنجر و سلیم، تیرے ﷺ جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید، تیرا ﷺ جمال بے نقاب!
شوق تیرا ﷺ اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب!
تیری ﷺ نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل، غیاب و جستجو! عشق، حضور و اضطراب!

علامہ اقبال ۔ بالِ جبریل ۔ نظم ذوق وشوق